موروثی ممالک کو ازسرِ نو حاصل کرنے کا کام سپرد کیا اور اس مہمّ سے واپسی پر اسے دیارِ بکر بھیج دیا، لیکن سلطان مراد کو کچھ بھی کامیابی میسّر نہ ہوئی اور ۱۵۱۴ء میں وہ اورفہ کی لڑائی میں، جو صَفَوی امرا کے خلاف ہوئی، مارا گیا۔

آق قویُونلُو سلطنت کے جن شہزادوں نے مَارُدِین پر حکومت کی ان کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) حمزہ بن قرہ یُولُوق عثمان؛ (۲) جِہانگیر بن علی بن قرہ یُولُوق عثمان؛ (۳) قاسم بن جہانگیر۔ ان میں سے قاسم نے آمِد میں ایک مسجد اور مارُدِین میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا اور ۱۵۰۲ - ۱۵۰۳ء میں اِلوِنْد کے ہاتھوں، جو شاہ اسمٰعیل سے شکست کھا کر بھاگ رہا تھا، قتل ہوا۔

کوتاہ (Göde) احمد کے بیٹوں میں سے ایک، جس کا نام زینِل تھا اِلبُستان میں ذوالقدِر اُوغلو علاء الدولہ کے پاس تھا۔ اِلوِنْد کی موت پر دیارِ بکر کے آق قویُونلُو سرداروں نے اسے حکومت کی پیش کش کر کے بُلایا۔ آمِد پہنچ کر جیسے ہی اس نے حکومت سنبھالی وہ بعض غیر مدبّرانہ حرکات کا مرتکب ہوا؛ چنانچہ اس نے امیر بیگ مُصلّو کو، جو عرصے سے دیارِ بکر کا والی چلا آتا تھا، کئی اور امرا سمیت قید میں ڈال دیا اور خود مارُدِین روانہ ہوگیا۔ وہاں کچھ عرصے تک قیام کے بعد وہ حِصن ِکیفا پہنچا اور اُسے فتح کر کے اورفہ کی طرف پیش قدمی کی اور اُسے بھی اپنے زیرِ حکومت لانے کی کوشش کی لیکن اس اثنا میں امیر بیگ مُصلّو اور اس کے رفیق قید خانے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور انھوں نے اپنی فوجیں سمیٹ کر زینِل کو شکست دی اور اسے قید کر لیا۔ اب زینِل دوبارہ ذوالقدِر اُوغلُو کے پاس واپس چلا گیا آق قویُونلُو خاندان کے افراد میں سے کسی کو تختِ حکومت کے قابل نہ پا کر اور اُن سے قطعی مایوس ہو کر امیر بیگ نے اس کے بعد جلد ہی شاہ اسمٰعیل کی اطاعت قبول کر لی۔ جو اس وقت ذوالقدِر اُوغلُو پر فوج کشی کر کے اِلبُستان پہنچ گیا تھا۔ چونکہ آق قویُونلُو نے شاہ اسمٰعیل کے باپ، بھائی اور دیگر افرادِ خاندان کو مروا ڈالا تھا اس لیے شاہِ مذکور اُن کا سخت دشمن تھا؛ چنانچہ اس خاندان کے جس فرد یا اُن کے معاون کو پا لیتا اسے قتل کر دیتا تھا، یہاں تک کہ ایک روایت کے مطابق اس نے اپنی والدہ کو بھی، جو اوزون حسن کی بیٹی تھی، اس قصور پر مروا ڈالا کہ وہ اس کی زیادتی اور خونریزی پر اعتراض کیا کرتی تھی۔ آق قویُونلُو خاندان کے جو افراد اُس سے جان بچا سکے وہ ذوالقدِر اُوغلُو، سلطانِ مصر اور آخرکار عثمانی بادشاہ کے پاس پناہ گزین ہوے۔ بعد ازاں جب آناطولی کا مشرقی حصّہ شاہ صَفَوی سے چھین لیا گیا اور آناطولی کی وحدت نئے سرے سے قائم ہو گئی، جیسی کہ سلجوقیوں کے زیرِ حکومت تھی، تو یہ لوگ ایران کی حدود کے قریب کے علاقوں میں سپاہیوں اور امیرزادوں کی حیثیت سے نسلاً بعد نسلٍ اقامت پذیر رہے، مثلاً اِرزِنجان کا ایک اعلٰی خاندان اپنے آپ کو اِلوِنْد بیگ کی نسل سے بتاتا تھا۔ اس طرح اِلبُستان کے اوغورلو اوغوللر کا بیان ہے کہ وہ سابق الذّکر اوغورلو محمد کے پوتے زینل بن کوتاہ احمد کی اولاد ہیں اور طرَبزُون کے مرادخان اوغلوللر سلطان مراد آق قویُونلُو کے آخری تاجدار کی نسل سے ہونے کے مدّعی ہیں۔ پیچوی، (۱: ۱۵۴) بذیل ۹۳۶ھ، مشرق کے دو بڑے امیروں فرّخ شاد بیگ اور بایندر اوغلو مراد بیگ کا ذکر کرتا ہے، جو [دربار میں] سلطان سُلیمان قانونی کے بائیں ہاتھ بیٹھا کرتے تھے۔ یہی مصنّف (۱: ۱۸۱) ایران کی مہمّ کے سلسلے میں ایک آق قویُونلُو شہزادے مراد بیگ کا ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ ''اس امید میں کہ اگر یہ ملک فتح ہو گیا تو اسے بھی کسی علاقے کی حکومت مل جائے گی اس نے [ترکوں] کی مدد کی اور وہ قزلباشوں کا جانی دشمن تھا'' اور اسی مراد بیگ کے عثمانی فوج میں ''چرخہ جی'' (انجینیر) مقرّر کیے جانے کا بھی ذکر کرتا ہے۔ یہ اس لیے زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ مرادخان اوغوللر اسی مراد بیگ کی اولاد سے ہیں نہ کہ سلطان مراد کی۔ ہم مراد بیگ کا شجرۂ نسب متعیّن نہیں کر سکے۔ ۱۵۰۴ء میں شاہ اسمٰعیل کے تغلّب کے وقت شیخ علی بیگ کا جو بھائی مراد بیگ بایِندِر یزد کا والی تھا اور بھاگ کر ہرات میں تیموریوں کے پاس پناہ گزین ہوا تھا تحقیق نہیں ہو سکا کہ یہی شخص تھا یا کوئی اَور، نہ یہ تحقیق ہو سکتا ہے کہ فرخ شاد بیگ، جس نے اسی ۱۵۰۰ء میں سلطان مراد کو تخت دلایا تھا، وہی فرخ شاد بیگ بایندر ہے جسے شیراز کا گورنر مقرّر کیا گیا تھا اور جو ۱۵۱۴ء میں شاہ سلیم اوّل کی ایرانی مہمّ میں شریک تھا یا کوئی اَور۔

شاہ اسمٰعیل نے صرف آق قویُونلُو خاندان کو برباد کرنے ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان تمام قبیلوں اور خانوادوں کو جو آق قویُونلُو اولوس اور سلطنت سے کسی طرح کا بھی تعلّق رکھتے تھے اور جنھوں نے ان کی طرفداری کا اظہار کیا تھا نہایت بے رحمی اور بیدردی سے تہِ تیغ کیا۔ اس نے آذربیجان، دیاربکر، عراقِ عرب، عراقِ عجم اور فارس میں اپنی خونخواری کا مظاہرہ کیا اور آق قویُونلُو کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔ جو آق قویُونلُو اس قتلِ عام سے بچ گئے وہ بھاگ کر شام میں ذوالقدِر کے علاقے میں اور سلطنتِ عثمانیہ کے مقبوضات میں چلے گئے؛ آخرکار وہ پوری طرح عثمانی رعایا بن کر اپنے سرداروں سمیت مشرقی و وسطی آناطولی کے مختلف اطراف میں منتشر ہو گئے۔ زیادہ تر مشرقی صوبہ جات کے تندخو اور جفاکش عثمانی سپاہی بن کر وہ صدیوں تک ایران کے لیے پریشانی کا موجب بنے رہے۔ اُن میں سے کچھ نے شہروں اور قصبوں میں رہائش اختیار کی اور جدید گاؤں آباد کیے اور کچھ نے خانہ بدوشی کی زندگی برقرار رکھی۔ آق قویُونلُو جو ہمارے زمانے تک موجود ہیں مشرقی اور وسطی آناطولی کے باشندوں کا ایک حصّہ ہیں۔ چونکہ آق قویُونلُو مدّت سے جنگ و جدل اور لوٹ مار کے عادی رہے تھے اور قبائلی جمعیّت کے ختم ہو جانے سے انفرادی زندگی کے خوگر ہو گئے تھے اور بڑے پیمانے کی اجتماعی زندگی سے بیگانہ تھے رفتہ رفتہ [بھی] وہ کسی نظم و ضبط سے مربوط نہ ہو سکے تھے اور اپنی پرانی سلطنت کی طرح جاگیروں کے مالک نہ ہونے کے سبب غیر مطمئن بھی تھے اس لیے ان قبائل اور خانوادوں کی طرح جو ذوالقدِر اولوس کے ماتحت تھے وہ سلطنتِ عثمانیہ کے لیے (دورانِ جنگ کے سوا) ہمیشہ بدنظمی اور خلل کا موجب بنے رہے۔ آق قویُونلُو سردار چونکہ اپنی پرانی حکومت کے زمانے کے مراتب و اعزازات سے محروم تھے

اس لیے اپنے جدید عثمانی آقاؤں کے خلاف اکثر بغاوت پر آمادہ رہتے تھے۔ سلیم اوّل کے خلاف بغاوتِ جلالی [یعنی صوبائی] میں جن لوگوں نے حصّہ لیا ان میں بہت سے یہی تھے اور اسی طرح وہ ان بغاوتوں میں بھی شریک ہوے جو سُلطان سُلیمان قانونی کے خلاف ہوئیں اور پھر ان بغاوتوں میں بھی جنھوں نے خصوصاً سترھویں صدی میں آناطولی کے ایک بڑے حصّے کو تہ و بالا کر دیا ان کا بڑا ہاتھ تھا۔

اسلام لانے سے پہلے یا بعد سلطنت آق قویُونلُو کا بنیادی نظام عین اسی طرح کا تھا جیسا کہ ان تمام ریاستوں کا جن کی بنا دیگر ترکی نسل سے منسوب قبائل یا خانوادوں نے رکھی: یعنی تمام مملکت، جو ادارۂ حکومت کے زیرِ نگین تھی، شاہی خاندان کی ملکیّت سمجھی جاتی تھی۔ خاندان کے تمام شہزادوں میں سے ایک باقی تمام کا رئیس ہوتا۔ یہ رئیس ''اُلُغ بیگ'' یا ''خان'' کہلاتا اور اس کی حیثیت بادشاہ کی سی ہوتی۔ سرکاری طور پر اسے ''مِلک'' یا ''سلطان'' کہتے تھے۔ دوسرے شہزادے اس حاکم کے ماتحت وسیع اختیارات کے ساتھ، بلکہ بعض اوقات خود مختارانہ طور پر، مملکت کے کسی نہ کسی حصّے میں اِمارت کرتے تھے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا کہ سلطانِ وقت اپنے بیٹوں کو بھی صوبوں میں سے کسی نہ کسی کا والی مقرّر کرتا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ان ممالک میں جو قرہ یُولُوق عثمان نے فتح کیے اس کے بیٹے یا بھتیجے والی مقرّر کیے گئے۔ جب آق قویُونلُو سلطنت بڑھنی شروع ہوئی اور اس نے ایک شہنشاہیت کی شکل اختیار کر لی اور پایۂ تخت تبریز میں منتقل ہو گیا تو علاقہ مختلف صوبوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس طرح کہ شاہی صوبہ آذربیجان تھا؛ اس کے بعد تمام مشرقی آناطولی یا دیارِ بکر کا صوبہ تھا، جس کا صدر مقام آمد تھا؛ بغداد صوبۂ عراق عرب کا دار الخلافہ تھا؛ شیراز فارس کا؛ اس کے علاوہ اصفہان، کرمان، اِرّان اور قزوین کے صوبے تھے، جن پر یا تو خود حاکمِ وقت کے بیٹے، بھتیجے اور بھائی یا بڑے بڑے قبائلی سردار حاکم مقرّر کیے جاتے تھے۔ شہروں یا ضلعوں میں بھی شاہی خاندان سے منسوب، شہزادے یا دوسرے بک حاکم مقرّر کیے جاتے۔ سب ترکی سلطنتوں میں انتقالِ حکومت یا وراثت کا کوئی مخصوص قانون اور قاعدہ نہ تھا۔ جب کوئی حاکم مرجاتا تو عموماً جس شہزادے کے حق میں وہ وصیّت کر گیا ہوتا وہ جانشین ہوتا۔ لیکن دوسرے شہزادے بغاوت پر آمادہ ہو جاتے اور خانہ جنگی کا آغاز ہو جاتا۔ حکومت آخر کار اُس کی ہوتی جو سب پر غالب آتا۔ دوسری ترک سلطنتوں کی طرح آق قویُونلُو سلطنت کے یکا یک ختم ہو جانے کی ایک وجہ یہی اساسی تشکیلات سے متعلّق کسی آئین و قانون کی عدم موجودگی تھی۔

جہاں تک حکومت کے عام نظم و نسق کا تعلق ہے ہمارے پاس اوزون حسن کے زمانے تک آق قویُونلُو سلطنت کی اِداری تشکیلات کے بارے میں کوئی قطعی معلومات موجود نہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرہ قویُونلُو سلطنت کی طرح یہ سلطنت بھی غالبًا جلایریوں یا تیمور کے حکومتی نظم و نسق کی تقلید کرتی تھی۔ اوزون حسن کے وقت میں ناظم بھی اتنا ہی بڑا مقام رکھتا تھا جتنا فاتح۔ حکومت کا مرکز 'دیوانِ اعظم' تھا، جس کے صدر کو 'دیوان بیگی' یا 'صاحبِ دیوان' کہتے تھے۔ اس کے ساتھ وزیروں کے علاوہ اَور افراد بھی ہوتے تھے، جن کا لقب ''صاحب'' ہوتا تھا اور جن میں سے ہر ایک دیوانِ اعظم سے متعلّق ہوتا تھا اور وہ اِشراف (تفتیش)، طُغرٰی (نشان) اور استیفا (مالیات) کے دیوانوں کے علاوہ عدل وانصاف اور فوجی کاموں کی دیکھ بھال کرنے والے، یعنی عدل اور عرض یا عارض کے، دیوانوں کے نگران ہوتے تھے اور ان کے ساتھ ہی وہ قاضیِ عسکر اور پَروانہ جی بھی ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ شاہی خاندان سے منسوب بعض افراد اور بعض بڑے قبائلی سردار بھی دیوان کے تابعی ارکان ہوتے تھے۔ ان میں سے سب سے بڑے کو 'میرِ اعظم' کہتے تھے اور دیوانِ عسکر میں وہ سب سے زیادہ بااثر شخص ہوتا تھا اور جب سلطان کسی مہم میں شریک ہوتو اس کی عدمِ موجودگی میں سپہ سالار کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ صوبوں میں ہر بڑا سردار، خواہ وہ والی ہو یا نہ ہو، کسی نہ کسی شہزادے کا 'اتابگی' (اتالیق) ہوتا تھا۔ جب کوئی شہزادہ تخت نشین ہوتا تو امیرِ اعظم کا منصب اس کے اتالیق کو ملتا اور اگر بادشاہ کمزور ہوتا تو سیاہ و سفید کا مالک وہی امیرِ اعظم بن جاتا تھا۔ اگر کبھی شہزادے کا تقرّر کسی صوبے یا ولایت میں نہ ہوتا تو وہاں امیر کی حیثیت سے کسی بڑے سردار کو بھیج دیا جاتا تھا۔ صوبائی مرکزوں میں بھی 'دیوانِ اعظم' ہی کا ایک چھوٹا سا نمونہ پایا جاتا تھا اور اس کے ارکان بعض اوقات مرکز سے بھیجے جاتے تھے۔ شخصی حقوق سے متعلّق مسائل کی دیکھ بھال قاضی یا ان کے نائب، یعنی وکیل، کرتے تھے جو ہر ولایت میں موجود رہتے تھے۔

شاندار فتوحات کے ایک دَور کے بعد اوزون حسن نے اپنی محلّ سرا کے نظام کو بھی وسعت دی اور گویا عثمانی محلِّ سلطانی کی سی پُرلطف تشکیلات ایجاد کیں، اور 'رِکاب دار'، 'بَکاوَل' (چاشنی گیر)، 'میر آخور'، 'محاسِب'، 'اَیاقچی' (=شرابدار)، 'ایناق' (=معتمد خاص) اور 'خزینہ دار' کے سے بڑے بڑے ملازمانِ محلِّ شاہی مقرّر کیے۔

اوزون حسن کے وقت تک آق قویُونلُو فوجوں میں اس کے ذاتی حفاظتی دستوں کے علاوہ — جو زیادہ تر اصل بایِنْدری قبیلے سے ہوتے تھے — ان قبائل کے سرداروں کی سوار فوجیں بھی شامل ہوتی تھیں جو بادشاہ سے وابستہ ہوتے تھے۔ اپنی فتوحات کے بعد اوزون حسن نے عثمانی سلطنت کے فوجی نظم و نسق کے نمونے پر ایک نئی فوج تیّار کی۔ اس فوج کی ترکیب یوں تھی: بایِنْدر کے — جو اصل بنیاد تھے — ان مختلف قبیلوں میں سے جن پر آق قویُونلُو کا اولوس مشتمل تھا چیدہ سپاہی، جو ''خاصہ نوکر'' کہلاتے تھے اور جن کی تعداد تیس ہزار تک پہنچتی تھی، ان میں سے کچھ پیدل ہوتے تھے؛ قصبات اور دیہات سے بھرتی کیے ہوے بے قاعدہ سپاہی (''عزَب لر'')؛ براہِ راست صوبائی حکومتوں کے ماتحت رہنے والے اور ان علاقوں میں اقامت پذیر جاگیردارانہ سپاہی؛ سردی اور گرمی میں ہمیشہ نقلِ مکان کرنے والے خانہ بدوش ترکمانوں سے مرکّب دستے، جو 'چِرِک'

(چِرِی) کے نام سے مشہور تھے، فوج کا بیشتر حصّہ انھیں پر مشتمل ہوتا تھا؛ اور دِوِہ جی [ساربان]، یام جی [سائیس] اور رعداندار [برق انداز] کی طرح کے وظائف بجالانے والی چھوٹی چھوٹی فوجی جماعتیں.

جب اوزون حسن پہلے سے رائج جاگیردارانہ فوجی نظام اور بالخصوص عثمانی فوجی نظام کو پیشِ نظر رکھ کر اصلاح کا کام ختم کر چکا تو اس نے آق قویُونلُو قبائل میں سے بعض کو، زمین سے مربوط، یعنی جاگیردارانہ نوعیّت کے، سپاہی بنانے کی غرض سے، مختلف علاقوں میں اقامت پذیر ہونے کی ترغیب دی اور اس طرح خانہ بدوش لوگوں میں سے بعض کو متمدّن بنا دیا۔ اوزون حسن کے مرتّب کردہ جاگیرداری واراضی کے یہ قوانین ''حَسَن پادشاہ قانون لَر'' کے نام سے مشہور تھے، اور عثمانیوں کے زمانے میں مشرقی ولایتوں میں رائج قوانین اراضی و تیمارداری انھیں پر مبنی تھے اور یہی حال صفوی حکمرانوں کے اُن قوانین کا تھا جو ان چیزوں سے متعلّق تھے۔ عَزَپ [''گوریلا''] اور چِرِک قسم کے سپاہیوں کو صرف جنگ کے دوران میں تنخواہ ملتی تھی۔ آق قویُونلُو کا قومی رنگ سفید تھا اور وہ جھنڈے بھی سفید ہی رنگ کے استعمال کرتے تھے۔ ان کے سکّوں، کتبوں، فرمانوں اور وقف ناموں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اوزون حسن اور اس کے بعد کے آق قویُونلُو حکمران اپنے ناموں سے پہلے سلطان اور آخر میں پادشاہ، یا 'خان' یا 'بہادِر' یا بعض دفعہ 'بہادِر خان' کے لقب استعمال کرتے تھے۔ مغل استیلا نے تمام ایشیا کو تباہ و برباد کر دیا، نظامِ اجتماعی کو تہ و بالا کر ڈالا اور بستیوں اور شہروں کو برباد کرنے کے لیے خانہ بدوشوں کو ایک اوّل درجے کے فعّال عنصر کی حیثیت دے دی۔ اس زمانے میں آناطولی بھی اس استیلا کے صدمے سے دوچار ہوا اور اس کی تباہ کاریوں کی آماج گاہ بن گیا اور وہاں بھی سلجوقی حکومت کے خاتمے سے پورے ایشیا کی طرح ایک نئی صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ جو بربادیاں اس سے پیدا ہوئیں یا اجتماعی اور اقتصادی انحطاط رونما ہوا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر کمزور پڑ گئے اور آناطولی کے خانہ بدوش بھی سرگرمِ کار ہو گئے۔ خانہ بدوش رئیس اپنے اپنے قبیلوں اور خاندانوں کے ساتھ اپنی گرمائی قیام گاہوں سے نیچے اتر کر مخصوص علاقوں میں حاکم بن گئے، بلکہ بعض ایسے سرداروں نے بھی جو اپنے گرد و پیش اشقیا کے جتھے جمع کر سکتے تھے کئی اضلاع پر قبضہ جما لیا۔ اس طرح آناطولی میں چاروں طرف بڑی چھوٹی بہت سی ایسی ریاستیں بن گئیں جو ہر وقت ایک دوسرے سے جنگ و جدال میں مصروف رہتی تھیں۔ مغلوں کے غلبے اور تباہ کاری کے بعد عراق اور ایران بھی، جہاں سلطنتیں قائم تھیں اور جو اس لیے کوشاں تھے کہ وہاں نسبۃً آسائش اور سکون برقرار رہے بہت سے بکوں، امیروں اور سرداروں کے باہمی جنگ و جدال کا اکھاڑا بن گئے۔ یہ زمانہ جو طوائف الملوکی کا دَور کہلاتا ہے اور جس میں وہ حکومتیں قائم ہوئیں جو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتی تھیں ایک خوفناک اور طویل دورِ فتُرت تھا جو ان سب ملکوں کی خرابی اور ان کی تہذیب و تمدّن کے انحطاط کا سبب بن گیا۔ تیمور، جس نے یہ کوشش کی کہ اس دورِ فترت کا خاتمہ کر دے، بالکل کامیاب نہ ہو سکا۔ برعکس اس کے اس کی فتوحات اور غلبے نے ان بربادیوں میں اَور اضافہ کر دیا اور اس اجتماعی مرض کو مُزمِن بنا دیا اور جس طرح اس کی وفات کے بعد ہر چیز تہ و بالا ہوگئی اسی طرح فوضویت بھی بڑھ گئی اور زور پکڑ گئی.

وہ رئیس جنھوں نے آناطولی ریاستیں بنائی تھیں اور ان کے ساتھی ان علاقوں میں جہاں وہ جاگزین ہو گئے تھے اور حاکم بن گئے تھے وہاں کے اجتماعی اور اقتصادی حالات کے تابع تھے۔ ایجہ اور مرمرہ کے سمندروں کے کنارے واقع ہونے اور قدرت کی فیاضیّوں سے مستفید انتہائی زرخیز سرزمین اور انتہائی معتدل اقلیم کی مالک ہونے کی بنا پر ان ریاستوں کی اقتصادی زندگی دوسرے علاقوں کے مقابلے میں بہت بلند تھی اور وہ جلد ہی دولت مند اور متمدّن بن گئیں اور اسی طرح وہ خانہ بدوش ترکمان بھی، جو ان کے متوسّلین میں سے تھے، بہت تھوڑے عرصے میں حضری (شہری) بن گئے۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو سلجوقیوں کے زمانے سے بوزنطیہ میں آباد تھے اور ہمیشہ جنگ میں مشغول رہتے چلے آئے تھے اسلامی عقیدۂ جہاد پر ایمان رکھتے تھے اور انھیں اس پر عمل کرنے کا میدان بھی مل گیا تھا؛ چنانچہ انھوں نے بوزنطی سلطنت کے علاقوں اور وینس اور جنوآ کی جمہوریتوں کے مشرقی مملوکات کے اندر تجاوز شروع کر دیا اور عمومًا فتح مند رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ریاستیں اَور بھی مالدار ہوگئیں اور اس کے ساتھ ہی ان کے لیے عیسائیوں کے خلاف ایک جھنڈے کے نیچے متحد ہو جانے کی فضا پیدا ہوگئی۔ اس طرح مغربی آناطولی کی ترکمان ریاستیں، جن کی قبائلی عصبیت ختم ہو چکی تھی اور جن کی تمام آرزوئیں اور امنگیں اب نظریۂ جہاد پر مرکوز تھیں، درمیان سے اٹھیں اور بہت جلدی اور بلا کسی زیادہ دِقّت کے عثمانی جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئیں، کیونکہ غزا و جہاد کے معاملے میں نہ صرف مغربی آناطولی کے لیے بلکہ سب مسلمانوں کے لیے عثمانی ریاست ایک نمونہ تھی۔ اس وقت وسطی آناطولی کی ریاستوں کی اقتصادی زندگی کا دار و مدار سب سے پہلے تو زراعت پر تھا اور دوسرے درجے پر مویشیوں کی پرورش پر۔ ان میں سے بعض لوگ ابھی تک خانہ بدوشی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور اس لیے تہذیب و تمدّن کے میدان میں کچھ زیادہ آگے نہ بڑھ سکے تھے۔ لہٰذا قدرتی طور پر وہ عثمانی ترکوں کے مقابلے میں پس ماندہ اور کمزور حالت میں تھے۔ اس کے کچھ عرصے بعد عثمانی ترکوں نے روم ایلی کا تمام خطّہ فتح کر لیا اور پہلے کی نسبت بہت زیادہ قوی ہو گئے۔ چونکہ اب وہ خاصے دولت مند ہو چکے تھے اس لیے انھوں نے متعدّد مستحکم اور وسیع تشکیلات کی بنا ڈالی، بڑی بڑی اور منظم فوجیں جمع کیں اور ساتھ ساتھ مسلسل غزا اور جہاد کرتے رہے اور اس طرح پورے آناطولی میں انھیں ایک طرح کا روحانی اثر و نفوذ حاصل ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے رفتہ رفتہ وسطی آناطولی کی سب ریاستوں کو ختم کر دیا۔ انٹی ٹارس (Anti-Taurus) پہاڑوں کے جنوب، یعنی بک بوغا اور جیحان کی وادی میں، جو ذوالقدِر ریاست تھی اور اسی طرح آق قویُونلُو اور قرہ قویُونلُو ریاستیں، جو مشرقی آناطولی میں قائم ہوئیں، ان کی اقتصادی زندگی زیادہ تر مویشیوں کی

 آق قویُونلُو

شجرۂ نسب آق قویونلو

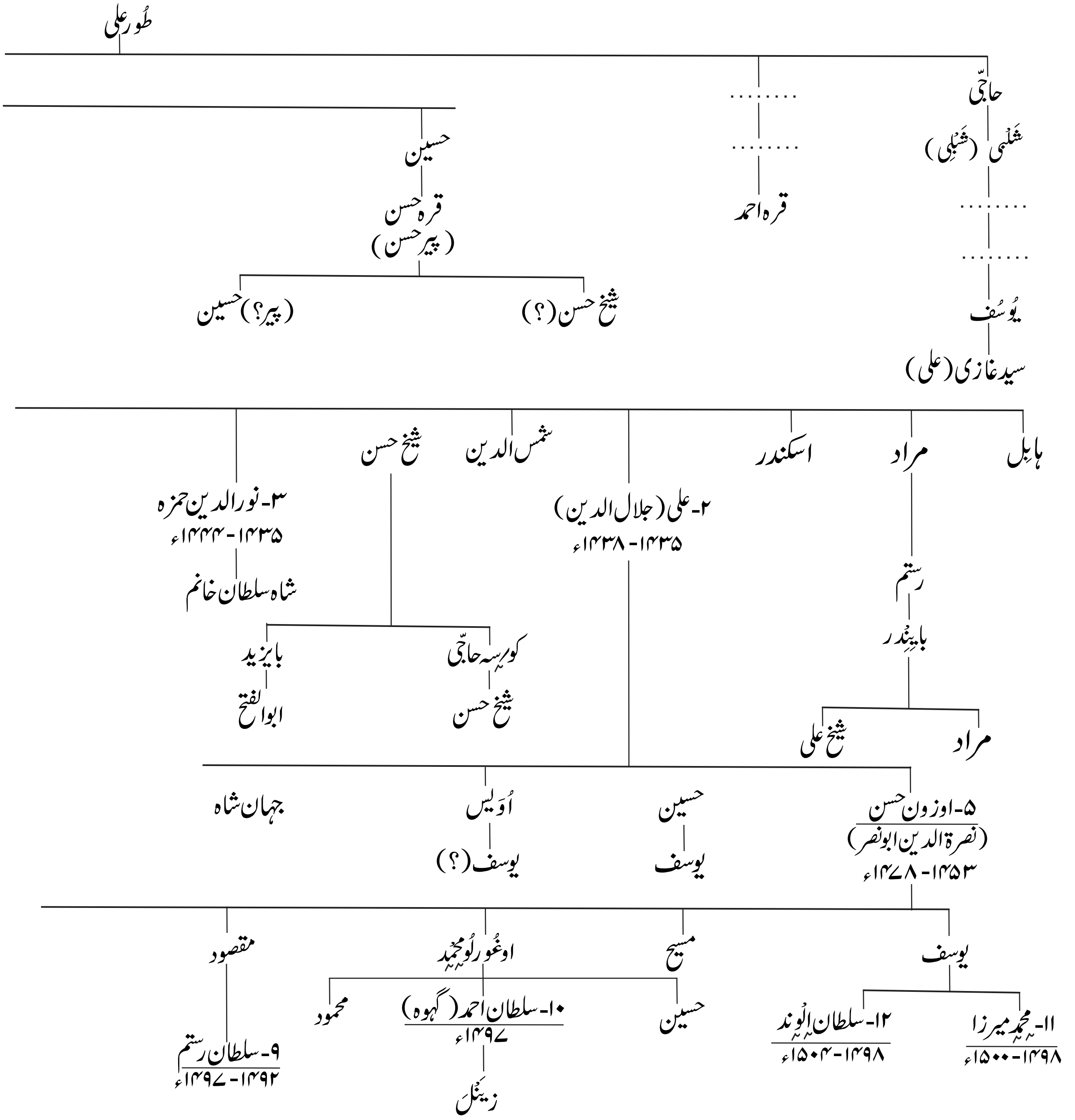

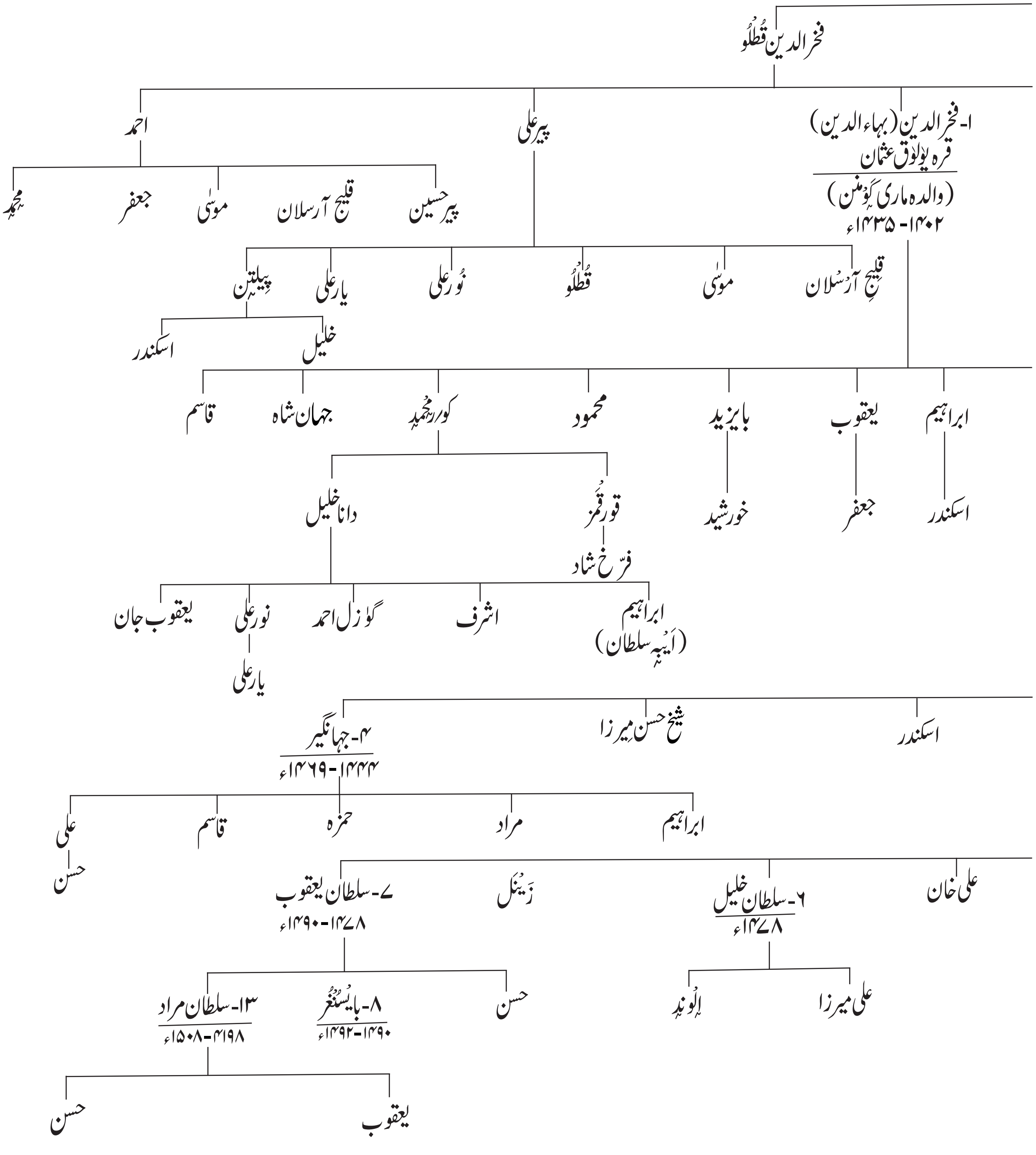
فخرالدین قُطلو
۱- فخرالدین (بہاء الدین)
قرہ یولوق عثمان
(والدہ ماری کوُمنن)
۱۴۰۲-۱۴۳۵ء
پیر علی
احمد
پیر حسین
قلیچ آرسلان
موسیٰ
جعفر
محمد
قلیچ آرسلان
موسیٰ
قُطلو
نور علی
یار علی
پیلتن
خلیل
اسکندر
ابراہیم
یعقوب
بایزید
محمود
کور محمد
جہان شاہ
قاسم
اسکندر
جعفر
خورشید
قور قمز
دانا خلیل
فرخ شاد
ابراہیم
(ایبہ سلطان)
اشرف
گوزل احمد
نور علی
یعقوب جان
یار علی
اسکندر
شیخ حسن میرزا
۴- جہانگیر
۱۴۴۴-۱۴۶۹ء
ابراہیم
مراد
حمزہ
قاسم
علی
حسن
علی خان
۶- سلطان خلیل
۱۴۷۸ء
زینل
۷- سلطان یعقوب
۱۴۷۸-۱۴۹۰ء
علی میرزا
الوند
حسن
۸- بایسنغر
۱۴۹۰-۱۴۹۲ء
۱۳- سلطان مراد
۱۴۹۸-۱۵۰۸ء
یعقوب
حسن

پرورش پر منحصر تھی، یعنی ان ریاستوں کے اکثر باشندے خانہ بدوش یا نیم خانہ بدوش تھے اور اس طرح ان کا دار و مدار ایسے لوگوں پر تھا جو ابھی تک قبائلی زندگی بسر کر رہے تھے۔ لہٰذا یہ ریاستیں وسطی آناطولی ریاستوں سے بھی زیادہ کمزور اور خستہ حالت میں تھیں۔ یہ ترکمان قبائل (اولوس) اور سلطنتیں، جو تہذیب و تمدّن میں اس طرح پیچھے رہ گئی تھیں، انھوں نے اسلام سے پہلے قائم شدہ ترک سلطنتوں اور بارھویں۔ تیرھویں صدی عیسوی میں قائم شدہ مغل سلطنت کی طرح فتوحات حاصل کرنے اور پھیلنے کی قابلیّت تو بہت دکھائی لیکن اس کے باوجود بہت قلیل عرصے ہی میں ختم ہوگئیں۔ ان میں سے قرہ قویُونلُو کو آق قویُونلُو نے ختم کیا، آق قویُونلُو اور قرہ قویُونلُو دونوں کو صَفَویوں نے، اور عثمانی ترکوں نے نہ صرف مشرقی آناطولی کو، جو قرہ قویُونلُو اور آق قویُونلُو کا مستقر تھا، لے لیا بلکہ ذوالقدر کی سلطنت بھی انھیں کے ہاتھوں محو ہوگئی۔ اس طرح عثمانی ترکوں نے آخرکار آناطولی کی وحدت کو ازسرِ نو قائم کیا، طوائف الملوکی کے دور کو، جو دو سو برس تک جاری رہا تھا، ختم کیا اور آناطولی کے سلجوقیوں کی سلطنت سے بھی زیادہ مستحکم اور بڑی سلطنت قائم کرلی بلکہ کئی لحاظ سے اس زمانے کے تہذیب و تمدّن کے مقابلے میں ایک زیادہ بلند پایہ تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے بالخصوص ترکی زبان اور ترکی ادبیات میں جان ڈالنے میں بہت بڑا حصّہ لیا اور ترکی زبان کو صرف شاعری کی اور سرکاری زبان نہیں بلکہ علمی زبان بنانے کی بھی کوشش کی۔ گویا انھوں نے آناطولی کے اس اجتماعی نظام کو جو مغلوں کے استیلا کے بعد سے درہم برہم ہوگیا تھا ایک دفعہ پھر قائم کردیا۔

آق قویُونلُو سلطنت کی پوری زندگی روز روز کی اندرونی و بیرونی جنگوں میں بسر ہوئی۔ جن ممالک میں اس کی حکومت تھی وہاں کسی وقت بھی امن و امان قائم نہ ہوسکا۔ اس لیے جہاں تک تہذیب و ثقافت کا تعلّق ہے ان لوگوں کے زمانے کی کوئی خاص چیز قابلِ ذکر نظر نہیں آتی۔ ہرچند کہ اس خاندان کے چند سرداروں نے، جو ماردین میں حکومت کرتے تھے، ادب کی سرپرستی کی اور رفاہِ عام کے کاموں میں سرگرمی دکھائی اور خود اوزون حسن اور اس کے بیٹوں نے، خصوصًا یعقوب اور اس کے امرا میں سے بعض نے، شعرا و فضلا کی سرپرستی کی اور چند سرکاری، علمی اور مذہبی عمارتیں بنوائیں، تاہم یہ چیزیں محض ان دو حکمرانوں کے زمانے سے تعلّق رکھتی ہیں۔ آخر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جن ممالک پر آق قویُونلُو حکمران تھے وہاں، عثمانی ممالک کے برعکس، ترقّی سے زیادہ تنزّل اور انتظام سے زیادہ بدنظمی اور بے آرامی کا دور دورہ رہا اور اسی طرح وہ تباہ و برباد ہوگئے۔

مآخذ: (ا) کتبات: چونکہ ایران اور آناطولی کے تمام کتبے جمع ہوکر شائع نہیں ہوسکے اس لیے آق قویُونلُو سے متعلّق کتبات کی فہرست دینا مشکل ہے۔ صرف عبدالرحیم شریف نے ارض روم تاریخی، استانبول ۱۹۳۶ء اور [اَخلاط] کتابہ لری میں ان سے متعلّق بعض کتبات شائع کیے ہیں؛ میرے ذخیرے میں بھی آق قویُونلُو حکمرانوں سے متعلّق بعض کتبے موجود ہیں۔

(ب) مسکُوکات: احمد توحید: مسکُوکات اسلامیہ کتالوغو، استانبول ۱۹۳۱ء، ص ۴۷۲-۵۱۹۔

(ج) وقف نامے: ترکی اور اسلامی آثار کے متحف (میوزیم)، نیز باش وکالت اَور اوقاف کے اسناد و اوراق (archives) میں بھی چند وقف نامے ہیں.

(د) سیاسی دستاویزات: طوپ قپوسرائے کے محافظ خانوں میں محفوظ مکتوبات کے لیے دیکھیے (۱) آرشِو قِلاوُزُو، گُراسہ ۱: ص ۲۸؛ (۲) رَحمتی اَراد: فاتح سلطان محمدن یارلیغی (تُرکیّات مجموعہ سی، ۶: ۲۸۵-۳۲۲)؛ (۳) اَقدس نِعمت قُراد: طوپ قپو سرای مُوزہ سِندہ کی.... یارلیق وِبتک لر، (شاہ ابوسعید گورگان کا مکتوب اَوزون حسن کے نام، ص ۱۱۹-۱۳۴).

(ہ) مُنشَآت (رسائل و خطوط): (۱) مکتبۂ ملّیہ، پیرس (دیسلان: فہرست مخطوطات عربی)، شمارہ ۴۴۴۰؛ (۲) بلوشہ: فہرست مخطوطات فارسی، شمارہ ۱۸۱۵؛ (۳) ابن [حِجّۃ] الحَموی: قھوۃ الانشاء، اور جامی، علی شیر نوائی، مَرُوارید، خواجۂ جہان اور اِدریس بِدلیسی کے رسائل؛ (۴) حسین [الہَروی] (احمد الہروی؟): جوامع الانشاء (کتب خانۂ نورعثمانیہ) شمارہ ۴۳۰۱؛ (۵) تاجی زادہ جعفر کے اور [اس کے بھائی] سعدی چلبی کے رسائل اور مجموعات، حُسام الدّین زادہ، فریدون بک اور صاری عبداللہ افندی کے جمع کردہ اور ترتیب دادہ رسائل اور نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی سے متعلّق چند اَور افراد کے جمع کردہ بعض رسائل جن کے نام معلوم نہیں ہوسکے؛ (۶) حاجّی میرزا حسن فسَاوی: فارس نامہ (۲ جلد، تہران ۱۳۱۳ھ)؛ (۷) باش وکالت آرشیوی میں موجود قوانین کے لیے دیکھیے: عُمر لُطفی بَرکان: عثمانلی دوِرندہ آق قُویُونلُو حُکم داری اوزون حسن بکہ عائد قانون لَر (تاریخی وِثیقہ لَر درگِسی)، ۲ جلد، استانبول ۱۹۴۱ء؛ (۸) مُنشَآت فریدون بیگ، استانبول ۱۲۷۴ھ، ۱: ۲۷۴-۲۷۸ میں جو رسائل مندرج ہیں اور جن کے متعلّق یہ کہا گیا ہے کہ وہ اوزون حسن کی طرف سے فاتح محمد کے نام بھیجے گئے تھے انھیں اب تک زمانۂ حال کے مشرقی اور مغربی مؤرّخین نے صحیح نظر سے نہیں دیکھا ہے، لیکن جیسا کہ میں ایک موقع پر متاسّفانہ کہہ چکا ہوں ان رسائل کے مکتوبات میں سے بعض جعلی ہیں۔ ص ۲۷۵ پر جو خط ہے وہ اوزون حسن کی طرف سے سلطان محمد فاتح کے نام نہیں، بلکہ اس کے بیٹے بایزید چلبی کو بھیجا گیا تھا، جو کہ آماسِیہ کا والی تھا اور اس پر محرّم ۸۷۴ھ کی تاریخ درج ہے۔ جب شہزادۂ بایزید آماسِیہ کا والی تھا تو اس نے مختلف حکمرانوں، خصوصًا اوزون حسن، کو جو متعدّد خطوط لکھے ان پر مشتمل مجموعہ تاجی زادہ سعدی چلبی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور رسائل میں اس خاص مکتوب کا جواب، جو دوسرے جوابات کی طرح تاجی بک ہی نے لکھا تھا، رسائل فریدون بک میں موجود نہیں ہے۔ سعدی چلبی نے ان تمام خطوط کے حواشی پر، جو اس نے اپنے والد سے نقل کیے ہیں، ''بترکیب پدرم رحمۃ اللہ'' لکھ دیا ہے۔ ص ۲۷۶-۲۷۷ پر جو خط ہے وہ بھی اوزون حسن کی طرف سے فاتح کے نام نہیں ہے، بلکہ قرہ مان اوغلو نظام الدّین پیر احمد بک کو بھیجا گیا تھا۔ پرانے رسائل کے مجموعوں کی رُو سے یہ خط قرہ مان اوغلو کو بھیجا گیا تھا۔ فریدون بک کے قدیم نسخوں، خصوصًا اس نسخے کی رُو سے جو خود مصنّف کے زمانے میں

تیّار ہوا اور بادشاہ کو پیش کیا گیا، نیز وی اتا کے اس نسخے کی رُو سے جو ہامر (Hammer) کی طرف منسوب ہے احمد بک کو بھیجا گیا (دیکھیے Hammer، ترجمۂ محمد عطا، ۳: ۱۲۰، ۴۴۳) لیکن متاخر نسخوں اور ان مطبوعہ نسخوں میں جو ان نسخوں پر مبنی ہیں مرسل الیہ کے نام کو محرّف کر کے احمد کی جگہ محمد لکھا گیا ہے۔ وہ خط جو ص ۲۸۷ پر موجود ہے اور کہا جاتا ہے کہ شمس الدّین محمد بک کے لقب اور عنوان کے ساتھ اوزون حسن کی طرف سے سلطان محمد فاتح کو بھیجا گیا قطعی طور پر اس سلطان کے نام نہیں ہے، بلکہ یہ خط، جس پر ۸۷۴ھ کی تاریخ درج ہے، محمد بک نیکسار کے بک [میر]، کو بھیجا گیا تھا۔ یہ خط سعدی چلبی کے مجموعے اور رسائل میں بعینہٖ موجود ہے اور اس خط کا عنوان (سرنامہ) یوں ہے: ''صورت مکتوب حسن بک عن شیراز بمحمدبک میرنیکسار فرستادہ بود فی سنۃ ۸۷۴ھ''۔ جب فریدون کے رسائل کے ان مکتوبات کا داخلی جائزہ لیا جائے گا تو معلوم ہو جائے گا کہ جو مکتوبات فاتح کے نام بتائے جاتے ہیں وہ اس کے نام نہیں ہیں۔

(و) تصنیفات و تالیفات:

متن مادّے میں مذکور (۱) ابوبکر طہرانی کی کتاب دیار بکریّہ اور اس کا ضمیمہ؛ یعنی (۲) فضل اللہ بن رُوزبہان اِصفہانی کی تاریخ عالَم آرای امینی، جو خلیل اور یعقوب کے زمانے کے حالات پر مشتمل ہے (فاتح کتب خانہ، شمارہ ۴۴۳۱) [دیار بکریہ، ج ۱ حال ہی میں انقرہ میں طبع ہوئی ہے (ستمبر ۱۹۶۲ء سے پہلے)]؛ اور (۳) آق قویونلو سلطنت کے مراسم و تشکیلات سے متعلق جلال الدین دَوانی کا عَرض نامہ (ملّی تتبّعلر مجموعہ سی، ۵: ۱۳۳۱)، یہ سب آق قویونلو کے حکمرانوں کے نام سے منتسب وقائع نامے ہیں۔ اس مادّے کے متن میں جن کتابوں کا ذکر کیا ہے، یعنی: (۴) عزیز بن اُرْدُشیر استرآبادی: بزم و رزم، استانبول ۱۹۲۸ء؛ (۵) شرف الدین علی یزدی: ظفر نامہ، کلکتہ ۱۸۸۷ - ۱۸۸۸ء؛ (۶) ابن عرب شاہ: عجائب المقدور، قاہرہ ۱۲۸۵ھ؛ ایضاً ترکی ترجمہ از نظمی زادہ، طبع ابراہیم مُتَفَرِّقہ۔ ان کے علاوہ فارسی کی عام تواریخ میں سے: (۷) حافظ اَبْرُو: زُبدۃ التواریخ، حصّۂ چہارم (فاتح کتب خانہ، شمارہ ۴۳۷۱)؛ (۸) عبدالرزّاق سمرقندی: مطلع سعدین (مکمّل نسخہ کتب خانۂ سلیمیہ ادِرنہ میں، شمارہ ۱۴۹۲ اور جلد اوّل در کتب خانۂ آیا صوفیا، استانبول، شمارہ ۳۰۸۶؛ کتب خانۂ اِسعد اِفندی، شمارہ ۲۰۹۸، جلد اوّل و دوم کتب خانۂ قضا اِسعد اِفندی، شمارہ ۲۱۲۵، [ایضاً، طبع لاہور، ۲/۱ و ۲ و ۳، لاہور ۱۳۶۰ - ۱۳۶۸ھ]؛ (۹) میر خواند: روضۃ الصّفا (بمبئی ۱۲۶۴ھ)؛ (۱۰) خواند امیر: خلاصۃ الاخبار فی احوال الاخیار (کتب خانۂ آیا صوفیا، شمارہ ۳۱۹۰، ۳۱۹۱)؛ (۱۱) خواند امیر: حبیب السِیَر، (طبع ایران و ہندوستان)؛ (۱۲) حسن بیگ رُوملو: احسن التواریخ، جو آق قویونلو خاندان کی تاریخ کہلانے کی مستحق ہے اور جس کی پہلی جلد ابوبکر طہرانی کی دیار بکریہ اور تاریخ عالم آرای امینی کا ماخذ ہے (کتب خانۂ نُور عثمانیہ، شمارہ ۳۳۱۷، جلد [اوّل، بڑودہ] ۱۹۳۱ء، [سٹوری، ۱: ۳۰۷]؛ (۱۳) یحیٰی قزوینی: لُبّ التواریخ، تہران ۱۳۱۴ش؛ (۱۴) غفّاری: جہان آرا (کتب خانۂ ولی الدّین اِفندی، شمارہ ۲۳۹۷)؛ (۱۵) وہی مصنّف: نگارستان (بمبئی ۱۲۷۵ھ)؛ (۱۶) نا معلوم مصنّف: افصح التواریخ (کتب خانۂ علی امیری)؛ (۱۷) مصلح الدّین لاری: مِرآۃ الادوار (نور عثمانیہ کتب خانہ، شمارہ ۳۱۵۶)؛ (۱۸) مُلّا احمد تتوی اور آصف خان: تاریخ اَلفی، ورق ۴۲۹ - ۴۳۲، ۴۳۹ - ۴۴۲ (مکتبۂ ملّیہ پیرس، بلوشہ: فہرستِ مخطوطاتِ فارسی، ضمیمۂ فارسی، شمارہ ۱۸۸)؛ (۱۹) ابراہیم حریر: تاریخ ہمایونی، ورق ۲۷۵ - ۲۸۰ (قومی کتاب خانہ، پیرس، فہرست، شمارہ ۱۸۴)؛ (۲۰) حیدر رازی: مجمع التواریخ، ورق ۲۲۹ - ۲۳۶ (وہی فہرست، شمارہ ۱۳۳۰)؛ (۲۱) خواجم قلی بیگ: تاریخ قِپچاق خانی، ورق ۵۴۷ - ۵۵۳، (وہی فہرست شمارہ ۱۸۷).

مخصوص فارسی تاریخیں:

(۲۲) تاریخ ترکمانیّہ (لنڈن، کتب خانۂ دیوانِ ہند [انڈیا آفس]۔ اس کتاب کا میرا نقل کیا ہوا نسخہ کتب خانۂ معارف ہ کالجی، انقرہ میں ہے)؛ (۲۳) تاریخ سلطان محمدقطب شاهی، ورق ۹ - ۱۸ (مکتبۂ ملّیہ، پیرس، فہرست مذکور، شمارہ ۱۷۴)؛ (۲۴) معین الدین [اُسفزاری]: روضات الجنّات (استانبول، مکتبۂ دانش گاہ، شعبۂ خالص اِفندی، شمارہ ۲۷۴۷؛ مکتبۂ ملّیہ، پیرس محلِّ مذکور، شمارہ ۲۳۷ (ورق ۶۷ - ۱۷، ۲۲۱ - ۲۲۳)؛ (۲۵) خواند امیر: دُستور الوزراء، تہران ۱۳۱۷ش، ص ۳۶۹ ببعد، ۳۷۸ ببعد، ۳۸۸، ۴۳۵ ببعد، ۴۴۸؛ (۲۶) دَوْلت شاہ: تذکرۂ شعراء، لائڈن ۱۹۰۱ء، ص ۴۶۲، ۴۷۶ ببعد، ۵۲۵ - ۵۲۹، ۵۳۶؛ (۲۷) سام میرزا: تحفۂ سامی، تہران ۱۳۱۴ھ (اس کی طباعت خراب ہے۔ نسخ خطّی کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے)؛ (۲۸) کمال الدّین حسین: مجالسِ العُشّاق، ورق ۱۷۷ (مکتبۂ ملّیہ، پیرس، فہرست مذکور، شمارہ ۱۴۲۴)؛ (۲۹) ظہیر الدین مَرعَشی: تاریخ گیلان و دَیلَمِستان، رشت ۱۳۳۰ھ، ص ۳۲۵ - ۳۴۶، ۴۲۰ - ۴۲۸، ۴۵۱ ببعد؛ (۳۰) وہی مصنّف: تاریخ طَبَرِسْتان، پیٹرزبرگ ۱۸۵۰ء، ص ۱۴۴، ۳۰۲، ۵۳۲، ۵۳۷؛ (۳۱) علی بن شمس الدین: تاریخ خانی (پیٹرزبرگ، شمارہ ۱۲۷۴).

عام عربی تواریخ:

(۳۲) تقی الدّین بن قاضی شُہْبَہ: ذَیل دُوَل الاسلام (مکتبۂ ملّیہ، پیرس، دیسلان: فہرست، شمارہ ۱۵۹۹، استانبول، کتب خانۂ اِسعد اِفندی، شمارہ ۲۳۴۵)؛ (۳۳) مقریزی: السُّلوک (مکتبۂ آیا صوفیا، شمارہ ۳۳۷۱، ۳۳۷۲)، نیز طبع مصر؛ (۳۴) ابن حجر: اِنباء الغُمر (مکتبۂ آیا صوفیا، شمارہ ۲۹۷۴)؛ (۳۵) بدرالدّین عَینی: عِقْد الجُمان (کتب خانۂ ولی الدّین اِفندی، شمارہ ۲۳۹۶، طوپ قپوسرای، کتب خانۂ سلطان احمد میں بھی ایک مکمّل نسخہ موجود ہے)؛ (۳۶) ابوالمحاسن ابن تَغری بردی: النُّجوم الزّاہرۃ، (کتب خانۂ آیا صوفیا، شمارہ ۳۴۹۸ و ۳۴۹۹)، مصر میں طبع ہوا؛ (۳۷) وہی مصنّف: حوادثُ الدُّھور (کتب خانۂ آیا صوفیا، شمارہ ۳۳۸۵)، نیز طبع امریکہ ۱۹۳۰ - ۱۹۳۲ء؛ (۳۸) سَخاوِی: ذَیل دُوَل الاسلام (کتب خانۂ کوپرولو، شعبۂ محمد پاشا، شمارہ ۱۱۸۹)؛ (۳۹) وہی مصنّف: التِبر المَسْبوک، مصر ۱۳۱۵ھ؛ (۴۰) احمد بن الحِمصی: حوادث الزّمان (کتب خانۂ فیض اللہ اِفندی، شمارہ ۱۴۳۸)؛ (۴۱) [علی] بن داؤد الجَوْہری: اِنباء الحَصْر (مکتبۂ ملّیہ، پیرس، فہرست مذکور، شمارہ ۱۷۹۱)؛

(۴۲) نصر الدّین الجعفری: بهجة السّالِک و المسلوک (مکتبۂ ملّیہ، پیرس، وہی فہرست، شمارہ ۱۶۰۷) ــ ان کے علاوہ پندرھویں صدی کے عرب مؤرّخین، مثل ابن عُذَیبہ وابن فَہد اور (۴۳) اسی صدی کے دیگر مصنّفین مثلاً ابن فتح اللہ البغدادی: تاریخ الغیاثی؛ (۴۴) سولھویں صدی کے مصنّفین میں سے ابن اِیاس: بدائع الزُّھُور، مصر ۱۳۱۱-۱۳۱۲ھ؛ استانبول، حصّۂ سوم وچہارم، ۱۹۳۱-۱۹۳۶ء؛ (۴۵) جَنابی: العَیْلَم الزّاخِر (کتاب خانۂ آیا صوفیا، شمارہ ۳۰۳۳)؛ سترھویں صدی کے مصنّفین میں سے (۴۶) ابوالعبّاس احمد القرہ مانی: اخبار الدُّوَل؛ (۴۷) ابن الأثیر: التأریخ الکامل، بولاق ۱۲۹۰ھ، ۴: ۸۷-۹۶، درحاشیہ (بغداد میں علٰحدہ سے پتھر کے چھاپے سے بھی طبع ہوئی ہے)؛ (۴۸) کاتب چلبی: [فَذْلَکَۃَ التواریخ (کذا) الدول الاسلامیۃ] (مصنّف کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا منحصر بفرد نسخہ بایزید عمومی کتب خانے میں ہے)؛ (۴۹) مُنَجِّم باشی دِرویش احمد افندی: صحائف الاخبار فی وقائع الأعصار یا جامع الدُّوَل (طوپ قپوسرای، کتب خانۂ سلطان احمد، شمارہ ۲۹۵۴، دوجلد؛ کتب خانۂ اسعد افندی، شمارہ ۲۱۰۱-۲۱۰۳؛ بایزید عمومی کتب خانہ، شمارہ ۵۰۱۹ و ۵۰۲۰)۔ زیادہ متأخّر دَور کی تصانیف میں (۵۰) رَوامِز الاَعْیان ہے، جو عمومی تاریخ ہے (کتب خانۂ اسعد افندی، شمارہ ۲۱۲۷ و ۲۱۲۸؛ ایک اَور نسخہ خالد افندی کے کتب خانے میں ہے)۔ ہمارے اپنے زمانے کے مؤرّخین میں سے: (۵۱) عبّاس العزّاوی: تاریخ العِراق، بغداد ۱۳۵۷ھ، جلد ۳ــ مخصوص مؤرّخوں میں سے: (۵۲) ابن بہادر: مجموعة فی تواریخ التُّرکُمان اور (۵۳) ابن اَجا: تاریخ یَشْبَک، ہر دو ایک جلد میں (طوپ قپوسرای، کتاب خانۂ سلطان احمد، شمارہ ۳۰۵۷)ــ تراجم [سِیَر] کی کتابوں میں سے: (۵۴) مَقریزی: الدُّرر العُقُود الفریدة فی تراجم الأعیان المفیدة؛ (۵۵) ابن تَغری بَردِی: المَنْہل الصافی (کتب خانۂ نور عثمانیہ، شمارہ ۳۴۲۸ و ۳۴۲۹)، اس کا ذیل: (۵۶) سَخاوی: الضوء اللّامع، قاہرہ ۱۳۵۳-۱۳۵۵ھ، ۱۲ جلد.

عام ترکی تواریخ:

(۵۷) محمّد میر زعیم: جامع التواریخ (کتب خانۂ فاتح، شمارہ ۴۳۰۶)؛ (۵۸) عالی: کُنہ الاخبار؛ (۵۹) وہی مصنّف: فصول الحَلّ و العَقْد؛ (۶۰) لاری: تاریخ (ترجمہ خوجۂ سعد الدین افندی)؛ (۶۱) جنابی کی تاریخ کا مختصر ترجمہ، گُلشنِ تواریخ (نور عثمانیہ کتب خانہ، شمارہ ۳۰۹۷)؛ (۶۲) جامع السِّیَر؛ (۶۳) مُنجّم باشی کے مختصر ترکی ترجمے.

تواریخِ آلِ عثمان:

پندرھویں اور سولھویں صدی میں تحریر شدہ مختلف سال ناموں کے علاوہ کتبِ ذیل قابل ذکر ہیں: (۶۴) دستور نامۂ اَنوری (طبع مُکرمِین خلیل)؛ اور (۶۵) نشانجی قرہ مانی محمّد پاشا کی تاریخ آل عثمان (ترجمہ مُکرمِین خلیل، در *TOEM*، استانبول ۱۹۲۴ء، XIV، ج ۲-۳)؛ اور (۶۶) عاشق پاشازادہ، نشری، اورُوج بک، طُرسُون بک، بہشتی، رُوحی کی تاریخوں اور گمنام مصنّفین کی تاریخوں سے Gize کی شائع کردہ گمنام تاریخ موسوم بہ فتحِ نامۂ ابوالخیر (مکتبۂ ملّیہ، پیرس، بلوشہ: فہرست عربی، فارسی، ترکی، شمارہ ۱۱۷)؛ (۶۷) تاریخ آل عثمان (وہی فہرست ضمیمۂ ترکی، شمارہ ۱۰۴۷ اور ایک گمنام نسخہ در کتب خانۂ ڈریسڈن (Dresden) قابلِ ذکر ہیں۔ سلطنت عثمانیہ کے ماتحت ملازمت اختیار کرنے سے پہلے آق قویُونلُو کا میرمنشی (''نشانجی'') ادریس بِتْلیسی اپنی (۶۸) ہشت بہشت میں ان کی بابت اہمّ معلومات مہیّا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ (۶۹) شیخ شمس الدّین محمّد: تاریخ آل عثمان (جس کا منحصر بفرد نسخہ میرے ذاتی کتب خانے میں ہے)؛ (۷۰) ابن کمال؛ (۷۱) جمالی؛ اور (۷۲) لُطفی پاشا کی آل عثمان کے نام سے تواریخ؛ اور (۷۳) خواجہ سعد الدّین کی تاج التواریخ اس موضوع کے لیے اہم مآخذ ہیں۔ چونکہ اس کا دادا آق قویُونلُو کی ملازمت میں تھا اس لیے خواجہ سعد الدّین اس حکومت کے انحطاط وزوال کا مختصر لیکن مفید مطلب حال بیان کرتا ہے (۲: ۱۱۴-۱۲۶)؛ (۷۴) شرف خان بِتْلیسی کے شرف نامہ (طبع مصر و پیٹرزبرگ) میں آق قویُونلُو کے زمانے میں مشرقی آناطولی کی تاریخی اور اقوام کی شرح نژاد (ethnography) کے بارے میں معلومات موجود ہیں؛ (۷۵) مَناقِبِ گُلشَنی (کتب خانۂ اسعد افندی، شمارہ ۱۳۴۲)، آق قویونلو کی تاریخ پر مشتمل معلومات سے پُر ہے؛ (۷۶) *Kürtler* [کُرت لر = کُردلر] میں، جو ۱۳۴۴ھ میں بمقام استانبول جرمن سے ترکی میں ترجمہ ہوئی، شرف نامۂ مذکور کی سب معلومات لی گئی ہیں۔ موجودہ زمانے کی کتب میں سے: (۷۷) عبدالرحیم شریف: اَرضِ رُوم تاریخی؛ اور اسی مصنّف کی (۷۸) اَخلاط کتابہ لری؛ اور (۷۹) اسمٰعیل حقّی اوزون چارشی لی: اناڈولو بک لِک لری، استانبول ۱۹۳۷ء، ص ۶۳-۶۹، ۷۴-۷۷، ۸۸ بعد، ۱۰۰.

ارمنی تواریخ میں سے جو آق قویُونلُو کے عہد میں تحریر ہوئیں: (۸۰) Thomas de Medzoph کی تاریخ اب تک موجود ہے۔ اس نے اپنے ہمعصر قرہ یُولُوق عثمان بیگ کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں (دیکھیے ص ۹۴-۱۱۲، ۱۲۱، ۱۳۳)؛ (۸۱) اٹھارھویں صدی کا ارمنی مصنّف چمچیان Çamiçiyan (= ترکی ترجمہ آندریاسیان (H. Andreasyan) طبع کر رہا ہے) ان معلومات کا بعض اضافوں کے ساتھ اعادہ کرتا ہے؛ (۸۲) اس دور اور آق قویونلو کی تاریخ کے لیے اہمّ ترین مآخذ میں ایک گمنام مصنّف کے سریانی وقائع ہیں (لاطینی ترجمہ از O. Behnsch، طبع وُراتی سلاف (Vratislav)، ۱۸۳۸ء؛ بج (A. W. Budge) کے انگریزی ترجمے کے لیے دیکھیے *The Chronography of Bar Habraeus*، لنڈن ۱۹۳۲ء ج ۲، ذیل Iiii-xxxii)؛ (۸۳) ــ گرجی مآخذ میں بھی آق قویونلو کے بارے میں کچھ معلومات موجود ہیں لیکن زیادہ واضح نہیں ہیں؛ دیکھیے *Histoire de la Géorgie, traduite du géorgien par Brosset*، ۱: ۶۸۶؛ ۲: ۴۰۸-۴۱۰؛ حصّۂ دوم، کتاب اوّل: ص ۱۲-۱۶، ۱۴۹، ۲۰۹ بعد، ۲۵۱ بعد، ۳۲۲-۳۲۹، ۳۸۱ بعد.

یونانی مآخذ: (۸۴) سلطنت طَرَبزُون کے مؤرّخ Panaretos (پناریطوس) کے علاوہ، جس کا ذکر متنِ مادّہ میں ہو چکا ہے؛ (۸۵) *Kritobolus* (= ترکی ترجمہ از Karolidi، استانبول ۱۳۲۸ھ، ص ۱۵۰-۱۵۳)؛ (۸۶) Chalcondiyle (فرانسیسی

ترجمہ از Vigener Bourbonnois، پیرس ۱۶۱۲ء، ص ۲۷۶ بعد)؛ (۸۷) Ducas: Hist. de Constantinople (فرانسیسی ترجمہ از Cousin، پیرس ۱۶۷۴ء، ۸: ۶۱۳، ۶۱۶)؛ (۸۸) اوزون حسن کے دربار میں جمہوریۂ وینس کے سفیروں میں سے Barbaro Contarini اور Zeno کے سیاحت نامے مجموعۂ رامُوسِیو (Romusio) میں شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کی اور دیگر سفرا کی سیاسی سرگرمیوں کے لیے نیز اوزون حسن کے یورپ کی سلطنتوں کے ساتھ تعلّقات اور خط و کتابت کے بارے میں دیکھیے (۸۹) Minorsky: La Perse au XV^e Siècle entre la Turquie et Venise، پیرس ۱۹۳۳ء اور (۹۰) مادّۂ اوزون حسن در آ آ طبع اوّل؛ نیز (۹۱) اسی مصنّف کے تبصرے: A Soyūrghal of Qâsim bin Jahāngir Aqqu-yunlu؛ اور (۹۲) A civil and military review in 881/1476، (در BSOS، ج ۹، قسم چہارم اور ج ۱۰، قسم اوّل) کے عنوان سے موجود ہیں؛ نیز دیکھیے (۹۳) Mas Latrie: Hist. de l'Île de Chypre، پیرس ۱۸۶۱ء، ۳: ۳۳۶، ۳۵۲، ۳۸۷؛ (۹۴) وہی مصنّف: Documents nouveaux servant de preuves à l'hist. de l'Île de Chypre، پیرس ۱۸۸۶ء، ص ۴۱۲، ۴۷۷-۴۸۷؛ (۹۵) J. Ph. Fallmerayer: Geschichte des Kaiserthums von Trapezunt، ص ۲۰۸، ۲۱۶-۲۱۹، ۲۵۸-۲۶۲، ۲۶۴-۲۷۹، ۲۸۱-۲۸۴، ۳۱۶؛ (۹۶) Pfaffenhoffen: Essai sur les aspres comnénats de Trébizond، ص ۶۵ بعد، ۶۹؛ (۹۷) Miller: Trebizond the last Greek Empire، لنڈن ۱۹۲۶ء؛ (۹۸) Artus Thomas: Continuation de l'hist de Chalcondyle، ص ۱۱۹-۱۲۳، ۲۱۲-۲۲۴؛ (۹۹) ہامر (von Hammer): دولتِ عثمانیہ تاریخی (ترکی ترجمہ، محمد عطا، استانبول ۱۳۲۸-۱۳۳۰ھ)، ج ۲، ۳، ۴؛ [(۱۰۰) سید اظہر علی: قرا قویُونلُو ترکمان در روئداد ادارۂ معارفِ اسلامیہ، لاہور ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء، ص ۳۶۰-۴۰۲].

(مُکْرمِین خلیل یِنانچ) (از آ آ، ترکی)

✱ **آق کِرمان:** (اَق کِرمان)، "سفید شہر" (یا سفید تجارتی مرکز) رُومینی زبان میں Cetatea Albă "سِیتاتیا آلبا"، روسی میں بیلغورود (Belgorod)، دریاے نِیستر (Dniester) کے دہانے کے بائیں کنارے پر واقع ہے، عہدِ قدیم میں اسے Tyras کہتے تھے۔ بقولِ قسطنطین پورفیرُوجنت Constantine Porphyrogenetus (تصحیح و ترجمۂ Moravesik-Jenkins، ص ۱۶۸، ۶۲) اس کے قلعے کو سفید قلعہ کہتے تھے، لیکن ایک گمنام مصنّف کی کتاب "Torpa-rcha Gothicu" میں (دیکھیے B. Hase کی طباعت Leo Diaconus) ص ۴۹۶ بعد اسے Maurokastron (قلعۂ سیاہ) کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ۱۲۴۱ء کے بعد یہ مغلوں کے زیرِ اقتدار تھا اور جنیوی سوداگر یہاں برابر آتے جاتے تھے۔ وہ اس شہر کو Malvocastrum, Moncastrum، اور Maurocastrum بھی کہتے تھے، لیکن Album Castrum بھی کہا کرتے تھے۔ ابوالفداء ابنِ سعید کا تتبّع کرتے ہوے اسے آقچۂ کِرمان کے نام سے یاد کرتا ہے۔ عالی (کُنْہُ الاخبار، ۴: ۲۱۸) بحوالۂ ابوالفداء لکھتا ہے: "آقچۂ کِرمان آج کل 'آق کِرمان' کے نام سے مشہور ہے".

چودھویں صدی میں Maurocastro-Moncastro ایک جنیوی قلعہ تھا، جو انتظامی حیثیت سے ماموریت خَزَرِیّہ (Officium Gazariae) کے تحت تھا۔ خزریّہ میں وہ تمام نوآبادیاں شامل تھیں جو بحیرۂ اسود کے شمالی ساحل پر واقع تھیں۔ اس جنیوی قلعے کی مرمّت و تجدید اہلِ مَولدیُویا نے اور پھر ترکوں نے کی اور وہ اب تک موجود ہے۔ چودھویں صدی کے اختتام پر دولت مولدیویہ (ترکی زبان میں بُغدان [رکّ بآن])، جو اس زمانے میں نئی قائم ہوئی تھی، اس شہر پر قابض ہوگئی اور ۱۴۸۴ء تک اس پر مولدیویا ہی کو غلبہ و اقتدار حاصل رہا۔ ۱۴۲۰ء میں ترکوں کے بحری بیڑے نے اس قلعے پر حملہ کیا اور پھر ۱۴۵۴ء میں ایک اَور حملہ کیا۔ ۱۴۵۵ء میں ویودہ [تلفّظ: وائی وُودَہ، بمعنی والی، شہردار] پِطرُو ثالث (Voivoda Petru III) نے بُغدان پر سلطنتِ عثمانیہ کے شاہی حقوق تسلیم کر لیے۔ سلطان محمد ثانی نے اپنے ایک شاہی فرمان مؤرخہ ۵ رجب ۸۶۰ھ/ ۹ جون ۱۴۵۶ء کے ذریعے سیتاتیا آلبا (Cetatea Albă) کے تاجروں کو اِدِرنہ، بروسہ اور استانبول میں آنے جانے کی اجازت دے دی.

سلطان بایزید ثانی نے بنفسِ نفیس حملہ کر کے خاص شہر پر ۴ اگست ۱۴۸۴ء کو قبضہ کر لیا (قب فتح نامہ بی قرہ بُغدان، مخطوطۂ قاہرہ، ادبِ ترکی، [ورق] ۱۳۱ و ۱۰۳ ابعد؛ I. Ursu: Stefan cel Mare، بخارسٹ ۱۹۲۵ء، ۲۰۲-۲۰۴؛ I. Bogdan: Cronīce inedite atingătoare de istoria Românilor، بخارسٹ ۱۸۹۵ء، ص ۴۳، ۵۸)۔ اس شہر کے اکثر باشندے استانبول اور آناطولی وغیرہ میں منتقل کر دیے گئے اور آق کِرمان کو روم ایلی کے بیکلر بیکی کے تحت ایک علٰحیدہ سَنْجاق بنا دیا گیا۔ جب ۱۵۹۳ء میں اُوزِو Özü [رکّ بآن] کی 'ایالت' قائم ہوئی تو آق کرمان کو اُس میں شامل کر لیا گیا۔ عینِ علی: قوانینِ آلِ عثمان (استانبول ۱۲۸۰ھ، ص ۱۲) میں ہے کہ اس سَنْجاق میں ۹۱۴ تیمار تھے۔ بندرگاہ کے ضوابطِ گُمرُک (چنگی کے محصول کے قوانین) بھی اسی زمانے میں مرتّب ہوے۔ اِوْلِیاء چلبی (۵: ۱۰۸ بعد) نے، جو ماہ مئی ۱۶۵۸ء میں وہاں گیا تھا، اس شہر کا حال بیان کیا ہے۔ وہ قلعہ ('بِیرُون' کے بجاے 'دَرُون'، پڑھیے)، بایزید دوم منگلی گِرای خان اور سلیم اوّل کی تعمیر کردہ مسجدوں اور بایزید ثانی کے تعمیر کردہ حمّام کا ذکر کرتا ہے۔ وہ (۷: ۵۰۱ میں) مَیاق بابا سلطان کی خانقاہ کا بھی، جو دریاے نِیسْتر (Dniester) کے پایاب حصّے کے قریب واقع ہے، ذکر کرتا ہے۔ محمد افندی آق کِرمانی، مشہور و معروف ترکی فلسفی، اسی شہر کا باشندہ تھا (قب بُرسَلی محمد طاہر: عثمانلی مؤلّف لری، ۱: ۲۱۴)۔ اصلی باشندوں کے علاوہ آق کرمان شہر اور ضلع میں ترک، قریمی اور نوگائی تاتاری رہتے

تھے۔ ۱۵۹۵ء میں مولڈیویا کے والی یعنی ویودہ آرون (Voivoda Aron) نے اس قلعے کی تسخیر کی سعی کی، اُس کے بعد یہاں تاتاری بھی بسا دیے گئے۔

۱۵۰۲ء میں آلتین اردو (اردوی زرّین=Golden Horde) کا آخری سردار شیخ احمد اپنی فوج کو دوبارہ جمع کرنے کے لیے آق کرمان میں بھاگ آیا۔ سلیم اوّل نے آق کرمان کو اپنے باپ بایزید ثانی (یکم اپریل ۱۵۱۱ء) کے خلاف اپنی فوجی کارروائیوں کا مرکز بنایا۔ ۱۶۱۰ء میں قریم کے محمد گرای اور اس کے بھائی شاہین گرای نے یوکرین (Ukraine) کے علاقے میں یلغار کرنے کے لیے اس شہر کو اپنا قاعدۂ عمل بنایا مگر انھیں کے بھائی خان جان بک گرای نے انھیں یہاں سے نکال دیا (قب I. H. Uzunçarşîlî: *Osmanli Tarihi*، ۳/۱: ۷۶)۔ ۱۶۱۸ء اور ۱۶۲۶ء کے درمیان قانتمیر (Kantemir) پاشاے سِلِسترہ (Silistria) نے دریاے ڈینیوب [طونہ] اور نیستر کے درمیانی علاقے کو اپنے حیطۂ اقتدار میں لا کر 'قالغای' [= ولی عہدی، (اس منصب کے لیے دیکھیے سامی، ۵: ۳۶۵۴، عمود ۱، س ۱۲)] حسین گرای کو "آق کرمان کے میدان میں" شکست دی (حاجی خلیفہ: فذلکہ، ۲: ۱۸۷)۔ لیکن مراد چہارم نے اس کا سر اڑا دیا (Uzunçarşîlî، ۱۸۰)۔ اولیاء چلبی (۷: ۴۹۷) محمد گرای خان کے تاتاریوں اور عادل گرای کے تاتاریوں کے درمیان ایک لڑائی کا ذکر کرتا ہے، جو آق کرمان کی دیواروں کے نیچے ہوئی۔

۱۶۸۳ء میں قازاقوں (Cossack) کا سردار کونجکی [تلفظ مشتبہ] Kunicki آق کرمان تک بڑھ آیا لیکن اسے 'سردار بوسنک صاری سلیمان پاشا (فندقلی لی محمد آغا: سلاحدار تأریخی، استانبول ۱۹۲۸ء، ۱: ۳۹۷؛ ۲: ۱۲۷، ۱۸۵) نے پسپا کر دیا۔ روسی جرنیل Igelström نے ۱۷۷۰ء میں اس شہر پر قبضہ کر لیا لیکن کوچک قینارجہ کے عہد نامے (دفعہ ۱۶) کی رُو سے اسے بابِ عالی کو واپس کر دیا گیا۔ ۱۶۸۰ء میں قلعے کی مرمّت ہوئی (طوپ قپی آرشیوی، E 10:216؛ دوسری مرمّتوں کے لیے جو ۱۶۴۶ء اور اس کے بعد ہوئیں دیکھیے وہی کتاب، E5880، 6237)۔ ۱۷۸۹ء میں پوٹمکن (Potemkin) نے دوبارہ اس پر قبضہ کر لیا (جودت: تأریخ، طبع دوم، ۴: ۳۳۲)، لیکن یاش (Yassi) کی صلح کے موقع پر (۱۷۹۲ء) اسے پھر ترکیہ کو واپس کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس قلعے کے استحکامات اور مضبوط کر دیے گئے۔

۱۸۰۶ء میں اس شہر پر روسی کرنیل Förster اور شہزادۂ قانتا قوزن (Kantakuzino) نے قبضہ کر لیا۔ تاتاری لوگ اس علاقے کو چھوڑ کر نیستر کے مشرقی کنارے پر آباد ہو گئے۔ بخارسٹ کی صلح (۱۸۱۲ء) پر آق کرمان کو روسی مملکت کے حوالے کر دیا گیا۔ ۱۸۲۶ء میں یہیں روس اور ترکیہ کے درمیان "قرارداد آق کرمان" پر دستخط ہوے، جس میں رومانیہ کی ریاستوں اور صربیا کے متعلق معاہدہ ہوا، جس پر کچھ تھوڑے ہی عرصے کے لیے عمل ہو سکا۔ اس کے بعد بسارابیہ میں جو انقلابات آئے اور حوادث واقع ہوے یہ شہر بھی ان میں شریک رہا۔

مآخذ: (۱) N. Iorga: *Studii istorice asupra Chiliei şi Cetatii-Albe*، بخارسٹ ۱۸۹۹ء؛ (۲) G. I. Bratianu: *Recherches sur Vicina et Cetatea Albă*، بخارسٹ ۱۹۳۵ء؛ (۳) وہی مصنّف: *Contributions à l' histoire de Cetatea-Albă (Akkerman) aux XIII^e et XIV^e siècles*، Acad. Roumaine Bull. Sect. Hist. xiii، بخارسٹ ۱۹۲۷ء، ص ۲۵ بعد؛ (۴) B. Spuler: *Gesch. d. gold. Horde*، ص ۴۰۸ (عہد جنیوا میں خوارزم اور چین سے تجارتی تعلقات)؛ (۵) فریدون بک: مُنشئاتِ سلاطین، ۱: ۳۱۲، ۳۱۹؛ (۶) حسن اسیری: مخطوطۂ ملّت کتب خانہ سی، T 803 (دیکھیے Babinger، ص ۲۶۷)؛ (۷) A. Decei: *Les Fetiḥnāme-i Karaboğdan des XV^e et XVI^e siècles, Actes XII^e Congr. Orient.*؛ (۸) O. F. V. Schlechta - Wssehrd: *Walachei, Moldau, Bessarabien etc. in der Mitte des vorigen Jahrh.*، در SBAK وی آنا ۱۸۶۳ء؛ (۹) *Documente privitoare la istoria Românilor*، از E. de Hurmuzaki، بخارسٹ ۱۸۸۷ء بعد؛ (۱۰) اولیاء چلبی: سیاحت نامہ (طبع جودت ۵: ۱۰۸-۱۱۴)؛ (۱۱) I. Bowman: *Le Monde Nouveau*، ص ۲۴۱].

(A. DECEI)

⊗ **آق مسجد:** "سفید مسجد" دو بڑے شہروں کا نام ہے:

(۱) آق مسجد (مقامی تلفظ: آق مچت Akmeçit) جو ۱۷۸۴ء سے قریم (کریمیا) کا مرکز حکومت رہا ہے اور جسے روسی سمفِروپول (Sympheropol) کہتے ہیں۔ یہ شہر سولھویں صدی عیسوی میں خوانینِ قریم نے اس لیے بسایا تھا کہ قریم کا قدیم پایۂ تخت باغچہ سرای اُن قبائل کے سرداروں کی دست بُرد سے محفوظ ہو جائے جو اس کے آس پاس کے بے درخت چٹیل میدانوں (steppes) میں رہتے تھے اور چونکہ وہ ولی عہدِ سلطنت ("قالغای سلطان") کی جاے اقامت بن گیا اس لیے آق مسجد نے ایک مستحکم قلعے کی شکل اختیار کر لی۔ اس سے پہلے میلادِ مسیح سے قبل تورانی (سِتھیائی، سکیت Scythian) بادشاہ سَکیلُورُس (Skiluros) نے بھی اس جگہ ایک قلعۂ نیاپولس (Neapolis) کے نام سے تعمیر کیا تھا، تاکہ انھیں میدانوں کے باشندوں کے حملوں کی روک تھام کی جا سکے (سٹرابو (Strabo)، ۷: ۳۱۲)۔ قلعۂ آق مسجد کی تعمیر کے بعد بھی یہ پرانا قلعہ، جو خوانینِ قریم کے زمانے میں کرمنچک (Kirmenchik) کے نام سے مشہور تھا، نئے قلعے کے پہلو میں ایک گاؤں کی صورت میں باقی رہا۔ جب روس نے ۱۷۳۶ء میں اسے برباد کیا تو یہ ۱,۸۰۰ گھروں کا ایک شہر تھا۔ اگرچہ آق مسجد قالغای کے رہنے کی جگہ تھی تاہم ۱۷۸۳ء میں اس کی کل آبادی ۸۱۵ نفوس پر مشتمل تھی۔ اب آق مسجد، سمفِروپول (Sympheropol) کے اس حصّے کا نام

ہے جہاں ترکوں کی آبادی ہے اور روسی بھی اس نام کو استعمال کرتے ہیں، لیکن وہاں کے رہنے والے ترک سمفروپول کا نام کبھی استعمال نہیں کرتے۔ ۱۹۳۱ء میں شہر کی مجموعی آبادی روسی اور ترک ملا کر ۸۸,۰۰۰ تھی.

(آآ، ترکی) (احمد زکی ولیدی طوغان)

(قالغای کے محلّ کے وسط میں مِنگلی گرای کی مسجد واقع ہے۔ اِوْلیاء چلبی (دیکھیے سیاحت نامہ، ۷: ۶۳۸-۶۴۱) کا بیان ہے کہ قالغای کا محلّ شہر کے اندر نہیں ہے بلکہ حومۂ شہر میں ہے [جو شہر کے جنوب میں ہے اور اس سے متصل]).

(آآ طبع دوم) (بارٹولڈ)

(۲) آق مسجد: سیر دریا پر ایک قلعہ، [جو خانِ خوقند کے قبضے میں تھا مگر] جسے روسیوں نے [جنرل پیرُوفسکی (Perovsky) کی قیادت میں] ۹ / اگست (۲۸ جولائی) ۱۸۵۳ء کو ہلّہ بول کر لے لیا اور اسی سال کے دوران میں از سرِ نو تعمیر کر کے اس کا نام قلعۂ پیرُوفسکی (Fort Perovsky) رکھا اور یہ سیر دریا کی ایالت کا صدر مقام ہے اور اس کی آبادی پانچ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ خان خوقند نے خوقندی خوانین کو سیر دریا کے زیریں حصّے میں جتنے بھی قلعے تعمیر کرنے کا حکم دیا وہ سب آق مسجد کے حاکم کے تحت تھے۔ اُس خراج ('زکوٰۃ') کے علاوہ جو خانہ بدوش ادا کرتے تھے اورنبرگ (Orenberg) اور بخارا کے درمیان کاروانی سڑک کی راہداری کی رقمیں بھی آق مسجد ہی میں وصول کی جاتی تھیں۔ مارچ ۱۸۵۲ء میں یہاں کے والی یعقوب بیگ [رکّ بآن] کی قیادت میں، جو بعد میں کاشغر کا حکمران بن گیا، خوقندی فوجوں نے، ان قازاقوں کے خلاف جو روسیوں کی رعایا تھے، ایک غزوہ شروع کیا اور ان کی سو کے قریب وقتی خیمہ گاہیں ('آوَل' auls) لُوٹ لیں۔ اسی سال جولائی میں روسی کرنیل بْلا رَم بَرگ (Blaramberg) کے حملے کو یعقوب کے جانشین باتر باشی نے پسپا کر دیا۔ اگلے سال جنرل (بالآخر کاؤنٹ) پیرُوفسکی (Perovski) کی قیادت میں جو روسی حملہ ہوا اس میں مبالغہ آمیز دور اندیشی و احتیاط سے کام لیا گیا، جس سے بلا ضرورت سی بہت جانوں کا نقصان ہوا۔ آق مسجد کی کل قلعہ نشین فوج ۵۰۰ سپاہیوں اور تین توپوں پر مشتمل تھی۔ قلعے کا والی محمد علی (تاریخ شاہرخی، ص ۹۸؛ روسی مآخذ کے مطابق: محمد ولی یا عبدالولی) مدافعت کرتا ہوا قلعہ نشین سپاہیوں کی اکثریت سمیت مارا گیا۔ روسیوں نے صرف چوہتّر قیدی پکڑے، جن میں سے بیشتر زخمی تھے۔ آق مسجد کو واپس لینے کی غرض سے جو فوج مِنگباشی [کرنل] قاسم بیگ کی قیادت میں خوقند سے بھیجی گئی وہ بھاری نقصانات اٹھا کر پسپا ہونے پر مجبور ہو گئی۔ روسیوں کے ہاتھوں آق مسجد کی تسخیر وسطی ایشیا کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن واقعہ تھا، کیونکہ زیریں سیر دریا پر یہ پہلا مقام تھا جسے انھوں نے مسخّر کیا۔ فوجی تاریخ میں اس کا ذکر جنگی چالوں کی ایسی مثال کے طور پر آتا ہے جو وسطی ایشیا میں بالکل بے کار ثابت ہوتی ہیں [آق مسجد کا نام ۱۹۲۴ء سے قزل اوردہ ہو گیا اور وہ ۱۹۲۸ء تک جمہوریۂ قازاقستان کا مرکزِ حکومت رہا۔ آج کل یہ ایک صوبے کا صدر مقام ہے].

(آآ، طبع اوّل) (بارٹولڈ W. BARTHOLD)

---

* **آقا رضا:** رکّ بہ رضا.

---

* **آقا رضاعی:** رکّ بہ رضاعی.

---

* **آقچہ:** (ترکی = ''چھوٹا سفید'') عثمانی سلطنت کے چاندی کے ایک سکّے کا نام، جسے یورپی مصنّفین نے اکثر Aspre یا Asper (ماخوذ از یونانی aspron، بمعنی ''سفید'') لکھا ہے۔ اس نام کا سکّہ بارھویں صدی میں اصفہان کے سلجوقی سلاطین کے ہاں بھی رائج تھا (دیکھیے راوندی: راحة الصدور، ص ۳۰۰، جہاں ایک ہزار 'اقچے' کے ایک عطیے کا ذکر ہے)۔ عثمانی ترکوں نے گزشتہ اور ہم عصر اسلامی سلطنتوں کے دستور کے خلاف اپنے سکّوں کے نام درہم اور دینار نہیں رکھے، بلکہ انھوں نے سلطان اورخان کے عہد میں سب سے پہلے ۷۲۷ھ / ۱۳۲۷ء میں جو سکّہ چلایا اس کا نام ''آقچۂ عثمانی'' رکھا۔ اس سکّے کا وزن چوتھائی مثقال یا چھے قیراط تھا، لیکن آقچے کا وزن ہمیشہ یکساں نہیں رہا اور وقت گزرنے پر اس کی قیمت گرتی گئی۔ اورخان کے سکّے میں چاندی ۹۰ فی صد تھی اور اس کا قطر ۱۸ ملی میٹر تھا۔ مراد ثانی کے عہد تک آقچے کا حجم تو کسی قدر کم ہو گیا، لیکن اس کے کھرے پن کا معیار اور صحیح وزن بہت حد تک قائم رہا۔ محمد ثانی، بایزید ثانی اور سلیم اوّل کے عہد میں چاندی کی مقدار میں پانچ فی صد کی کمی کر دی گئی اور سکّے کا وزن بھی بجائے چھے کے پونے چار قیراط رہ گیا۔ سلطان سلیمان اوّل اور سلیم دوم کے عہد میں اس روز افزوں انحطاط کی کچھ روک تھام کی گئی، لیکن یہ سلسلۂ انحطاط مراد ثالث اور اس کے جانشینوں کے زمانے میں، عثمان ثانی کے عہد تک، رک رک کر جاری رہا، یہاں تک کہ آقچے کا وزن گھٹتے گھٹتے ڈیڑھ قیراط رہ گیا اور آقچہ دن بہ دن پتلا ہوتا چلا گیا۔ علاوہ ازیں مراد رابع، ابراہیم اور محمد رابع کے عہد میں چاندی کی مقدار پہلے ستّر فی صد اور پھر اور کم ہو کر پچاس فی صد رہ گئی، اگرچہ اس کا وزن اور حجم تقریبًا وہی رہا جو پہلے تھا۔ اس انحطاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں محمد ثانی کے عہد کی پہلی عثمانی اشرفی میں ۴۰ آقچے ہوتے تھے۔ وہاں مصطفٰی ثانی کے عہد میں (جب کہ سکّے کی اصلاح کے سلسلے میں پہلی بار عثمانی قُرُوش مضروب ہوئے) اشرفی کی قیمت، جس کا اپنا وزن اور معیار بہت حد تک باقی رہا، بڑھ کر تین سو آقچے ہو گئی (دیکھیے اسمٰعیل غالب: تقویم مسکوکاتِ عثمانیه، ج ۲).

اب سے کوئی پچاس سال پہلے عثمانی زرِ نقد فرضی طور پر حسبِ ذیل اجزا و اَضعاف میں منقسم تھا: ایک قُرُوش = ۴۰ پارہ، ایک پارہ = ۳ آقچہ اور ایک آقچہ = ۳ پول۔ جب تک ترکی زرِ نقد کا معیاری سکّہ قُرُوش قرار نہیں پایا تھا اُس

وقت تک آقچے ہی سے یہ کام لیا جاتا تھا (دیکھیے مادّۂ سلیمان ثانی)۔ سولھویں صدی کے وسط میں ۲۰ ہزار، سترھویں صدی کے وسط میں ۴۰ ہزار اور اٹھارھویں صدی کے آغاز میں ۵۰ ہزار آقچے کا ایک ''کیسہ'' مانا جاتا تھا، لیکن اس صدی کے آخر تک ایک کیسہ ۸۰ ہزار آقچے کا ہو گیا۔ انیسویں صدی کے وسط میں ایک ''کیسہ آقچہ'' (''کیسُ آقچہ'') ۵۰۰ قروش کا مخصوص نام ہو گیا.

محمود ثانی کے عہد تک آقچہ برابر مضروب ہوتا رہا، لیکن رفتہ رفتہ سترھویں صدی کے آخر تک اس کی قیمت اتنی گر گئی تھی کہ اس کی حیثیت ایک رسمی سکّے سے زیادہ نہ رہی اور اب وہ محض ایک حسابی وحدت کے معنے میں استعمال ہونے لگا۔ دورِ 'تنظیمات' میں اس کی یہ حیثیت بھی، اوقاف کے حساب و کتاب کے سوا، ختم ہو گئی۔ پندرھویں صدی کے وسط سے آقچہ کا لفظ نقدی یعنی ''پارہ'' کے مفہوم میں بھی استعمال ہونے لگا اور مؤخّر عثمانی دورِ حکومت میں اس کے یہ معنی یقیناً عام طور پر مروّج ہو گئے تھے، جیسا کہ سلامت آقچہ سی، عوارض آقچہ سی، لالہ یورگوچ آقچہ سی، آقچہ کیسہ سی، آقچہ تختہ سی، آق آقچہ، گیچر (کھرا) آقچہ، قلب (کھوٹا) آقچہ، وغیرہ کی سی ترکیبوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ شمالی علاقوں کے ترکی بولنے والے آقچہ کو عموماً دونوں معنوں میں استعمال کرنے لگے تھے (قب Radloff: *Wörterbuch*، بذیل کلمہ)۔ چودھویں اور پندرھویں صدی میں ''آقچۂ عثمانی'' کو صرف ''عثمانی'' کہتے تھے، لیکن سلطان سلیم اوّل کے عہد سے یہ نام متروک ہو گیا اور اس سکّے کو صرف ''آقچہ'' کہنے لگے۔ ترکی تاریخ میں اس سکّے کا ذکر مختلف ناموں سے آیا ہے، مثلاً زُیُوف (جعلی) آقچہ، کِرُپک (کٹا ہوا) آقچہ، قِزِیل (سرخ) آقچہ، میخانہ آقچہ سی، چِل (چمکتا ہوا) آقچہ وغیرہ ان اصطلاحوں سے غالباً آقچے کے وزن اور قیمت کے اختلاف کا اظہار ہوتا ہے۔ ''چوروک (سڑے ہوے) آقچہ'' کے نام سے تانبے کے سکّے بھی ایک زمانے میں رائج تھے.

سب سے قدیم آقچہ سلاجقۂ رُوم کے درہم کے نمونے پر ڈھالا گیا تھا۔ اس پر جو عبارت کندہ تھی وہ بدلتی رہی، اگرچہ بیش تر الفاظ یکساں رہے۔ محمّد ثانی کے عہد میں پہلی بار ان الفاظ کو یک جا کر کے کندہ کیا گیا لیکن پھر بھی ان میں کچھ ردّ و بدل ہوتا رہا.

مآخذ: اسمٰعیل غالب: تَقْویمِ مسکوکاتِ عثمانیّہ، استانبول ۱۳۰۷ھ، مختلف مقامات پر؛ (۲) علی: ''عثمانلی امپراطورلُغُنْک اِلک سِکّہ سی''، *TOEM*، سال ۸، عدد ۴۸: ۳۶۰ ببعد؛ (۳) علی: فاتح زماننده آقچہ نہ اِیدی؟، *TOEM*، سال ۷، عدد ۴۹ و سال ۸، عدد ۶۲؛ (۴) [بستانی]: دائرۃ المعارف، ۴: ۸۶؛ (۵) خلیل ادہم: مسکوکاتِ عثمانیہ، استانبول ۱۳۳۴ھ، ص ۳ ببعد؛ (۶) اسمٰعیل حقّی اوزون چارشی لی: تاریخ لغت (زیرِ طبع)؛ (۷) راوندی: راحۃ الصّدور و آیۃ السّرور، لنڈن ۱۹۲۱ء، ص ۳۰۰ و ۴۹۰؛ (۸) باش وکالت آرشیوی، تصنیف امیری، عہدِ احمد ثالث، شمارہ ۱۴۲۴۰؛ (۹) وہی کتاب، تصنیف ابن الامین، خارجیّہ، ۱۳۲۹؛ (۱۰) السّید مصطفٰی نوری: نتائج الوقوعات، ۱: ۶۶، ۱۴۸؛ ۲: ۹۹ ببعد؛ ۳: ۱۰۶؛ (۱۱) جودت پاشا: تأریخ، ۱: ۲۵۴ ببعد؛ (۱۲) Belin: *Essai sur l' Histoire Economique de la Turquie*، در *JA*، سلسلہ ۶، ج ۳؛ (۱۳) S. Lane-Poole: *The Coins of The Turks in the British Museum.*

(مأخوذ از اسمٰعیل حقّی اوزون چارشی لی، در آآ، ترکی و H. BOWEN، در آآ، طبع دوم)

آقِینجِی: دولتِ عثمانی کی ابتدائی صدیوں میں بے قاعدہ سوار فوج، ✱ جو اصل میں یورپ میں استعمال کرنے کی غرض سے تیار کی گئی تھی اور وہیں اس کی چھاؤنیاں تھیں۔ یہ نام اسمِ فعل 'آقِین' سے بنا ہے (مصدر آقمق = بہنا یا گرایا جانا یا انڈیلا جانا)، جس کے معنی ہیں: ''غَزوَہ، دشمن کے علاقے پر ناگہانی حملہ'' [سَیل کی سی تندی سے دشمن پر جا پڑنا]۔ ''آقِینجِی کا نام ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو دشمن کے علاقے میں 'آقین' سرانجام دیتے ہیں، اس غرض سے کہ وضعِ دشمن کے متعلّق اطلاعات حاصل کریں یا اس کے علاقے میں لوٹ مار کریں یا اس میں تباہی و بربادی پھیلائیں'' (M. Zeki Pakalîn: *Osmanlî tarih deyimleri ve terimleri sözlüğü*، استانبول ۱۹۴۶ء، ۱: ۳۶)۔ اس کی بہترین کیفیّت محمّد ثانی کے خازِن G. M. Angiolello نے اوزون حسن (۱۴۷۳ء) کے خلاف فوجی مہمّ کے چشم دید حالات میں بیان کی ہے (ترجمہ Charles Grey): ''پانچ لشکروں کے علاوہ، جن کا ذکر ہم کر چکے ہیں، Aganzi [آقِینجِی] کا بھی ایک لشکر تھا، جنھیں اس مالِ غنیمت کے سوا جو وہ اپنی قزّاقانہ جنگ آرائی میں حاصل کریں کوئی تنخواہ نہیں دی جاتی۔ یہ لوگ باقاعدہ فوج کے ساتھ پڑاؤ نہیں کرتے بلکہ گشت لگاتے، دشمن کے علاقے کو لوٹتے کھسوٹتے اور ہر طرف تاخت تاراج کرتے پھرتے ہیں۔ باوصف اس کے وہ دونوں لحاظ سے، یعنی مالِ غنیمت کی باہمی تقسیم اور اپنے بے باکانہ اقدامات میں، اندرونی طور پر بہت عمدہ ضبط و نظم رکھتے ہیں۔ اس لشکر کی جمعیّت تیس ہزار اعلٰی درجے کے شہ سواروں پر مشتمل تھی.....''.

روایات کی رو سے ان امدادی افواج کی تشکیل جن میں آناطولی کے ترکمان قبائل کے دستے بھرتی ہوتے تھے سلجوقیوں کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ اگرچہ فی الواقع اُس لڑائی کے متعلّق صحیح معلومات موجود نہیں ہیں جو تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں اِرطُغرل (Ertoghrul)، جس کے آقینجی حامی تھے، اور بوزنطی تاتاریوں کے مابین بُروسَہ کے میدان میں ہوئی۔ تاہم اغلب معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت درست ہے۔ 'آقِین' کی اصطلاح بحری مہمّوں کے متعلّق بھی مستعمل ہے۔ انوری (طبع یِنانچ M. H. Yinanç، استانبول ۱۹۲۸ء، ص ۲۴) ایک ''آقِین'' کا ذکر کرتا ہے جو ۳۵ جہازوں کے ساتھ آبنائے باسفورس (Bosphorus) کے سواحل پر کی گئی تھی۔ نشری کے ہاں ''آقِین جی قاضی لَری''، یعنی اس فوج کے قاضیوں کا نام آیا ہے، جب ترک بتدریج شمالی بلقان

میں در آئے تو بے قاعدہ فوج کے یہ دستے باموقع جنگی اور خوب محفوظ مقامات میں جم گئے۔ بایزید اوّل نے وِدِین (Vidin) کے فیروز بک کو اَفْلاق (Wallachia) میں 'آقین' کرنے کا حکم دیا اور ترک (آقِینْجِی) ۱۳۹۱ء میں پہلی مرتبہ دریاے ڈینیوب [ترکی: طونہ] کے شمال کے علاقے میں بڑھے۔ بعد میں ان کی تعداد چالیس سے پچاس ہزار سواروں تک پہنچ گئی۔ ان کی قیادت وہ سردار (بک Bey) کرتے تھے جو عملاً اپنی اپنی جگہ موروثی رئیس بن گئے تھے: اِوْرِنُوس اوغول لَرِی (اوْرِنوس بک [رکّ بآن] کے اولاد و احفاد شمال مغرب کے علاقوں گُومُولْجِنَہ (Gümüldjina)، سِیرِیز (Serez)، اِشْقُوْدُرَہ (Ishkodra) میں؛ مِیخال اوغول لَرِی یعنی کوسہ مِیخال [رکّ بآن] (Köse Mīkhāl) کے اخلاف جو، پالائی لوگی (Palaeologi) خاندان کا ایک یونانی نومسلم تھا، (صربیا، ہنگری میں)، طورخان اوغول لری یعنی طور خان زادے سِمِدِرِیُوْ، سِمِنْدِرِہ، (Smederevo-Semendire)، یونان، اِفْلاق (Wallachia) اور وینس کے علاقے کی سمت میں)؛ مَلْکُوْچ اوغول لَری یعنی مَلْکُوِچ زادے، جو اصلاً بوسنہ کے تھے، جہاں وہ مَلْکُوِچ (Malkovitch) کہلاتے تھے، (ہنگری، اِفْلاق، بُغْدان = مَولدیویا (Moldavia) اور پولینڈ [لَہِستان] میں) اور قاسم اوغول لری یعنی قاسم زادے (وِی اِنّا)، ۱۵۲۹ء میں.

سولھویں صدی کے اواخر میں آقِینْجی اپنا پہلا سا طعن و ضرب کا زور اور اپنی وقعت اور اہمیّت کسی قدر کھو بیٹھے۔ ۱۵۹۵ء میں اِفْلاق (Wallachia) کے وِیْتِیا زُول (Mihai Viteazul) کے خلاف وزیراعظم خوجہ سِنان پاشا کی بدبختانہ جنگی مہمّ کے دوران میں اُن کا قریب قریب استیصال ہو گیا: دریاے ڈینیوب کے کنارے قورقو (Yerköyü ; Giurgiu) پر وہ رومانیا کے علاقے میں رہ گئے تھے، جہاں ''آقینجیوں کی جڑ کاٹ دی گئی اور وہ پژمردہ ہوتے چلے گئے''۔ ۱۶۰۴ء میں پھر ایک دفعہ سلطان احمد اوّل نے علی بک مِیخال اوغلو کے نام ہنگری کے خلاف مہمّ میں شریک ہونے کا حکم جاری کیا، لیکن اب آقینجیوں نے جلد ہی اپنے آپ کو جنگ کے جدید طریقوں کے مطابق ڈھال لیا۔ وہ توپچی، اسلحہ ساز اور گاڑیاں چلانے والے بن گئے اور مطالبہ کیا کہ ان کے نام باقاعدہ فوج کے دفتر میں درج کیے جائیں اور انھیں باقاعدہ تنخواہ دی جائے۔ سلطنتِ عثمانیہ کے عہدِ زوال کے ماہرِ اعداد و شمار کوْچی بک (Koči Bey) نے اپنے رسالہ (طبع وِفیق پاشا (A. Wefik Pasha)، لنڈن ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۲ء، ص ۱۷) میں، جو ۱۶۳۰ء میں لکھا گیا تھا، بیان کیا ہے کہ آقینجی معاونی دستے (''آقِین جی طائفہ سی'') فوج کے تنخواہ دار دستے یا باقاعدہ سپاہی بن گئے تھے یا انھوں نے آقینجی گری کو خیرباد کہہ دیا تھا (aḳi̊ndji̊ighi̊ inkār idüb) اور بمشکل ۲,۰۰۰ آقینجی باقی رہ گئے تھے، پھر باقاعدہ عثمانی فوج کی بڑی جمعیّت میں ان کا مستقل وجود باقی نہ رہا اور وہ اُسی میں جذب ہو گئے.

مآخذ: (۱) محمد زکی: *Aḳi̊nlar we-aḳi̊ndji̊lar*، در *TOEM*، ۸:۲۸۶ ببعد؛ (۲) احمد رفیق: *Türk aḳi̊ndji̊lari̊*، استانبول ۱۹۳۳ء؛ (۳) N. Iorga: *Notes et extraits pour servir à l'histoire des croisades au XV^{e} siècle*، ۵، بُخارِسٹ ۱۹۱۵ء، ص ۳۳۹؛ (۴) Giovan Maria Angiolello: *A short narrative of the Life and Acts of the King Ussun Cassano*، در Hakluyt coll: *A narrative of Italian travels in Persia, in the fifteenth and sixteenth centuries*، لنڈن ۱۸۷۳ء، ص ۸۰؛ (۵) I. H. Uzunçarşi̊li̊: *Osmanli̊ devleti teskilâti̊na medhal*، استانبول ۱۹۴۱ء، ص ۲۵۰؛ (۶) احمد جواد پاشا: تأریخ عسکری ـ یی عثمانی، کتابِ اوّل: یکی چری لر، استانبول ۱۲۹۷ھ، ۱: ۴ اور فرانسیسی متن، ص ۱۹؛ (۷) Friedrich Giese: *Die altosmanischen anonymen Chroniken in Text und Übersetzung*، بِرِسلاؤ ۱۹۲۲ء، ۱: ۲۸؛ (۸) تأریخ نَعِیما، استانبول ۱۱۴۷ھ، ۱: ۶۸؛ (۹) Zinkeisen، ۳: ۱۸۵-۱۸۸؛ (۱۰) A. Decei: *L'expédition de Mircea cel Bătrân contre les aki̊nci̊ de Karinovasi̊* (۱۳۹۳ھ)، در *Revue des Études Roumaines*، پیرس، ۱ (۱۹۵۳ء).

(A. DECEI)

----

* **آگُدَال:** (بربری)، ایک اصطلاح، جو مَرّاکُش، الجزائر اور تونس کے عربوں نے بربروں سے مستعار لی ہے اور انھیں معنوں میں استعمال کی جاتی ہے جن میں یہ بربری زبان میں استعمال کی جاتی ہے، یعنی ''حِمٰی ایسی چراگاہ جو مالکِ زمین نے محض اپنے استعمال کے لیے مخصوص کر لی ہو''۔ لیکن مَرّاکُش میں اس لفظ کا ایک خاص مفہوم ہو گیا ہے یعنی چراگاہوں کا وہ وسیع خطّہ جس کے چاروں طرف بلند دیواریں ہوں اور جو سلطان کے محلّ سے ملحق ہو اور محض اس کی سوار فوج اور مویشیوں کے استعمال کے لیے مخصوص ہو۔ ایسے احاطے فاس، مِکْناسہ، رباط اور مَرّاکُش کے بادشاہی شہروں میں سے ہر ایک میں موجود ہیں.

(G. S. COLIN)

⊗ **آگرہ** (شہر): اُتّر پَرْدیش (بھارت) کا ایک شہر اور اس نام کی قسمت اور ضلع کا صدر مقام۔ یہ شہر دریاے جمنا کے کنارے °۲۷-′۱ ارض بلد شمالی اور °۷۷-′۵۹ طول بلد مشرقی پر واقع ہے۔ آبادی (۱۹۵۱ء میں) ۳,۷۵,۶۶۵ جس میں ۱۵ء۶ فی صد مسلمان ہیں [مگر سپیٹ (Spate)، ص ۱۱۱ میں زن و مرد کی جو تعداد دی ہے اس کی میزان ۵,۱۵,۰۰۰ ہے]۔ یہ شہر طویل مدّت تک شاہانِ مغلیہ کا مستقرّ رہا اور مغلیہ عہد کے لیے شاندار اور یادگار عمارات کی خصوصیّت سے مشہور ہے.

تاریخ: آگرے کی ابتدائی تاریخ کے متعلّق معلومات بہت کم ہیں، تاہم

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس شہر کی بنیاد ہندوستان پر مسلمانوں کے حملوں سے بہت پہلے رکھی گئی تھی [ضلع آگرہ کے شمالی اور غربی حصے سے کچھ سکّے ۱۸۶۹ء میں دست یاب ہوے تھے جو ہندوؤں کے زمانے کا پتا دیتے ہیں (رپورٹ محکمۂ آثارِ قدیمہ، طبع ۱۸۷۴ء، ۴:۹۷)]۔ اس شہر کے قدیم قلعے کا حوالہ سب سے پہلے ایک قصیدے میں ملتا ہے جو مسعود بن سعد بن سَلمان شاعر (م ۵۱۵ھ/ ۱۱۲۱ء یا ۵۲۶ھ/ ۱۱۳۱ء) نے غزنوی شہزادے (سیف الدولہ) محمود بن ابراہیم کی مدح میں لکھا تھا [دیوان مسعودِ سعدِ سَلمان، بتصحیح یاسمی، تہران ۱۸ ۱۳ ش، ص ۲۶۲ بعد و ۳۰۷ بعد]۔ اس قصیدے میں (شہزادے کے غزنین سے ہندوستان کو لشکر لے جانے اور موسمِ بہار میں) قلعۂ آگرہ کی [جو آہن و سنگ سے بنایا گیا تھا۔ دیوان، ص ۳۰۷] تسخیر کا ذکر کیا ہے (جو غالبًا سلطان مسعود ثالث، ۴۹۳-۵۰۸ھ/ ۱۰۹۹-۱۱۱۵ء کے [یا سلطان ابراہیم بن مسعود اوّل، ۴۵۰-۴۹۲ھ(؟) کے؟] عہد کا واقعہ ہے (دیکھیے دیوانِ مسعود، ص یب]۔ اس شہر کے حکمران راجپوت تھے [مسعودِ سعد نے ذکر کیا ہے کہ جس راجہ سے قلعہ چھینا گیا تھا اُس کا نام جے پال تھا]۔ راجپوتوں نے جب سلطنتِ دہلی کی اطاعت قبول کر لی تو انھیں ولایتِ بیانیہ کے والی کی عام اختیارداری کے تحت شہر پر اپنا اقتدار بحال رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ ازاں بعد لودھیوں کے زمانے تک اس علاقے کا کوئی ذکر نہیں آتا؛ سکندر لودھی (۸۹۴-۹۲۳ھ/ ۱۴۸۹-۱۵۱۷ء) نے شہر آگرہ کو ۹۱۱ھ/ ۱۵۰۵ء میں ازسرِ نو تعمیر کرا کے اسے سلاطینِ ہند کا دارالحکومت بنایا [ایلیٹ، ۵:۹۹]۔ اس شہر نے بہت جلد اہمیّت حاصل کر لی اور دنیاے اسلام کے بہت سے حصّوں سے اربابِ علم و فضل یہاں آ کر جمع ہونے لگے۔ چونکہ وہ راستے جو جانبِ جنوب گوالیار اور مالوے کو، جانبِ غرب راجپوتانے کو، جانبِ شمال مغرب دہلی اور پنجاب کو اور جانبِ مشرق وادیِ گنگا کو جاتے تھے اس شہر سے گزرتے تھے اس لیے وہ جنگی اور تجارتی لحاظ سے ایک اہمّ مرکز بن گیا۔ ابراہیم لودھی کے عہد (۹۲۳-۹۳۲ھ/ ۱۵۱۷-۱۵۲۶ء) میں بھی یہ اُس کا دارالحکومت رہا مگر جب اُس نے ۹۳۲ھ/ ۱۵۲۶ء میں شکست کھائی تو بابر کا پایۂ تخت بن گیا۔ بابر نے اس میں اپنا چار باغ اور محلّ تعمیر کرانے کے علاوہ اس میں اَور بہت سے باغ لگوائے اور متعدّد حمّام بنوائے۔ اس کے امرا نے اُس کی تقلید کی اور پرانے شہر کا خاصا بڑا حصّہ منہدم کرا دیا۔ آگرہ ہمایوں اور شیر شاہ کا دارالحکومت بھی بنا رہا، لیکن نہ تو ہمایوں اور شیر شاہ اور نہ اس کے جانشین اس شہر میں اپنا زیادہ وقت صرف کر سکّے۔ یہ شہر اکبر کے تیسرے سالِ جلوسی (۹۶۵ھ/ ۱۵۵۸ء) میں پھر دارالحکومت بنا، جب کہ اکبر نے اس کے قلعے میں، جو پہلے بادل گڑھ کہلاتا تھا، سکونت اختیار کر لی اور اس کے امرا نے دریا کے دونوں کناروں پر اپنے مکانات تعمیر کرا لیے۔ [اس زمانے میں اس شہر کا نام اکبرآباد رکھا گیا۔ تواریخ آگرہ، ص ۶]۔ ۹۷۲ھ/ ۱۵۶۵ء میں بادل گڑھ کی جاے وقوع پر نئے قلعے کی تعمیر کا کام شروع کرایا گیا، لیکن ابھی یہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا تھا کہ فتح پور سیکری [رکّ باں]

کی تعمیر شروع کر دی گی۔ ۹۸۲ھ/ ۱۵۷۴ء سے لے کر ۹۹۴ھ/ ۱۵۸۶ء تک اکبر زیادہ تر اس نئے شہر [فتح پور سیکری] میں رہا اور ازاں بعد ۱۰۰۶ھ/ ۱۵۹۸ء تک اُس کا صدر مستقرّ عام طور پر لاہور رہا۔ ۱۰۰۶ھ میں اکبر آگرے واپس آ گیا۔ [دورِ اکبری میں بعض یورپی سیّاح آگرے میں آئے، مثلاً ایک پرتگالی (۱۵۷۸ء میں)، ایک یونانی (۱۵۹۰ء میں) اور جان مِلڈَن ہال John Mildenhall (انگریز، ۱۶۰۳ء میں)]۔ ۱۰۱۴ھ/ ۱۶۰۵ء میں اکبر کی وفات پر جہانگیر اسی شہر میں تخت پر بیٹھا اور ۱۰۱۶ھ/ ۱۶۰۷ء سے ۱۰۲۲ھ/ ۱۶۱۳ء تک تقریبًا مسلسل یہیں رہا۔ اس کے بعد اس نے ۱۰۲۷ھ/ ۱۶۱۸ء میں ایک سال اَور آگرے میں گزارا، لیکن بعد ازاں اپنے انتقال کے وقت (۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۸ء) تک اس کا قیام زیادہ تر کشمیر اور لاہور میں رہا۔ [عہدِ جہانگیری میں بھی غیر ملکی تاجر اور سیّاح آگرے میں آتے رہے۔ ۱۶۰۸ء میں کیپٹن ہاکنز (Hawkins)، شاہ جیمز اوّل کا خط لے کر جہانگیر کے دربار میں آیا۔ ۱۶۱۳ء میں ٹامس کیرِج (Thomas Keridge) اور رابرٹ شائرلے (Shirley) آگرے پہنچے۔ ۱۶۱۴ء میں آگرے میں انگریزی فیکٹری قائم ہوئی۔ ان کے علاوہ سر ٹامس رو (Roe)، فنچ (Finch)، ٹامس ہربرٹ اور ٹامس کوریاٹ Thomas Coryat) بھی آگرے آئے تھے (ڈسٹرکٹ گزیٹیر، ص ۱۵۳ بعد)]۔ اپنے باپ کی طرح شاہجہان بھی آگرے ہی میں تخت نشیں ہوا [عبدالحمید لاہوری، ۱:۲۵۲]۔ لیکن اگلے سال اُسے دکن جانا پڑا۔ ۱۰۴۰ھ/ ۱۶۳۱ء سے ۱۰۴۲ھ/ ۱۶۳۳ء تک شاہجہان پھر آگرے میں رہا، لیکن اس کے بعد وہ کبھی زیادہ دیر تک اس شہر میں نہیں ٹھیرا، صرف کبھی کبھار مختصر سے قیام کے لیے یہاں آتا رہا۔ اور زیادہ تر دہلی میں رہا، جہاں اس نے شاہجہان آباد کا نیا شہر بسایا [سکسینہ نے *Shah Jahan* میں لکھا ہے کہ ۲۷ مارچ ۱۶۴۸ء کو شاہجہان نے آگرے کے بجاے شاہجہان آباد (دہلی) کو اپنا دارالحکومت بنایا؛ افتتاح کی تقریب ۱۸ اپریل ۱۶۴۸ء کو ہوئی (وہی کتاب، ص ۳۱۷ بعد)]۔ ۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۷ء میں شاہجہان سخت بیمار پڑا تو اس کا بڑا بیٹا داراشکوہ اسے آگرے لے آیا۔ جانشینی کی جنگ میں، جو اُسی وقت چھڑ گئی، اورنگ زیب نے فتح پائی اور ۱۰۶۸ھ/ ۱۶۵۸ء میں وہ تخت نشین ہوا۔ شاہجہان کو قلعۂ آگرہ میں نظر بند کر دیا گیا، جہاں اُس نے ۱۰۷۶ھ/ ۱۶۶۶ء میں وفات پائی۔ یہ اطّلاع پا کر اورنگ زیب آگرے کو لوٹا اور کچھ عرصے تک اس کا دربار یہیں رہا۔ بعد ازاں اُس نے پھر (۱۰۷۹ھ/ ۱۶۶۹ء سے ۱۰۸۱ھ/ ۱۶۷۱ء تک) آگرے میں قیام کیا۔ تاہم اورنگ زیب کی سکونت عمومًا پہلے تو دہلی اور اس کے بعد دکن میں رہی۔ سترھویں صدی عیسوی میں اگرچہ دربارِ شاہی زیادہ عرصے تک مسلسل آگرے میں نہیں رہا تاہم اس شہر کو سلطنت کے صدر مقاموں میں شمار کیا جاتا تھا۔ یورپ کے جن سیّاحوں نے اس زمانے میں ہندوستان کی سیّاحت کی ان میں سے زیادہ تر اس شہر کو اُن بڑے بڑے شہروں میں شمار کرتے ہیں جو انھوں نے دیکھے تھے اور جس کا

مقابلہ وسعت میں پیرس، لنڈن اور قُسطُنطِینِیہ سے کیا جا سکتا تھا۔ یہ شہر تجارت اور کاروبار کا مرکز تھا اور پارچہ بافی، سونے پر جڑاؤ کام، پتھّر اور سنگِ مرمر کے کام اور بلّور کے لیے مشہور تھا، تاہم جب شاہی دربار دوسری جگہ چلا جاتا تو اس کی آبادی اور تجارت میں بہت کمی واقع ہو جاتی تھی.

اورنگ زیب کے جانشین زیادہ تر دہلی میں رہے، اگرچہ آگرے کی سیاسی اہمیّت قائم رہی۔ اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں اس شہر کو جاٹوں [رتّ بان]، مرہٹوں اور روہیلوں کی تاخت و تاراج سے بہت نقصان پہنچا۔ [۱۷۹۲ء تک آگرے پر مرہٹوں کا ولندیزی فوج دار کرنل جان ہیسنگ (Col. John Hessing) حکمران تھا۔ اس کا مقبرہ آگرے کے رومن کیتھولک قبرستان میں ہے (ڈسٹرکٹ گزیٹیر، ص ۱۶۵)]۔ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے اس کا الحاق کر لیا؛ اُس وقت تک گو اس شہر پر مغل بادشاہوں کی براے نام حکومت قائم رہی، مگر ۱۷۷۴ سے ۱۷۸۵ء تک کے عرصے کے سوا، جب کہ نجف خان (م ۱۷۸۲ء) اور اس کے جانشین یہاں کے والی تھے، آگرے پر جاٹوں نے ۱۷۶۱ سے لے کر ۱۷۷۰ء تک اور ازاں بعد ۱۷۷۳ تا ۱۷۷۴ء میں اور مرہٹوں نے ۱۷۵۸ سے لے کر ۱۷۶۱ء تک، ۱۷۷۰ سے ۱۷۷۳ء تک اور ۱۷۸۵ سے ۱۸۰۳ء تک قبضہ جمائے رکھا۔ [انگریزی عمل داری میں آنے کے بعد ۱۸۳۳ء میں لیفٹیننٹ گورنر کے ماتحت شمال مغربی صوبہ قائم ہوا اور مسٹر مٹکاف (بعد میں لارڈ مٹکاف) لیفٹیننٹ گورنر مقرّر ہوا۔ صوبے کا مرکز آگرہ تھا۔ ۱۸۳۸ء میں لارڈ آک لینڈ نے آگرے کا نظم و نسق خود سنبھال لیا۔ لارڈ ایلن برا بھی صوبے کی دیکھ بھال خود کرتا رہا (ڈسٹرکٹ گزیٹیر، ص ۱۷۰)۔ ۱۸۵۷ء میں ۳۰ مئی تک آگرے میں امن رہا، لیکن قلعے کے قرب و جوار اور چھاؤنی میں بہت سے مکانات مخالفین نے نذرِ آتش کر دیے (پنڈت کنہیّا لال: تاریخِ بغاوتِ ہند ۱۸۵۷ء، ص ۲۵۳، ۴ ببعد)].

تجارتی مرکز: [آگرہ تجارت کے لیے ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ پرانا تجارتی راستہ، جو گجرات کی خلیج سے الٰہ آباد، پاٹلی پتر، سانچی اور بھڑوچ تک جاتا تھا، آگرے سے ہو کر گزرتا تھا۔ انگریز، پرتگالی اور ڈچ تاجر یہی راستہ استعمال کرتے تھے (سپیٹ، ص ۱۵۰)].

آثارِ قدیمہ: [(۱) آگرے کی غیر مشہور عمارات میں سے سکندر لودھی کی بارہ دری ہے، جو ۱۴۹۵ء میں تعمیر ہوئی تھی (ڈسٹرکٹ گزیٹیر صوبہ جات متحدہ (انگریزی)، ص ۱۴۲؛ سمتھ (E. W. Smith): *Akbar's Tomb*، الٰہ آباد ۱۹۰۹ء، ص ۱).

(۲) بابر نے جمنا کے کنارے ایک باغ تعمیر کیا تھا، جس کا نام چار باغ (گل افشان) تھا۔ بابر اسی باغ کے محلّ میں ۱۵۳۰ء میں فوت ہوا تھا (لطیف، ص ۱۲ ببعد).

[(۳)] قلعہ: اوپر مذکور ہوا کہ آگرے کا موجودہ قلعہ اکبر نے، لودھیوں کے قلعۂ بادل گڑھ کی جگہ، دریاے یَمُنا [جمنا] کے دائیں کنارے پر تعمیر کرایا تھا۔ یہ قلعہ آٹھ سال کے عرصے میں (۹۷۲-۹۸۰ھ/ ۱۵۶۵-۱۵۷۳ء) پینتیس لاکھ روپے کے خرچ سے محمد قاسم خان میر بحر کی نگرانی میں تعمیر ہوا۔ قلعہ بے قاعدہ سے نصف دائرے کی شکل میں ہے، جس کا وتر دریا کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہے۔ قلعے کے گرد دوہری فصیل بنی ہوئی ہے، جس میں بندوقوں کے لیے سوراخ رکھے گئے ہیں۔ دونوں فصیلوں کا درمیانی فاصلہ چالیس فٹ ہے۔ بیرونی فصیل کا دَور، جو ستر فٹ سے کچھ ہی کم اونچی ہے اور جس کی رُوکار سنگِ سرخ کی ہے، ڈیڑھ میل ہے۔ یہ فصیل اتنے بڑے پیمانے پر سنگِ تراشیدہ کے کام کا پہلا نمونہ پیش کرتی ہے۔ اس کا صدر دروازہ، یعنی دہلی دروازہ، ہندوستان کے نہایت شاندار دروازوں میں سے ہے۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق اکبر نے قلعے کے اندر سنگِ سرخ کی پانچ سو سے زائد عمارتیں بنگال اور گجرات کی عمدہ طرز کے مطابق بنوائی تھیں، ان میں سے بیش تر عمارتیں شاہجہان نے منہدم کرا دیں، تاکہ ان کی جگہ خود سنگِ مرمر کی عمارتیں بنوائے۔ ان عمارتوں میں سے، جو اب تک موجود ہیں، اکبری محلّ اور بنگالی محلّ سب سے پرانے ہیں۔ عہدِ اکبری کی عمارتوں کی خصوصیّت یہ ہے کہ ان میں تراشیدہ پتھر کی دیوارگیریاں (brackets) ہیں، جن کے اوپر پتّھر کی سردلیں (beams) رکھی ہیں۔ ان کی اُولتیاں فراخ اور چھتیں سپاٹ ہیں اور محرابوں سے بہت کم کام لیا گیا ہے۔ جہانگیری محلّ بھی اسی وضع کا ہے۔ یہ محلّ دو منزلہ عمارت ہے، جس کا عرض اور طول علی الترتیب ۲۶۱ فٹ اور ۲۸۸ فٹ ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اسے اکبر نے شہزادۂ سلیم کے لیے (جو بعد میں جہانگیر کہلایا) تعمیر کرایا تھا، لیکن گمانِ غالب یہ ہے کہ اسے خود جہانگیر نے اپنے حرم کی راجپوت رانیوں کے لیے بنوایا تھا۔ کَنِنگھم (Cunningham) کا خیال ہے کہ یہ محلّ ابراہیم لودھی نے تعمیر کرایا تھا۔ شاہجہان کی تخت نشینی کے بعد طرزِ تعمیر میں زبردست تبدیلیاں آ گئیں۔ سنگِ مرمر کی کانوں کی دریافت کی بدولت سنگِ سرخ کا استعمال تقریباً ترک کر دیا گیا۔ بڑے پیمانے پر سنگِ مرمر کے استعمال نے منقوش یا منبّت خطوں اور اسلوب کے سیّال توازن (flowing- rhythm) کو ممکن بنا دیا۔ شہتیروں اور دیوارگیریوں کے بجاے ایسی محرابیں جو پتوں سے آراستہ یا اَنی دار (Foliated or Cusped) ہوں عام ہو گئیں۔ شاہجہان کی عمارتوں کی امتیازی خصوصیّت ان کے ہم سطح دندانہ دار محرابوں کے سلسلوں (arcades of engrailed arches) میں نظر آتی ہے۔ قلعے کے اندر کی عمارتوں میں سے اہم ترین عمارتیں یہ ہیں: خاص محلّ اور اس سے ملحقہ شمالی اور جنوبی ایوان؛ شیش محلّ نامی ایک حمّام، جس کی دیواروں اور چھتوں پر چونے گچ کے ابھرواں کام کے اندر غیر متناسب شکلوں کے چھوٹے چھوٹے آئینے جڑے ہوئے ہیں۔ مُثمّن برج، جو ممتاز محلّ [یا نور جہان؟] کے لیے تعمیر کرایا گیا تھا (اس کے اندر شاہجہان نے اپنی زندگی کے آخری لمحے گزارے)۔ دیوانِ خاص (جہاں بادشاہ اپنا دربارِ خاص کرتا تھا)؛ دیوانِ عام

(دربارِ عام کا ایوان)، جس کا صحن ۵۰۰ فٹ لمبا اور ۳۷۰ فٹ چوڑا ہے اور ستونوں والا دالان ۱۹۲ فٹ لمبا اور ۶۴ فٹ چوڑا ہے۔ دالان میں شہ نشین بنائی گئی ہے، جس پر سنگِ مرمر سے ترصیع کاری کی گئی ہے اور جہاں تختِ شاہی ہوتا تھا (یہ شہ نشین سنگِ سرخ کی ہے، جس پر سفید مرمر کی گچ کی لپائی ہے اور اس پر خوبصورت سنہری نقش و نگار بنائے گئے ہیں)۔ موتی مسجد، یہ سفید سنگِ مرمر کی ایک بڑی ہی شاندار عمارت ہے، جو سنگِ سرخ کی کرسی پر تعمیر کی گئی ہے [تین لاکھ روپے اس کی تعمیر میں صَرف ہوئے اور ۱۰۶۳ھ/ ۱۶۵۲ء میں بنی تھی۔ مسجد کا صحن بہت دل کش ہے، بیچ میں ایک حوض بھی ہے۔ ایک اَور مسجد بھی ہے جسے "محکمے کی مسجد" کہتے ہیں۔ قلعے کے ایک دروازے کے سامنے ترپولیہ ہے اور اس کے ایک جانب یہ وسیع مسجد بنی ہوئی ہے (تواریخ آگرہ، ص ۳۱ ببعد؛ لطیف، ص ۹۱)].

[۴] جامع مسجد: قلعے کے قریب ہی جامع مسجد ہے جسے شاہجہان کی بڑی بیٹی جہان آرا بیگم نے ۱۰۵۸ھ/ ۱۶۴۸ء میں تعمیر کرایا تھا۔ سنگِ سرخ کی اس عمارت میں تین گنبد اور پانچ نہایت خوبصورت اور متناسب محرابیں ہیں۔ بیچ کی محراب داخلے کی ہے، جو دُہرا مدخل ہے اور جس کے اوپر ایک نصف گنبد ہے [مسجد کا طول ۱۳۰ گز شاہی اور عرض ۱۰۰ گز ہے۔ صحنِ مسجد ۸۰ درعہ شاہی ہے (تواریخ آگرہ، ص ۳۲؛ لطیف، ص ۱۸۴)].

(۵) اکبر کا مقبرہ: آگرے سے تقریبًا پانچ میل دور اسکندرے کے مقام پر اکبر کا مقبرہ ہے، جو جہانگیر کے عہد میں اکبر کی اپنی منتخب کردہ جگہ پر تعمیر ہوا۔ یہ مقبرہ ایک خوبصورت باغ کے اندر واقع ہے۔ مقبرے کی ساخت کا کوئی نقشہ غالبًا خود اکبر نے طے کر دیا تھا، لیکن اس عمارت میں وہ صحت و درستی موجود نہیں جو اس شہنشاہ کی بنوائی ہوئی دوسری عمارتوں میں پائی جاتی ہے۔ عمارت ۳۴۰ فٹ مربع رقبے میں ہے۔ اس کے پانچ طبقے ہیں اور ہر اوپر کا طبقہ نیچے کے طبقے سے چھوٹا ہے۔ سب سے نیچے کی منزل میں محرابی دالان ہیں اور اس کے ہر پہلو کے وسط میں ایک بڑا ایوان ہے، جس میں بہت اندر کو بنا ہوا ایک محرابی دروازہ ہے۔ باقی تین منزلیں زیادہ تر سنگِ سرخ سے بنے ہوئے ستون دار تہ بہ تہ محرابی دالانوں اور کوشکوں پر مشتمل ہیں۔ سب سے اوپر کی منزل سفید سنگِ مرمر کی ہے، جس کے پردے کی دیواریں جالی کے کام سے بنائی گئی ہیں۔ اس منزل کے ہر گوشے کے اوپر ایک سبک سی بُرجی بنی ہوئی ہے۔

جہانگیر کے وزیر مرزا غیاث بیگ ملقب بہ اعتماد الدولہ (م ۱۶۲۲ء) کا مقبرہ، جو اس کی بیٹی ملکہ نور جہان نے تعمیر کرایا تھا اور ۱۶۲۸ء میں مکمل ہوا، دریا کے بائیں کنارے پر ایک خوش نما باغ میں واقع ہے۔ مقبرے کی پہلی منزل مربع شکل کی ہے، جس کا ہر پہلو ۶۹ فٹ ہے۔ اس کے ہر کونے پر کوتاہ قامت ہشت پہلو بُرج آگے کو نکلا ہوا بنایا گیا ہے، جو خوش نما اور متناسب ہے۔ دوسری منزل جالی کے کام والی دیواروں پر بنی ہوئی پتھر کی عمارت ہے، جس کی ڈاٹ کی چھت شامیانے کی سی ہے۔ اس کے چاروں طرف چوڑے اور نیچے کو جھکے ہوئے چھجے ہیں۔ اس منزل کے اوپر دو سنہری کلس ہیں۔ ہندوستان میں یہ سب سے پہلی بڑی عمارت ہے جو ساری کی ساری سنگِ مرمر سے بنائی گئی اور جو اپنی آرائش و زیبائش اور پرچین کاری کی طرز کی نقاشی (pietra dura) کی افراط کے باعث بڑی نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

[۶] تاج محل: آگرے کی سب سے زیادہ مشہور عمارت تاج محلّ ہے، یعنی وہ خوبصورت اور خوشنما مقبرہ جو شاہجہان نے اپنی پیاری اور چہیتی بیوی ارجمند بانو بیگم الملقب بہ ممتاز محلّ کے لیے تعمیر کرایا تھا، جسے اس زمانے کے لوگ عام طور پر 'تاج محلّ' کہا کرتے تھے..... [رکّ بہ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، ۴:۲۱ ببعد].

[آگرے کی دوسری قابلِ ذکر عمارات و آثار کے لیے دیکھیے (۱) تواریخ آگرہ؛ (۲) سیّد محمد لطیف: *Agra*؛ (۳) H. R. Nevill: *Agra, A Gazetteer*؛ (۴) *Archaeological Survey of India, Report for the year 1871-72*].

مآخذ: (۱) بابُر نامۂ (ترجمۂ بیورِیج Beveridge)، ج ۲؛ (۲) اکبر نامہ (Bib. Ind.)، خصوصًا ۲:۲۴۶-۲۴۷؛ (۳) علاء الدولہ قزوینی: نفائس المآثر (علی گڑھ یونیورسٹی کا مخطوطہ)، اوراق ۲۶۶ الف-۲۶۸ب؛ (۴) تُزُکِ جہانگیری (ترجمۂ روجرز Rogers و بیورِیج)، خصوصًا ۱:۳-۷، ۱۵۲؛ (۵) عبدالحمید لاہوری: پادشاہ نامہ (Bib. Ind. Series)، [کلکتہ ۱۸۶۷ء]، خصوصًا ۱/۱:۳۸۴، ۴۰۲ ببعد؛ ۱/۲: ۲۳۵-۲۴۱، خصوصًا ۲:۳۲۲-۳۳۱؛ (۶) محمد صالح: عملِ صالح (Bib. Ind.)، خصوصًا ۲:۳۸۰-۳۸۵؛ (۷) حالات تاج محلّ (علی گڑھ یونیورسٹی کا مخطوطہ)؛ (۸) De Laet: *The Empire of the Great Mogol*، بمبئی ۱۹۲۸ء، ص ۳۶-۴۴؛ (۹) *Tavernier's Travels in India*، (طبع V. Ball، ۱۸۸۹ء)، ۱:۱۰۵-۱۱۲؛ (۱۰) *Bernier's Travels*، لنڈن ۱۸۸۱ء، ص ۲۸۴-۲۹۹؛ (۱۱) *Indian Travels of Thevenot and Careri*، (طبع Sen، ۱۹۴۹ء)، ص ۴۶-۵۷؛ (۱۲) S. M. Latif: *Agra, Historical & Descriptive*، کلکتہ ۱۸۹۶ء؛ (۱۳) Duncan: *Keene's Hand Book for Visitors to Agra*، ۱۹۰۹ء؛ (۱۴) *Imperial Gazetteer of India*، (۱۹۰۵ء)؛ (۱۵) *Archaeological Survey of India - Report [for the year 1871-72]*، کلکتہ ۱۸۷۴ء، ص ۹۳-۲۴۷؛ ایضًا، برائے ۱۹۰۴-۱۹۰۵ء، ص ۱-۳؛ (۱۶) E. B. Havell: *A Hand-book to Agra and Taj*، ۱۹۱۲ء؛ (۱۷) J. Fergusson: *History of Indian and Eastern Architecture*، ۱۹۱۰ء؛ (۱۸) *Camb. History of India*، ج ۴، باب ۱۸؛ (۱۹) Havell: *Indian Architecture*، ۱۹۱۳ء؛ (۲۰) وہی مصنّف: *Ancient and Medieval Architecture of India*، ۱۹۱۳ء؛ (۲۱) E. W. Smith: *Akbar's Tomb at Sikandara (Arc-*

haeological Survey of India Vol.xxxv)، الٰہ آباد ۱۹۰۹ء؛ (۲۲) معین الدّین احمد: *The Taj and its Environments*، ۱۹۲۴ء؛ (۲۳) اشرف حسین: *An Historical Guide to the Agra Fort*، ۱۹۳۷ء؛ (۲۴) Stuart [C. M. Velliers]: *Gardens of the Great Mughals*، ۱۹۱۳ء؛ (۲۵) Hosten: *Who Planned the Taj*، در *Jour. As. Soc. Bengal*، جون ۱۹۱۰ء؛ (۲۶) V. Smith: *History of Fine Arts in India*، ص ۱۸۳-۱۸۵؛ (۲۷) مہدی حسین: *Agra Before the Mughals*، در *Jour. U.P. Hist. Soc*، ج ۲۰، حصّہ ۲: ص ۸۰-۸۷؛ (۲۸) سرکار: *Studies in Mughal India*، ۱۹۱۹ء، ص ۲۷-۳۲؛ [(۲۹) پنڈت کنہیا لال: تاریخ بغاوتِ ہند ۱۸۵۷ء، دسمبر ۱۹۱۶ء، ص ۲۵۰-۲۵۹؛ (۳۰) سدید الدّین خان: تواریخ آگرہ، اکبر آباد ۱۸۴۸ء، ص ۳۱ ببعد؛ (۳۱) یحیٰی بن احمد: تاریخِ مبارک شاہی، در ایلیٹ، ج ۴؛ (۳۲) نعمت اللہ: تاریخ خان جہان لودھی، در ایلیٹ، ج ۵؛ (۳۳) خافی خان: منتخب اللّباب، جلد دوم، کلکتہ ۱۸۷۴ء؛ (۳۴) خیر الدین: عبرت نامہ، قلمی، در کتاب خانۂ دانش گاہِ پنجاب، مجموعۂ شیرانی؛ (۳۵) مس محمودہ مشتاق: *European Travellors under Akbar and Jahangir*، مسوّدہ مقالہ در کتاب خانۂ دانش گاہِ پنجاب، لاہور (۱۹۶۱ء)؛ (۳۶) سپیٹ (O. H. K. Spate): *India and Pakistan*، لنڈن ۱۹۶۰ء؛ (۳۷) H. R. Nevill: *Agra, A Gazetteer Vol. VIII of the District Gazetteer of the United Provinces of Agra and Oudh*، الٰہ آباد ۱۹۰۵ء؛ (۳۸) سکسینہ: *Shah Jahan of Delhi*، الٰہ آباد ۱۹۵۸ء].

(نور الحسن - سیّد علی عباس)

⊗ **آگرہ** (ضلع): اُتّر پَردیش (بھارت) میں صوبۂ متحدۂ اودھ کے جنوب مغربی گوشے میں ۲۶ درجہ اور ۴۴ دقیقہ اور ۲۷ درجہ ۴۵ دقیقہ شمالی عرض بلد، اور ۷۷ درجہ اور ۲۶ دقیقہ اور ۷۸ درجہ ۳۲ دقیقہ مشرقی طول بلد کے درمیان واقع ہے۔ آگرے کی آٹھ تحصیلیں ہیں، اعتماد پور، فیروز پور، آگرہ، کرولی، فتح آباد، باہ، خیر گڑھ (ڈسٹرکٹ گزیٹیر، یو-پی، ۸: ۱)۔

(سیّد علی عباس)

---

* **آگہی**: ترک شاعر اور مؤرّخ، جو [استانبول میں] ۹۸۵ھ/۱۵۷۷ء میں فوت ہوا۔ اس کا اصلی نام منصور تھا۔ وہ ینیجۂ واردار (یعنی Giannitsa میں، جو یونانی مقدونیا میں ہے) میں پیدا ہوا، جو اس زمانے میں ایک اہم مرکزی مقام تھا۔ مدرّس اور قاضی کی حیثیّت سے اُسے مختلف مقامات میں جانا پڑا؛ اس کے سوانح نگاروں نے اس سلسلے میں گیلی پولی اور استانبول کا ذکر کیا ہے۔ آگہی شاعر کی حیثیّت سے خاصی وسیع شہرت کا مالک تھا، گو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا دیوانِ اشعار کبھی مرتّب نہ ہوا۔ اس کی شہرت خاص طور پر اس کے ایک قصیدے کی مرہونِ منّت ہے، جو اس نے اپنے محبوب (ایک نوجوان ملّاح) کی مدح میں لکھا تھا۔ اس قصیدے میں اس نے روزمرّہ کی وہ زبان استعمال کی ہے جو ان دنوں ترکی ملّاحوں میں رائج تھی۔ اس میں جہاز رانوں کی مشترکہ بولی (lingua franca) کی بہت سی اصطلاحیں بھی مستعار لی گئی ہیں، خاص کر وہ اصطلاحیں جو جنگی جہازوں (The galley) سے تعلق رکھتی ہیں۔ متعدّد معاصر شعرا نے بھی اس قصیدے کے نظیرے لکھے۔ آگہی کی تاریخی تالیفات میں سے صرف ایک تاریخ غزاتِ سِگِتوار کا نام معلوم ہے، جس میں سِگِتوار (Szigetvár) کے خلاف سلطان سُلیمان کی فوج کشی کی کیفیت بیان کی گئی تھی (دیکھیے بابِنگر Babinger، ص ۶۹) مگر اس کا کوئی مخطوطہ دریافت نہیں ہوا۔

مآخذ: (۱) آگہی کی زندگی کے حالات کے اہم مآخذ معاصر تذکرے ہیں جو عثمانی شعرا کے تراجم پر مشتمل ہیں (مثلاً تذکرۂ شعراء از عاشق چلبی، قِنالی زادہ حسن چلبی، ریاضی، عہدی، بیانی اور قاف زادہ فائضی اور عالی کی کُنہ الاخبار کے وہ حصّے جو تراجم پر مشتمل ہیں)۔ ان مآخذ میں سے کوئی ماخذ تا حال طبع نہیں ہوا مگر (۲) سعد الدّین نُزہت اِرگُون (Ergun): تورک شاعرلری، استانبول ۱۹۳۶ء، ۱: ۱۶-۱۸ میں آگہی کے ترجمے میں ان کے اقتباسات دیے گئے ہیں اور آگہی کی متعدّد نظمیں بھی درج ہیں۔ وہ قصیدہ جو ملّاحوں کی بولی میں ہے مع شرح A. Tietze: عَصِر تُرک شعرندہ گمِجی دِلِی، آگہی قصیدہ سی و تخمیسلری، تُرکیات مجموعہ سی، ۱۹۵۱ء، ص ۱۱۳-۱۲۱، میں شائع ہوا ہے (مع مزید مآخذ)۔

(A. TIETZE)

---

* **آل**: بطن، ایک نسبی گروہ، جس کا مقام 'اہل' یا 'عائلۃ' [رکّ بآن] (= خاندان) اور 'حیّ' یا 'قبیلۃ' [رکّ بہ (۱) قبائل؛ (۲) قبائلیت] کے درمیان ہے اور جو 'عشیرۃ' [رکّ بآن] کا ہم معنی ہے۔ اسی معنی میں یہ لفظ قرآن [مجید] کی تیسری سورہ، یعنی سورۂ آلِ عمران کے نام میں استعمال ہوا ہے۔ آلِ نبیؐ میں ہاشم اور المُطّلِب کی اولاد شامل ہے، لیکن اِدھر تو شیعیوں نے اس لفظ کا مفہوم اتنا محدود کر دیا کہ اس سے [آنحضرتؐ] کے صرف سب سے قریبی اَعِزّہ اور اخلاف مراد لیے [رکّ بہ اہل البیت] اور اُدھر اہلِ سنّت نے اسے اس قدر وسیع کر دیا کہ آپؐ کی تمام امّت کو اس میں شامل کر دیا (دیکھیے Lane: *Lexicon*، بذیلِ مادّہ)۔ بعد میں یہ لفظ کسی حکمران کے خاندان کے لیے استعمال ہونے لگا، مثلاً آلِ عثمان، یعنی خاندانِ عثمانی: آلِ بوسعید، یعنی عُمان اور زنجبار کے حکمرانوں کا خاندان؛ آلِ فیصل، آلِ سُعود، جو عرب کے سُعودی 'خاندان' کا سرکاری لقب ہے۔

(ادارۂ [آ، طبع دوم])

---

* **آل**: وہ خبیث روح جو عورتوں پر زچگی کے اثنا میں حملہ کرتی ہے۔ حُمّیٰ (تپ) نفاس کو گویا اس روح کی شکل میں مشخّص اور متمثّل کیا گیا ہے، قبّ ZDMG، ۱۸۸۲ء، ص ۸۵؛ گولٹ تسیہر (Goldziher): *Abh.zur arab. Philologie*، ۱: ۱۱۶؛ وِنکلر (H. A. Winkler): *Salomo und die Karina*، ص ۱۰۴ - ۱۰۷.

(A. Haffner ہفنر)

----

* **آل سراب**: رَکّ بہ سراب.

----

* **آلات**: رَکّ بہ آلہ.

----

* **آلاتی**: (عربی؛ منسوب بہ آلات) جمع: آلاتیہ = پیشہ ور سازندہ، جو سازنواز بھی ہو اور گویّا بھی، مگر (مصر میں) گانے والیوں کو "عالمہ" ('Al'meh) کہتے ہیں، قبّ لین (Lane): *Manners and Customs of the Modern Egyptians*، ۱۸۷۱ء، ۱: ۲۱۰، ۲: ۷۱.

(ادارۂ [آ]، طبع اوّل)

* **آلاجہ** (۱): [اَلاجہ] (ترکی؛ اصل میں تصغیر "آلا" = نقطہ نقطہ، رنگ برنگا) = کپڑا جس پر رنگ دار دھاریاں ہوں (قبّ Yule and Burnell: *Hobson-Jobson*، بذیل مادّۂ Alleja، ص [۱۳ و ۶۰۷]) [طبع ۱۹۰۳ء]۔ یہ لفظ مرکّب ناموں میں بھی استعمال ہوتا ہے، مثلاً [اَلاجہ بَیرَق (رنگ برنگا جھنڈا)]، آلاجہ طاغ، [اَلاجہ داغ] [رَکّ بآن] [= رنگ برنگا پہاڑ].

(ادارۂ [آ]، طبع دوم)

⊗ [**آلاجہ** (۲)]: [اَلاجہ] ولایتِ انقرہ میں سنجاق وقضای بوزغاد میں بوزغاد شہر سے تقریباً ۴۰ کیلو میٹر شمال میں ایک چھوٹا سا قصبہ، جس کے پاس بہت سے قدیمی آثار ہیں (دیکھیے قاموس الاعلام، ۱: ۲۷۷)].

----

* **آلاجہ حِصار**: [اَلاجہ حِصار] "رنگ برنگا قلعہ"، مغربی موراوہ (Morava) کی جنوبی سمت میں ایک شہر قُرُوشیوْاچ (Krushevats) [قاموس الاعلام: Krouchevatz] کا ترکی نام۔ یہ شہر شاہ لازار (Lazar) (جس نے ترکوں پر چڑھائی کرنے کے لیے یہاں فوجیں جمع کیں اور ۱۳۸۹ء میں قوصوہ (Kosovo) کی جنگ میں اپنی سلطنت سے ہاتھ دھو بیٹھا) اور اس کے بیٹے سٹیفن (Stephen) کے عہد میں صربیا کا صدر مقام تھا۔ ترکوں نے اس شہر پر ۱۴۲۸ء میں جارج بُرینکووِچ (George Brankovits) کی تخت نشینی کے بعد قبضہ کیا، جس نے سِمِنْدرہ (Semendria) [قاموس الاعلام، ص ۲۶۲۹] کو اپنا صدر مقام بنا لیا۔ صربیا کی جنگوں میں اس شہر نے اہم کردار ادا کیا اور محمد ثانی نے اس جگہ توپیں ڈھالنے کا کارخانہ قائم کیا۔ آلاجہ حِصار، روم ایلی [رَکّ بآن] کی ایالت میں ایک سنجاق کا صدر مقام تھا۔ مجاروں (آسٹریا والوں) نے ۱۷۳۷ء میں تھوڑے سے عرصے کے لیے اس شہر پر قبضہ کر لیا۔ دوسری بار وہ اس پر ۱۷۸۹ء سے لے کر ۱۷۹۱ء تک قابض رہے۔ ۱۷۹۱ء میں معاہدۂ سستووو (Sistovo) کی رو سے یہ شہر ترکیہ کو واپس مل گیا۔ ۱۸۰۶ء سے ۱۸۱۳ء تک اس شہر پر قرہ جارج (Ḳara George) کے باغیوں نے قبضہ جمائے رکھا۔ ۱۸۳۳ء میں اسے "چھے اضلاع" میں سے ایک کے طور پر صربیہ کی خود مختار ریاست کے حوالے کر دیا گیا (قبّ G. Gravier: *Les frontières historiques de la Serbie*، پیرس ۱۹۱۹ء، ص ۶۷ ببعد)، تاہم مٹھی بھر قلعہ نشین فوج نے ہتھیار تب ڈالے جب انھیں فاقوں سے نڈھال کر دیا گیا.

مآخذ: (۱) C. Jireček: *Staat u. Gesellschaft im mittelalt. Serbien*، ج ۴ (طبع Denkschr. Ak. Wien، ۱۹۱۹ء)، اشاریہ؛ (۲) وہی مصنّف: *Gesch. d. Serben*، گوتھا ۱۹۱۸ء، ص ۱۸۶، ۱۹۱، ۲۰۲، ۲۱۲؛ (۳) B. de la Broquière: *Voyage d' Outremere*، طبع شیفر (Schéfer)، ص ۲۰۵؛ (۴) بابنگر F. Babinger: *Mehmed der Eroberer*، ص ۱۴۶، ۱۶۵، ۳۸۵؛ (۵) اِوْلیاء چلبی: ۵: ۵۸۴؛ (۶) حاجی خلیفہ (ترجمۂ ہامر J. Hammer): *Rumeli und Bosna*، ص ۱۴۶؛ (۷) A. Boué: *Turquie d' Europe*، پیرس ۱۸۴۰ء، ۲: ۲۵، ۳۹۵؛ ۳: ۲۰۳ - ۲۰۴، ۲۶۷؛ ۴: ۲۸۷؛ (۸) وہی مصنّف: *Recueil d' Itinéraires danela Turquie d' Europe*، وی آنا ۱۸۵۴ء، ۱: ۱۷۶ ببعد؛ (۹) R. M. Ilič: *Kruševac*، ۱۹۰۸ء.

(S. M. Stern شٹرن)

----

* **آلاجہ طاغ** Aladja Dagh: [اَلاجہ داغ] "مختلف رنگوں کا پہاڑ"، یہ نام ترکی بولنے والے ملکوں میں پہاڑوں کے لیے اکثر استعمال ہوتا ہے؛ مثلاً یہ:

(۱) قونیہ کے جنوب مغرب میں ایک پہاڑ کا نام ہے؛

(۲) قارص [جغرافیہ دانانِ عرب کے قَرص] کے جنوب مشرقی حصّے میں ایک پہاڑ کا نام ہے، جس سے قرہ طاغ کی ایک شاخ متشکّل ہوتی ہے۔ اس کے قریب روسیوں نے ۱۶/۱۵ اکتوبر ۱۸۷۷ء میں ترکوں کو شکست دی.

(ادارۂ [آ]، طبع دوم)

----

* **آلا شہر** [اَلاشہر]: "رنگا رنگ یا رنگ برنگا شہر"۔ آناطولی کا ایک قصبہ، جو قُوزُو چای کے قریب بوز طاغ (قدیم نام تمولس Tmolus) کے دامن میں واقع ہے۔ زمانۂ قدیم میں اور بوزنطیوں کے عہد میں یہ قصبہ، جس کا قدیم نام اپنے

باَنی اَٹالُوس ثانی فِیلاڈِلفوس (Attalus II Philadelphus) کے نام پر فِیلاڈِلفِیا تھا، تاریخ میں اہم کردار ادا کرتا رہا (پاؤلی وِسّووا Pauly-Wissowa، بذیلِ مادّہ)۔ اس قصبے کو سلیمان بن قُتلُمُش نے فُریجیہ (Phrygia) کے دوسرے شہروں کے ساتھ ۱۰۷۵ یا ۱۰۷۶ء میں فتح کیا تھا، لیکن بوزنطیوں نے ۱۰۹۸ء میں اسے دوبارہ سر کرلیا اور سلاجقہ کے خلاف بوزنطیوں کے جنگی اقدامات کے لیے یہ اہم فوجی مستقر کا کام دیتا رہا۔ ابن بی بی (طبع ہُوتسما Houtsma، ص ۳۷) کے قول کے مطابق قیصر تھیوڈور لاسقاریس (Theodore Lascaris) اور سلجوقی سلطان کیخُسرو اوّل کے درمیان وہ جنگ اِسی قصبے کے قریب ہوئی تھی (۶۰۷ھ/ ۱۲۱۰ء)، جس میں کیخُسرو جان سے جاتا رہا تھا۔ (اس موقع پر پہلی مرتبہ اس قصبے کو آلاشہر کے نام سے یاد کیا گیا ہے) مگر بوزنطی مؤرّخوں سے اس بیان کی تائید نہیں ہوتی۔ گرِمیان اوغلو یعقوب اوّل نے ۱۳۰۴ء میں اس قصبے کا محاصرہ کیا لیکن قطالُونی (Catalan) اجیر سپاہیوں (mercenaries) نے اسے چُھڑا لیا۔ گرِمیاں اوغلو حکمرانوں کے پے در پے محاصروں (۱۳۰۷ء اور ۱۳۲۴ء) کی وجہ سے اس قصبے کو ناچار خراج ادا کرنا پڑا۔ بعد ازاں یہ خراج خاندان آیدِین اوغلو کے حکمرانوں کو ادا کیا جاتا رہا (اگرچہ دُستورنامۂ انوری کا یہ بیان کہ آیدِین اوغلو اُمور بیگ نے ۱۳۳۵ء میں اس شہر کو فی الواقع سر کرلیا تھا حقیقتِ حال کے مطابق نہیں معلوم ہوتا)۔ آلاشہر کو، جو ایشیاے کوچک کے آزاد یونانی شہروں میں سے آخری تھا، بایزید اوّل نے ۷۹۴ھ/ ۱۳۹۱ء میں سر کرلیا۔ لیکن یہ شہر ۱۴۰۲ء میں تیمور اور بعد ازاں جُنَید بیگ کے قبضے میں آگیا، تا آنکہ اِسے مراد ثانی کے عہد میں بالآخر سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کرلیا گیا۔ عہدِ عثمانی میں اس شہر کی سابقہ اہمیّت بحال نہ رہ سکی اور (ولایت آیدِین اور بعد میں 'ولایتِ مَنِیسہ (Manisa) میں صرف ایک 'قضا' کا صدر مقام رہ گیا۔ ۱۹۱۹ سے ۱۹۲۳ء تک یونانی اس پر قابض رہے۔ ۱۸۹۰ء میں یہاں سترہ ہزار مسلمان اور چار ہزار یونانی آباد تھے (کُوِینے Cuinet) لیکن ۱۹۴۵ء میں اس قصبے کی آبادی ۸,۸۸۳ شمار کی گئی تھی (یہ سب کے سب مسلمان تھے) اور 'قضا' (رقبہ ۱,۱۱۵ مربع کیلومیٹر) کی کُل آبادی ۴۵,۷۹۲ تھی.

مآخذ: (۱) Lebeau: *Histoire du Bas-empire*، پیرس ۱۸۳۳-۱۸۳۶ء، XV: ۳۵۷ بعد، ۴۲۶ بعد، ۴۴۶ بعد، ۴۴۷؛ XVI: ۶ بعد، ۱۸۴، ۲۸۵، ۳۳۱ بعد، ۴۱۲ بعد؛ XVII: ۲۵۳؛ XVIII: ۳؛ XIX: ۴۲ بعد، ۷۶، ۳۱۶؛ XX: ۴۶۰؛ (۲) Chalandon: *Alexis I. Comnène*، پیرس ۱۹۰۰ء، ص ۱۲، ۱۹۷، ۲۵۵، ۲۶۵؛ (۳) وہی مصنّف: *Jean II. Comnène et Manuel Comnène*، پیرس ۱۹۱۲ء، ص ۳۷، ۲۱۷، ۳۰۵ بعد، ۴۶۰، ۵۰۱، ۵۱۳؛ (۴) Moncada: *Expédition des Catalans*، (فرانسیسی ترجمہ، پیرس ۱۸۲۸ء)، ص ۷۳-۸۴؛ (۵) عاشق پاشا زادہ: تأریخ، استانبول ۱۳۳۲ھ، ص ۵۶، ۶۴ بعد؛ (۶) سعد الدّین: تاج التواریخ، استانبول ۱۲۷۹ھ، ۱: ۱۲۷؛ (۷) مُکرِمین خلیل: دُستور نامۂ انوری، استانبول ۱۹۲۹ء، مقدمہ، ص ۳۶ بعد؛ (۸) Cl. Huart: *Epigraphie arabe de l'Asie Mineure*، ص ۶۱؛ ۹ اوزون چارشی لی (I. H. Uzunçarşili): *Anadolu Beylikleri*، اَنقَرہ ۱۹۳۷ء، ص ۱۰، ۲۸، ۱۸۷ بعد؛ (۱۰) Ch. Texier: *Asie Mineure*، ص ۲۶۹ بعد؛ (۱۱) A. Wächter: *Der Verfall des Griechentums in Kleinasien im 14. Jahrhundert*، لائپزگ ۱۹۰۳ء، ص ۳۹ بعد؛ (۱۲) P. Wittek: *Das Fürstentum Mentesche*، استانبول ۱۹۳۴ء، ص ۷۸ بعد؛ (۱۳) W. J. Hamilton: *Researches in Asia Minor*، ۲: ۳۷۵؛ (۱۴) A. Philippson: *Reisen und Forschungen im westlichen Kleinasien*، ۴: ۳۱ بعد؛ (۱۵) کوینے (V. Cuinet): *La Turquie d' Asie*، ۳: ۵۷۱ بعد؛ (۱۶) زارے (F.Sarre): *Reisen in Kleinasien*، ص ۴ بعد؛ (۱۷) *IA*، بذیل مادّۂ Alaşehir (از دارکوت B. Darkot و مُکرِمین خلیل ینانچ).

(ادارۂ [آ]، طبع دوم)

آلاطاغ: [اَلا داغ] ترکی زبان میں بمعنی مختلف رنگوں کا پہاڑ۔ ⊗ ترکیہ اور بعض دیگر ترک ممالک کے بہت سے پہاڑوں، پہاڑی سلسلوں اور مجموعوں کا نام۔ ان میں بڑے بڑے یہ ہیں:

۱۔ کوہستانِ طاوروس [طوروس] (Taurus)، [بلغار طاغی]) کا بلند ترین حصّہ، جو جنوبی آناطولی میں میدانِ اَدَنَہ (Adana) کے شمال مغرب کی طرف اونچا ہوتا چلا گیا ہے۔ یہاں کوہ ہاے آلاطاغ اپنی دو چوٹیوں یعنی دِمیر قازِق [=ستون آہنی] (۳,۷۲۶ میٹر) اور دوسری مزید جنوب کی جانب بنام کالدِی طاغی [=تنہا پہاڑ] (۳,۷۳۴ میٹر) کی بدولت اپنی انتہائی بلندی کو پہنچ جاتے ہیں.

۲ ۔ شمال مغربی آناطولی کا آلاطاغ، جو بولُو کے جنوب مشرق کی طرف واقع ہے اور جس کی چوٹی کو رُاوغلو ۲,۳۷۸ میٹر بلند ہے [کو رُاوغلو کے لفظی معنی ہیں ''نابینا کا فرزند''۔ یہ ایک مقامی سُورما کا نام ہے].

۳ ۔ مشرقی آناطولی کا آلاطاغ (۳,۲۵۰ میٹر)، جو جھیل وان کے شمال مشرق کی طرف واقع ہے اور جس میں دریاے فرات کی دو بڑی شاخوں میں سے ایک، یعنی مرادصُو، کے منابع ہیں۔ ایلخانیوں کے زمانے میں یہ آلاطاغ ان کی حکومت کا گرمائی مستقر تھا۔ ارغون خان کے عہدِ حکومت میں یہاں ایک محلّ بھی تعمیر کیا گیا تھا.

۴ ۔ شمال مشرقی ایران کا آلاطاغ جو اَتُرک ندی کے جنوب میں واقع ہے.

۵ ۔ وسط ایشیا کا آلاطاغ، جو [چُونغاریا Dzungaria] کو جھیل بالقاش کے طاس سے علیحدہ کرتا ہے۔ (اَلاتاؤ، تقریباً ۴,۳۰۰ میٹر).

۶ ۔ مشرقی ترکستان کے شمال مشرق میں ایسی کول (Issik-köl) اور

آلما آتا کے درمیان پھیلا ہوا آلا طاغ (اَلاتاو، ۴,۸۰۰ میٹر).

۷- سائبیریا کا آلا طاغ (اَلاتاو)، کوہستان اَلتائی کے شمال کی طرف واقع ہے، جسے اہلِ روس کوہستان کُوزنتسک (Kuznetsk) کہتے ہیں۔ یہ سائبیریا میں کوئلے کی کانوں کے نہایت فعّال اور سرگرم کار علاقے میں واقع ہے.

([آ، ترکی]) (بَسیم دارقوت BESIM DARKOT)

----

* **آلائی:** [اَلائی] ترکی لفظ، جو غالبًا یونانی لفظ allagion سے ماخوذ ہے اور جس کا اطلاق بوزنطی فوج کے بعض دستوں پر ہوتا تھا (قب کوپرولوزادہ محمد فؤاد: بزانتس مؤسّسیلرینک عثمانلی مؤسّسیلرینہ تأثیری، تورک حقوق و اقتصاد تاریخی مجموعہ سی، ۱: ۲۷۷)۔ عثمانی اصطلاح میں اس کا مفہوم "سوار دستۂ فوج"، "عرضِ لشکر (parade)"، لہٰذا "انبوہ" اور "کثیر مقدار" لیا جاتا تھا اور انیسویں صدی کی فوجی اصلاحات کے بعد سے "ایک رجمنٹ (regiment)" کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ وہ اہم ترین پریڈیں (عرض ہائے لشکر) جن کے لیے یہ نام استعمال ہوتا تھا حسبِ ذیل تھیں: "قلیچ آلائی" جو اس وقت ہوتی تھی جب [تخت نشینی کے موقع پر] سلطان جامع ایوب میں سلطان عثمان کی تلوار لگانے جاتا تھا۔ "آلائی ہمایون"، جو اُس وقت ہوتی تھی جب سلطان دار السلطنت سے کسی مہم کے سلسلے میں یا کسی اور غرض سے کہیں جاتا یا وہاں واپس آتا تھا۔ "صُرّہ آلائی"، جو سلطان کی طرف سے حرمین [شریفین] کو سالانہ عطیہ بھیجنے کے موقع پر محلّ سلطانی ("سرائے") میں ہوتی تھی۔ 'مولود' اور 'بیرام اَلائیری' جو رسول [اکرمؐ] کی پیدائش کے دن مساجد کی زیارت کے وقت اور دونوں عیدوں کے موقع پر ہوتی تھیں؛ اور 'والدہ آلائی' جو والدۂ سلطان کو "پرانے محلّ" [اِسکی سرای] سے "نئے محلّ" [یکی سرای] میں منتقل کرتے وقت کی جاتی تھی۔ یہ لفظ بعض منصبی ناموں کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا، جیسے کہ "آلائی بکی"، یعنی وہ افسر جو کسی سنجاق یا "ایالت" کی تیولداری سوار فوج کی قیادت کرتے ہوں اور خود جاگیردار ہوں اور "آلائی چاؤشو"، جسے ان چاؤشوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جو جلوسوں کے لیے راستہ صاف کرتے تھے یا جو جنگ کے دوران میں بلند آواز سے احکام (سپاہیوں تک) پہنچاتے تھے؛ "آلائی کوشکو" طوپ قپی سرائے میں ایک کوشک (pavilion) تھا، جو سلطان مراد ثالث کے عہد میں اس غرض سے تعمیر ہوا تھا کہ سلاطین وہاں سے عرضِ لشکر (پریڈ) کا نظارہ کر سکیں.

مآخذ: (۱) اوزون چارشیلی (I. H. Uzunçarşili): عثمانلی دولتی سرای تشکیلاتی، اشاریہ؛ (۲) *IA*، بذیلِ مادّہ (اُسی مصنّف کے قلم سے)؛ (۳) گب (Gibb) و بَوان (Bowen): *Islamic Society and the West*، ج ۱/۱، اشاریہ.

(H. BOWEN)

----

* **آلَبہ و القِلاع:** ("اَلَبہ Alava اور قلعے")، ایک جغرافیائی اصطلاح، جسے دوسری سے تیسری صدی ہجری / آٹھویں سے نویں صدی عیسوی تک کے عرب وقائع نگار مسیحی ہسپانیہ کے اس حصّے کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں جو قُرطُبہ کے اموی "امیروں" کی گرمائی مہموں (صائفہ) کی سب سے زیادہ زد میں تھا۔ اصطلاحِ اَلَبہ کا اطلاق بالخصوص جزیرہ نمائے آئی بیریا [سپین و پرتگال] کے اس شمالی حصّے پر ہوتا تھا جو دریاے اِبرہ (Ebro) کی بالائی وادی کے بائیں کنارے سے پرے واقع تھا۔ اس علاقے کی مغربی حد پر بُوریبہ (Bureba) اور کستلا لا ویے خا (Castilla la Vieja) ("قشتالیۂ قدیم" = القلاع) کے علاقے میں واقع تھے۔ یہ علاقے درۂ پنکورْبو (Pancorbo Pass) کے بالمقابل وادیِ ابرہ کے بائیں کنارے سے شروع ہو کر عصرِ حاضر کے شہر سانتانڈر (Santander) کے مضافات تک پھیلے ہوئے تھے۔ اَلَبہ (Alava) آج کل ہسپانیہ کے ایک صوبے کا نام ہے، جس کا صدر مقام جدید شہر وِیتوریہ (Vitoria) ہے.

مآخذ: E. Lévi-Provençal: *Hist. Esp. Mus.*، ۱: ۱۴۳، ح ۱، نیز دیکھیے مادّۂ الأندلس، ۱ [در آ، طبع دوم].

(لیوی پرووانسال E. LÉVI-PROVENÇAL)

⊗ **آلْپ** (۱): [اَلپ] قدیم اور جدید دونوں قسم کی کئی ترکی بولیوں میں قہرمان (hero)، شجاع، دلیر اور طاقتور کے معنی میں مستعمل ایک کلمہ، جو شخصی نام کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے اور ایک صفت، ایک عنوان اور قبائلی نظام میں فوجی اشراف کی ایک جماعت کے نام کے طور پر بھی مروّج ہے (اے۔ جعفر اوغلو: *Uygur sözlüğu*، استانبول ۱۹۳۴ء)۔ ایشیاے بزرگ اور یوریشیا کے صحرائی میدانوں میں جو ترکی اور دیگر آلتائی قبیلے شدید و مسلسل جنگ و پیکار کی زندگی بسر کرتے تھے ان کے ہاں دوسرے الفاظ بھی تھے جو بعینہٖ یہی مفہوم ادا کرتے تھے، مثلاً منگولی زبان میں موجود لفظ "بگاتور" (باتور)، جو بعد میں ترکی زبان میں پہنچ گیا، دوسری آلتائی زبانوں میں بالکل ترکی زبان کے "اَلپ" کا مترادف ہے۔ ترکی میں، خصوصًا اوغوز بولی میں، ایک لفظ سُکمان (sökmen) بھی ہے، جو قریب قریب یہی معنی رکھتا ہے جس کا مطلب ہے: "دشمن کی فوجی صفوں کو چیر کر آگے بڑھنے والا" ["کاسِرُ صفِّ الحرب"] (کاشغری: دیوان لُغات التُرک ۱: ۳۷۰)۔ پھر لفظ "چَپَر (çapar)" بھی اسی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ بارھویں صدی عیسوی میں اَرتُق قبیلے کے ایک شعبے کو اس کے بانی سُکمان بن اَرتُق کے نام پر "سُوکْمَن لَر" کہتے تھے، یہی نام اَخلاط کے "ارمن شاہ لر" کے خانوادے میں بھی پایا جاتا ہے۔ عثمانیوں میں "سِیک بان" کی تنظیم کا نام [جوینی (یکی) چری کا ایک حصّہ تھی] فارسی لفظ 'سگبان' سے ماخوذ نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، بلکہ اسی لفظ سوکْمن سے بنا ہے، جو آناطولی میں اب

تک ''سے مَن'' ''seymen'' کی شکل میں مستعمل ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ لفظ ''آلُپ'' قریب قریب تمام قدیم وجدید ترکی بولیوں میں موجود ہے۔ اورخون اور اویغور ہجّی میں لکھی ہوئی کتابوں میں یہ لفظ ہمیں ایک اسم معرفہ یا صفت یا عنوان کے معنی میں ملتا ہے (اُن مختلف متون میں جو ٹومسن (Thomsen)، راڈلوف (Radloff)، بانگ (Bang)، فون لہ کاک (Von le Coq) وغیرہ کے شائع کردہ ہیں؛ مثلاً آلُپ طُغرِل، آلُپ تُولوک اُگہ وغیرہ کی طرح)۔ اورخون کتبات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ کُل تگین کی سواری کے گھوڑے کا نام آلُپ شال چی تھا اور بہادر گھوڑوں کو اس قسم کے نام دینے کا دستور اَور سب جنگجو قوموں کی طرح ترکوں میں بھی قدیم زمانے سے چلا آتا تھا (دیکھیے مادّۂ ''آت'' در [آ، ترکی)۔ مختلف تاریخی تحریروں سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس لفظ کو ''خزَرلَر'' [بحیرۂ خزر کے آس پاس کے باشندے) بھی استعمال کرتے تھے (Ghévond: *Histoire de Guerres et des Conquêtes des Arabes en Arménie*، فرانسیسی ترجمہ از G. Chahnazarian، پیرس ۱۸۵۷ء، ص ۳۹، ''آلُپ ترُخان''؛ J. Marquart: *Osteuropäische und ostasstatische Streifzüge*، لائپزگ ۱۹۰۳ء، ص ۳۰۲، ۵۱۴، *Alp-ilut'ver*).

متأخّر متون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلمہ جو قوتادغُو بیلیگ (*Kutadgu-Bilig*) میں، دیوان لُغاتِ التُرک میں، تیرھویں صدی اور چودھویں صدی کی لکھی ہوئی کتبِ لغت میں (ہوتسما Houtsma کی ترکی۔ عربی لغات میں، ابن مُہنّا میں اور ابوحیّان میں) اور پرانے ترک مُتون (قوام الدّین: *Nahc al-farādīs ten derlenen türkce sözler*، [نہج الفرادیس دن دِرلِنِن تُرکجہ سوزلر] *TM*، ۴: ۱۷۲) میں ملتا ہے، بالخصوص اوغوز قبائل میں بکثرت مستعمل تھا؛ تاہم یہ پرانا ترکی لفظ ''آلیپ'' کی شکل میں اور انھیں معنوں میں اَلتائی، اَباقان، قازاق اور قرغِیز کی بولیوں میں اب تک موجود ہے اور پرانی رزمیہ کہانیوں میں اسمِ معرفہ کے طور پر برابر استعمال ہوتا رہا ہے، مثلاً آلِیپ قارشیگا، آلِیپ سَلای، گُرگُن آلِیپ، قانتای آلِیپ، آلِیپ سُو یان، آلپامِیش وغیرہ۔ اغلب یہ ہے کہ مذکورۂ بالا ترکی قبیلوں نے مغلوں کے استیلا کے بعد کی صدیوں میں ''بہادر'' کے لیے مغولی لفظ باگاتور کو 'باتِر' اور ''ماتِر'' کی شکل میں اختیار تو کرلیا لیکن لفظِ آلُپ (آلِیپ)، جو زیادہ پرانے زمانے سے چلا آتا تھا، ان کے ہاں پھر بھی محفوظ رہا۔

پرانی ترکی روایات میں اور ان رزمیّہ داستانوں میں جن میں یہ روایات محفوظ ہیں یہ ''آلُپ'' کا عنوان قدیم زمانے سے ملتا ہے۔ محمود کاشغری لکھتا ہے کہ ترکوں نے اپنے ایک بڑے روایتی حکمران کو، جو ایرانیوں میں افراسیاب کے نام سے مشہور ہے۔ ''تُنگا آلُپ اَرُ'' کے نام سے موسوم کیا تھا (دیوان لغات الترک، ۳: ۱۱۰ ببعد، ص ۲۷۲)۔ قوتادغو بیلیگ (*Kutadgu Bilig*) میں ''تُنگا آلُپ اِرُ'' کا نام مشہور ترک فرمانرواؤں میں خاص طور پر مذکور ہے [دیکھیے *Kutadgu Bilig*، طبع استانبول ۱۹۴۲ء، ۱: ۱۳۲] اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ ''تاجیک لر'' (ترکستان کے ایرانی الاصل لوگ) اُسے افراسیاب کہتے ہیں (J. Deny: *Apropos d'un traité de morale turco*، در *RMM*، ۱۹۲۵ء، IX: ۲۰۵)۔ لفظ ''تُنگا'' سے ایک خاص شیر مراد ہے جو اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ ہاتھیوں کو مار ڈالتا ہے (محمود کاشغری اسے ''بَبرُ'' کہتا ہے)۔ یہ لفظ پرانے ترکی اسما میں مجازًا بہادر کے معنی میں اکثر استعمال کیا جاتا ہے (M. W. Pelliot: *Notes sur le "Turkestan" de Barthold*، *T'oung pao*، ۱۹۳۰ء، xxvii: ۳۳ ببعد)۔ بہت سے ترکی خانوادے دعوٰی کرتے تھے کہ اس سورما افراسیاب سے ان کا نسب ملتا ہے اور وہ اسے ''آلُپ'' کا لقب دیتے تھے۔ اس لقب کی قدامت کے اظہار کے لیے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ ایک ایسی قدیم ترکی روایت پر مبنی ہے جو پانچویں صدی کے 'قراخان لِی لَر' کے دور تک زندہ تھی۔ مشرقی ترکستان میں اس لفظ کی قدامت کا ثبوت یہ ہے کہ تورفان میں ''آلُپ اَتا'' کا مزار ہے (محمد فؤاد کوپرولو: تورک اِدبیاتندہ اِیلک متصوِّفلَر، ۱۹۱۸ء، ص ۱۷).

ہمارے پاس جو تاریخی وثائق موجود ہیں ان سب سے واضح ہوتا ہے کہ لفظ ''آلُپ'' ترکوں میں اسلام سے قبل بطور اسمِ معرفہ یا لقبِ اعزازی عمومًا مستعمل تھا۔ اور یہ کہ اسلام کے بعد بھی اس لفظ کا رواج برابر قائم رہا۔ دسویں صدی میں دمشق کا عبّاسی والی آلُپ تگِین تھا، سلطنتِ غزنویہ کا بانی آلُپ تگِین تھا، بخارا میں حاجب آلُپ تگِین تھا اور ایک اور آلُپ تگِین سلطان مسعود غزنوی کے دربار میں سفیر کی حیثیت سے آیا تھا، بارھویں صدی میں قراختای خاندان کی طرف سے سمرقند کا والی بھی آلُپ تگِین تھا۔ سلجوقیوں کی عظیم الشّان سلطنت کے بعض امیروں کے نام آلُپ گُش (قُش)، آلُپ آغاجی، آلُپ اَرُگُو اور آلُپ آرُگُون تھے اور خود سلجوقی بادشاہ آلُپ آرسلان کہلاتا تھا۔ تیرھویں صدی میں آلُپ آرُگُو نامی امیر ''ہزار اسب لر'' میں سے تھا، آلُپ آرسلان دمشق کے سلجوقیوں میں سے ایک فرمانروا تھا، سمرقند میں آلُپ اِرخان ''قراخان لِی لَر'' میں سے ایک امیر تھا، آناطولی کے سلجوقیوں کے زمانے میں ''نُوح آلُپ'' رکن الدین کا ایک امیر تھا اور محمود آلُپ عزّالدین کیکاؤس کی طرف سے سیواس کا 'اِیل باشی' [حاکم] تھا، (مختصر ابن بی بی میں یہ لقب ''الّی باشی'' کی شکل میں لکھا ہے اور ''اُون باشی'' (دس کا حاکم) ''یُوز باشی'' (سو کا حاکم) اور ''بِک باشی'' (ہزار کا حاکم) کی مثالیں پیشِ نظر رکھ کر اسمٰعیل حقّی اوزون چارشِلی اسے ''اِلّی باشی'' (پچاس کا حاکم) پڑھتا ہے، لیکن میں اس تاویل میں اُس سے متفق نہیں ہوں (دیکھیے عثمانلی دِوِلتی تشکیلاتِینہ مِدخَل، استانبول ۱۹۴۱ء، ص ۱۱۱؛ اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں کہ آناطولی سلجوقیوں کی جاگیردارانہ فوج کو پچاس پچاس سپاہیوں کے دستوں میں تقسیم کیا جاتا تھا لیکن یہ ہمیں معلوم ہے کہ مغل اور ترک سلطنتیں اپنی فوجی تشکیلات

میں عموماً نظامِ اعشاری کی رعایت رکھتی تھیں، اس وجہ سے میرے نزدیک اس لفظ کو ''ایل باشی'' (یعنی حاکم ولایت) پڑھنا چاہیے۔ پھر حُسام الدین آلپ سارُو اور قسطمونی کا امیر آلپ یُورُک ہیں اور بعد میں عثمانی ترکوں کے اوّلین عہد کی تاریخ تو ایسے بہادروں سے بھری پڑی ہے جن کا لقب ''آلپ'' تھا۔ دسویں صدی سے چودھویں صدی تک بے شمار لوگوں نے، جن میں بادشاہوں سے لے کر معمولی فوجی سردار شامل ہیں، لفظ ''آلپ'' کو اسمِ معرفہ یا لقب کے طور پر استعمال کیا (نیز دیکھیے Howorth: *History of the Mongols*، ۲: ۱، ۱۴، ۵۱۵؛ ۳: ۹۵۲)۔ اس لفظ کے استعمال کی وسعت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ ماوراء النّہر سے لے کر آناطولی تک جن جن علاقوں پر ترکی حکومتوں کا عَلَم لہرایا یا جن میں ترکی قبیلے آباد ہو گئے لفظ ''آلپ''، بعض دوسرے ترکی یا اسلامی ناموں کے ساتھ ملا کر اسمِ معرفہ بنا لیا گیا (اس زمانے کے مختلف عربی اور فارسی مآخذ میں یہ نام اکثر پایا جاتا ہے، ان کے لیے دیکھیے مطبوعہ کتابوں کے اشاریے)۔ ''آلپ'' کی ایک اور شکل ''آلپی'' بھی ہے، جو بعض اوقات خاص ناموں میں نظر آتی ہے؛ مثلاً مارِدین کے ''اُرتُق لر'' خاندان میں سے نجم الدین علی آلپی، اور عماد الدین آلپی (بارھویں صدی اور چودھویں صدی میں)۔

اسی لفظ سے متعلق ایک اَور کلمہ آلپاغو (یلپاغو، آلپاغوت، آلپاوُوت'') بھی ہے، جو اَورخون کتبات میں اسمِ معرفہ کے طور پر موجود ہے (Thomsen: *Inscriptions de l'Orkhon*، ہیلسِنگفورز ۱۸۹۶ء، ص ۱۶۳) اور اویغور متون میں بھی پایا جاتا ہے (Müller : *Zwei Pfahlinschr*، ص ۲۳، ۳۲؛ وہی مصنف: *Uigurische Glossen Festscrift fur Friedrich Hirth*، برلن ۱۹۲۰ء، ص ۳۱۷)۔ میری رائے میں جب ٹامسن (Thomsen) بلا دلیل یہ کہتا ہے کہ اَورخون کتبات کا بعینہٖ یہ لفظ اُس لفظ سے مختلف ہے جو قرَیم (Karayim)، توبول (Tobol)، چغتائی (Çagatay) اور قازان (Kazan) بولیوں میں موجود ہے (Radloff : *Wörterb*، ۱: ۴۳۰ بعد) تو وہ غلطی کرتا ہے۔ یہ لفظ بالکل ''آلپ'' کی طرح کا ہے اور ایک نام یا صفت اور بالکل اِسی نوعیّت کا ایک لقب ہے (دیکھیے نیز Németh Gyula: *Ahonfoglalo Magyarság Kialakulasa*، بُوڈاپسٹ ۱۹۳۰ء، ص ۲۵۹-۲۶۰)۔ ہم اس لقب کے نمونے ترکی قبائل کے ناموں میں دیکھ چکے ہیں، اسی طرح ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ بعد میں یہ ایک ترکی قبیلے کا نام ہو گیا اور چودھویں سے سولھویں صدی تک جو قبائل آق قویونلو اور صفویوں کی سلطنتوں کے ماتحت زندگی بسر کر رہے تھے ان میں ایک ترکی قبیلہ ''آلپاگُوت'' کے نام سے موجود تھا۔

(۲)

جس طرح قبلِ اسلام مختلف ترکی حکومتوں میں رواج تھا اسی طرح اسلام کے بعد بھی ترکی سلطنتوں، بالخصوص عظیم الشان سلجوقی سلطنت، میں یہ رواج جاری رہا کہ لفظ ''آلپ'' سرکاری خطاب کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ اس کا ثبوت چند نادر تاریخی مآخذ اور خاص کر کتبوں میں مل سکتا ہے۔ چونکہ اس کے متعلق سیاسی دستاویزات مفقود یا کمیاب ہیں اس لیے مسلمان ترک سلطنتوں کے وسطی زمانے میں ''خطابوں'' کی تحقیق کے لیے کتبے بے حد اہمیّت رکھتے ہیں، کیونکہ ان میں بسا اوقات وہ سرکاری خطاب اور لقب ملتے ہیں جو حکمرانوں، شہزادوں اور اکابرِ حکومت کے ناموں کے ساتھ ضوابطِ رسمی کے ماتحت استعمال کیے جاتے تھے۔ اس نقطۂ نظر سے گیارھویں سے پندرھویں صدی تک کے کتبات اور دیگر تاریخی اسناد سے لفظ ''آلپ'' کے سرکاری خطاب کی حیثیت سے استعمال کیے جانے کے بارے میں ہم یہ نتائج نکال سکتے ہیں: بڑے سلجوقی شہنشاہ اور یہاں تک کہ خاندانِ سلجوقی کے وہ حکمران بھی جو ان شہنشاہوں کی سیادت کو تسلیم کرتے تھے ''آلپ'' کا لقب استعمال نہ کرتے تھے۔ نظامی عروضی نے سلاجقۂ روم کے مورث اعلٰی قُتَلْمُش کے لیے ''آلپ غازی'' کا جو لقب استعمال کیا ہے وہ محض تسبیق ہے ورنہ کسی تاریخی دستاویز میں اس کا سراغ نہیں ملتا، جیسا کہ مرزا محمد قزوینی نے صحیح طور پر واضح کر دیا ہے (چہار مقاله، سلسلۂ وقفیۂ گب، ص ۴۵، ۱۸۲ بعد)۔ یہ لقب زیادہ تر ان سلاطین کے امرا کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور بعد میں جو مختلف سلطنتیں ان امرا نے قائم کیں ان میں دوسرے قدیم ترکی القاب مثلاً ''اِینانج'' [معتمد]، ''قُتلُغ [خوش حال]، ''بیلگہ'' [دانشمند] کے ساتھ مل کر آلپ بھی رسمی القاب کے زمرے میں شامل ہو گیا۔ سب سے پہلے ''آلپ'' کا لقب حلب میں آق سُنقُر کے ایک کتبے میں پایا جاتا ہے جو سلطان ملک شاہ کا ایک امیر تھا۔ بعد کے زمانے میں دمشق، الجزیرہ اور شام کے اَتابکوں اور اُرتُق اوغُولَری کے کتبات میں ''آلپ قُتلُغ''، ''آلپ اِینانج قُتلُغ'' اور ''آلپ غازی'' کے القاب برابر نظر آتے ہیں (*Répertoire chronologique d' épigraphie arabe*، نشرۂ l' Institut Français d' Archéologie orientale، قاہرہ ۱۹۳۱-۱۹۳۷ء، شمارے ۲۷۶۴، ۳۰۲۱، ۳۰۷۲، ۳۰۸۵، ۳۱۱۱، ۳۱۱۲، ۳۱۲۲، ۳۱۴۶؛ Van Berchem: *Amida*، ہائیڈل برگ ۱۹۱۰ء، ص ۷۶، ۹۲، ۱۰۴، ۱۲۰، ۱۲۲؛ وہی مصنف: *Arabische Inschriften aus Armenien und Diarbekr*، برلن ۱۹۱۰ء، ص ۱۴۸ بعد)۔ بعض مسلم مؤرخین کی تحریروں سے ان کتبات کی تصدیق ہوتی ہے، مثلاً ابن القلانسی تصریح کرتا ہے کہ اَتابک زنگی کا لقب علاوہ اَور القاب کے، جو اس کے کتبات میں پائے جاتے ہیں، ''آلپ غازی'' بھی تھا (*History of Damascus*، طبع آمِدروز (H. F. Amedroz)، بیروت ۱۹۰۳ء، ص ۲۸۴)۔ ان کتابوں کے دیباچوں میں جو اس خاندان سے منسوب بعض حکمرانوں کو پیش کی گئیں ان کے سرکاری خطابات بالکل اسی شکل میں مذکور ہیں جس طرح ہم نے کتبات میں دیکھے ہیں اور ان میں ''آلپ اِینانج قُتلُغ'' کا خطاب بھی موجود ہے (دیکھیے دیسقوریدس (Discorides) کے قلمی ترجمے کا دیباچہ جو مشہد کی لائبریری میں محفوظ ہے، نیز

اس لائبریری کی فہرست مطبوعۂ تہران، شمارہ ۲۷).

مسلم ثقافت کے زیر اثر ترکی لقب ''آلپ'' کے ساتھ لقب ''غازی'' کا اضافہ کر دیا گیا، جس کا رواج شروع ہی سے مشرقِ ادنٰی کے تمام ملکوں میں پھیل گیا تھا اور ''آلپ غازی'' کی شکل میں اس لقب کا استعمال نہ صرف مذکورۂ بالا سلجوقی علاقوں میں بلکہ غوریوں کی طرح کی دوسری ریاستوں میں بھی، جو سلجوقیوں کے سیاسی و ثقافتی اثر کے تحت تھیں، عام ہو گیا۔ غوریوں کی طرف سے ہرات کا والی ملک ناصر الدین آلپ غازی اس کی مثال ہے۔ یہ غوری سلطان غیاث الدین کا بھانجا تھا۔ سلطان کے ساتھ وہ کئی لڑائیوں میں شریک رہا اور جب وہ ۶۰۰ھ/ ۱۲۰۳ء میں فوت ہوا تو والیِ ہرات تھا۔ اس نے یہ خطاب یقیناً سلجوقی القاب کے زیر اثر اختیار کیا ہوگا؛ تاہم قابلِ غور یہ امر ہے کہ سلجوقیوں کی طرح دوسرے خاندانوں میں بھی یہ لقب سلاطین اور شہزادوں کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا تھا بلکہ شاہی خاندان سے منسوب عورتوں کی اولاد کو دیا جاتا تھا (طبقاتِ ناصری، متن فارسی، کلکتہ ۱۸۴۶ء، ص ۱۲۱؛ براؤن اور قزوینی: لُباب الألباب محمد عَوفی، لنڈن ۱۹۰۶ء، ص ۱۵۹، ۳۳۱؛ تاریخ سیستان، شائع کردہ ملک الشعراء بہار، تہران ۱۳۱۴ شمسی، ص ۳۸۸؛ محمد بن قیس الرازی: المُعجَم فی معاییر اشعار العجم، طبع وقفیۂ گب، لنڈن ۱۹۰۶ء، ۱۰: ۳۴۶)۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ خطاب سلجوقیوں، خوارزم شاہیوں اور اتابکوں کے بعض اکابر حکومت کو بھی دیا جاتا تھا، لیکن ان کے خطابوں میں قُتلُغ اور اینانج جیسے الفاظ شامل نہیں کیے جاتے تھے بلکہ آلپ کو بعض اور ایسے القاب کے ساتھ ملا دیا جاتا تھا جو امرا اور سپہ سالاروں کے لیے مخصوص تھے؛ [مثلاً] ۵۶۴ھ/ ۱۱۶۸ء میں ''سیاست نامہ'' کا جو نسخہ ''رومیہ'' میں استنساخ کیا گیا تھا اسے صاحب کبیر آلپ جمال الدّین کے حکم سے لکھے جانے کا ذکر موجود ہے (Ethé و Sachau: بوڈلیئن لائبریری کے فارسی، ترکی، ہندوستانی اور پشتو مخطوطات کی فہرست، طبع ۱۸۸۹ء، ۱: شمارہ ۱۴۲۴)۔ ''آلپ'' کا لقب ترکوں کے قدیم خطابوں میں بعض القاب مثلاً اِیلِک اور تیگِن (دیگِن) کے ساتھ ملا کر آلپ اِیلِک اور آلپ تیگِن کی شکلوں میں بھی استعمال کیا جاتا تھا، جس طرح بارھویں صدی میں ایک ترکی قبیلے کا حکمران، جو خوارزم کی سرحد جَنَد پر رہتا تھا، ''آلپ دیگِن'' کے لقب سے ملقب تھا (تاریخ جُوینی، طبع وقفیۂ گب، لنڈن ۱۹۱۶ء، xvi: ۴۰ بعد)؛ اس طرح ایک پرانی ارمنی تاریخ میں آناطولی میں قُتلُمُش کے ایک جانشین ''آلپ ہیگ'' کا ذکر ہے (اس کا مسلم مآخذ میں کہیں ذکر نہیں)۔ میں نے ثابت کیا ہے کہ یہ یقیناً ایک سلجوقی شہزادہ ملقب بہ ''آلپ اِیلِک'' تھا (*Belleten*، انقرہ ۱۹۳۷ء، ۱: ۲۸۸)۔ گو ''اِیلِک'' ایک بلند پایہ خطاب تھا جو صرف حکمرانوں اور حکمران خاندان سے منسوب شہزادوں کو دیا جاتا تھا، تیگِن (دیگِن) کسی قدر غیر اہم لقب تھا، جو قبائلی رئیسوں کو دیا جاتا تھا۔ جب ایرانی۔اسلامی ثقافت کے زیر اثر شروع کے سلجوقی سلاطین نے ''شہنشاہ'' یا ''السلطان الاعظم'' کے سے لقب اختیار کر لیے، جو صرف شہنشاہوں کے لیے مخصوص تھے، تو وہ ''اِیلِک'' اور ''آلپ اِیلِک'' جیسے بلند پایہ خطابات شہزادوں کو عطا کرنے میں کوئی تامّل نہ کرتے تھے۔ معاصر ارمنی مؤرّخوں کے اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سلجوقیوں میں ترکوں کے پرانے خطابات کی روایت اس سے زیادہ درجے تک جاری رہی جتنا کہ پہلے خیال کیا جاتا تھا۔

خوارزم شاہی بادشاہ، جو عراقی سلجوقیوں کو برطرف کر دینے کے بعد اپنے آپ کو سلاجقۂ اعظم کے براہِ راست وارث سمجھتے تھے اور اپنے تمام نظم و نسق میں سلجوقیوں کی پرانی روایات پر کاربند رہے، ''آلپ'' کا لقب صرف بڑے بڑے امرا اور قبائلی سرداروں کے لیے استعمال کرتے تھے (چنانچہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ جلال الدّین کے بڑے امرا میں سے ایک کا لقب ''آلپ خان'' تھا) اور دوسرے ترکی القاب کے ساتھ نہیں ملاتے تھے (محمد النّسَوی: *Histoire des Sultan Djelal ed-Din Monkobirti*، ترجمہ از O. Houdas، ج ۲، پیرس ۱۸۹۱-۱۸۹۵ء، عربی متن، ص ۱۳۸)۔ لیکن غالبًا وہ [اپنے لیے] ''آلپ'' کے لقب کو بھی ان القاب کے ساتھ ملا کر استعمال کرتے تھے جو بڑے بڑے سلاطین کے لیے مخصوص تھے۔ چنانچہ مولانا جلال الدین رومیؒ، جو خوارزم کی شاہی روایات سے ضرور واقف ہوں گے، اپنی مثنوی میں (انقروی: شرح، ۵: ۲۱۵؛ ۶: ۴۵۱) محمد خوارزم شاہ کے لیے ''آلپ اُلُغ'' کا خطاب استعمال کرتے ہیں (ایم۔شرف الدین یالتقایا: مولانا ده تورکچه کلمه لر و تورکچه شعرلر *Mevlana'da türkçe Kelimeler ve türkçe şiirler TM*، ۱۹۳۴ء، ۴: ۱۱۲)۔

جس طرح یہ سلجوقی روایت خوارزم شاہیوں، اتابکوں اور غوریوں میں جاری رہی اسی طرح ہندوستان کی ترکی سلطنتوں میں بھی اس کا رواج رہا، خصوصًا خلجی خاندان کے مشہور بادشاہ علاء الدّین اور بعد ازاں خاندانِ تغلق کے زمانے میں، جس نے خلجیوں کی روایات کو قائم رکھا؛ چنانچہ تاریخی تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ بادشاہ اپنے بڑے امرا کو ''آلپ خان'' کا خطاب دیا کرتا تھا (ضیاء الدّین بَرَنی: تاریخ فیروز شاہی، مکتبۂ ہندیہ Bibliotheca Indica، سلسلۂ جدید، شمارہ ۲۳، ۱۸۶۲ء: ۲۴۰، ۵۲۷؛ محمد قاسم استرآبادی: تاریخ فرشتہ، بمبئی ۱۸۳۱ء، ۱: ۱۷۶، ۲۳۸)۔ یہ خطاب ہندوستان کے بادشاہوں کے ہاں پندرھویں صدی کے وسط تک جاری رہا (عبدالقادر بدایونی: منتخب التواریخ، مکتبۂ ہندیہ، سلسلۂ جدید، ۱۸۶۸ء، ص ۲۱۹)۔ اس روایت کا اسلامی ہند کے دوسرے شاہی خاندانوں میں بھی رائج ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ ہوشنگ شاہ (۱۴۰۵-۱۴۳۵ء)، جو حکمرانانِ مالوہ کی غوری شاخ سے تھا، اپنے زمانۂ ولی عہدی میں ''آلپ خان'' کے خطاب یا نام سے مشہور تھا (خلیل ادہم: دُوَلِ اسلامیہ، استانبول ۱۹۲۷ء، ص ۴۷۷)۔ آناطولی کے سلجوقیوں اور بعد میں ان کے جانشین مختلف خاندانوں، نیز چنگیز خان کی اولاد کی قائم کردہ ریاستوں میں ہمیں لفظ آلپ

کو رسمی خطاب کے طور پر استعمال کیے جانے کے متعلّق سیاسی دستاویزوں میں کوئی سراغ نہیں ملتا، صرف اتنا معلوم ہے کہ اوغوز کے چھوٹے قبیلوں میں، جنھوں نے قبائلی نظام اور قبائلی روایات کے استحکام کو ہنوز محفوظ رکھا تھا، لفظ ''اَلْپ'' اسمِ معرفہ کے طور پر یا اوغوز قوم کے قہرمانوں کے لیے خاص لقب کی حیثیّت سے استعمال ہوتا تھا۔

(۳)

ترکوں میں بہادرانہ اور جنگجویانہ روایات قائم ہونے کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے صدیوں تک ایشیا کے وسیع صحرائی میدانوں میں انتہائی جفاکشی اور مسلسل جنگ و پیکار کی زندگی بسر کی تھی۔ یہ اسپ سوار خانہ بدوش صدیوں تک یکے بعد دیگرے مختلف خطّوں میں نکلے۔ انھوں نے عظیم الشان خانہ بدوش سلطنتیں قائم کیں اور بڑے بڑے ممالک کو، جہاں کاشت کار اور شہری باشندے آباد تھے، اپنے قبضے میں کر لیا۔ طبعی طور پر وہ اپنی عسکری تنظیم اور اپنے بہادرانہ کردار کو ہر چیز سے زیادہ اہمیّت دیتے تھے۔ مختلف قبائل اور قبائلی گروہوں کے درمیان خانہ جنگیاں، غیر اقوام سے جنگ و جدال اور تاخت و تاراج، یہ سب اس کے متقاضی تھے کہ ترکی معاشرے میں بہادروں کو بڑے بڑے اعزازات عطا کیے جاتے۔ جب ترکوں نے بدوی زندگی کا شیوہ ترک کر کے حضری زندگی اختیار کر لی اور کاشت کاری کرنے لگے، یہاں تک کہ شہروں میں آباد ہو گئے، تب بھی وہ صدیوں تک شجاعت و بہادری کی اُن روایات سے وابستہ رہے۔ ترکوں نے جن مختلف سیاسی تشکیلات کی بنیاد رکھی اُن میں انھوں نے ہمیشہ عسکری حکومت کی فضا کو قائم رکھا اور مجاہدانہ مساعی پر تکیہ کرنے والے دینِ اسلام نے ترکوں کو اپنا حلقہ بگوش بنا لیا اور سلجوقیوں کے زمانے سے تاریخی واقعات نے ایسی منزلیں طے کیں کہ تُرک مستقل طور پر عسکری زندگی بسر کرنے کے عادی ہو گئے؛ یہی چیز تھی جس نے اس قوم میں صدیوں تک بہادری اور ''آلْپ'' کی روح کو پوری قوت کے ساتھ محفوظ رکھنے میں مدد دی۔ ترکوں کے مختلف قبیلوں کے عوامی ادب، کہانیوں، منظوم قصّوں اور کہاوتوں غرض یہ کہ ان سب آثار میں جوان کی اخلاقی نشوونما کے آئینہ دار ہیں یہ حقیقت نظر آ سکتی ہے۔ جب ترکوں میں اسلامی جہاد اور غزا کے خیالات پوری طرح راسخ ہو گئے تو قبلِ اسلام کے ترکی ''آلْپوں'' (بہادروں) نے سب سے پہلے ''آلْپ غازی'' (یعنی ترک بہادرانِ اسلام) کا کردار اختیار کیا۔ پھر جب متصوّفانہ خیالات اور مختلف صوفی فرقے عوام میں مقبول ہونے لگے تو ''آلْپ اِیرِنْلر'' یعنی ''مجاہد درویشوں'' کا ظہور ہوا اور یہ زیادہ تر مسیحی ممالک سے ملحق ترکی حدودِ مملکت یعنی سرحدی اضلاع میں پائے جاتے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں کے پرانے قبائلی نظام میں ''آلْپ لَر'' سردارِ قبیلہ کے گرد و پیش ایک قسم کی خصوصی امتیازات کی حامل ایک جماعت بن گئی تھی اور یہ ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جو جنگ و پیکار میں بہادری کے جوہر دکھا کر نام پیدا کر چکے تھے۔ ان خانہ بدوش اشراف کی تشکیل میں اس مرتبے تک بلند ہونے کی پہلی شرط شخصی محاسن تھے اور ان کے ساتھ کسی حد تک موروثی اثرات بھی کارفرما تھے۔ جو لوگ اپنی طفولیت ہی کے زمانے میں شکار، پیکار و غزوات میں دلیری و بہادری کا ثبوت نہ دے سکتے تھے وہ اس جماعت میں داخل نہ ہو سکتے تھے۔ کسی قہرمان نے جتنے بھی خطرناک اور دلیرانہ کارنامے انجام دیے ہوں اور جتنے دشمنوں کے سر کاٹے ہوں (دیکھیے بَلْبَل Balbal [در آ ترکی]) قبیلے میں اس کا معاشرتی مرتبہ اُتنا ہی بلند ہوتا تھا۔ اس قسم کے خیالات، جو ہمیں ترک اور اَلمانی جیسی اقوام کے قدیم ادوار میں نظر آتے ہیں، آج کل کے زمانے میں بھی روے زمین کے بعض وحشی قبائل میں دیکھے جا سکتے ہیں (Robert Lowie: *Traité de sociologie primitive*، پیرس ۱۹۳۵ء، ص ۳۳۳-۳۳۶)۔ جب کبھی کسی قبیلے کا سردار بہت سے دوسرے قبائل پر اپنا اقتدار قائم کرتا اور وفاق کی قسم کی کوئی ہیئت مرتّب کرتا تو اس کے گرد و پیش یہ ''آلْپ لَر'' سے مرکّب ایک طبقۂ اشراف پھر نمودار ہو جاتا۔ بعض اوقات یہ ''آلْپ لَر''، جو خود سردارانِ قبائل ہوتے تھے۔ مغربی یورپ کے جاگیرداری نظام (feudalism) کے باج گزاروں (vassals) کی طرح ــ بڑے سردار کے ساتھ ایک ذاتی رابطے سے مربوط ہوتے تھے، لیکن پھر بعینہٖ اس قانون کے تحت خود ان سے وابستہ ''آلْپ لَر'' کی ایک جماعت ہوتی تھی۔ اِن ''آلْپ لَر'' کے جو اپنی معاشرتی حیثیّت کے مطابق مویشیوں کے بڑے یا چھوٹے ریوڑوں کے مالک ہوتے تھے علیحدہ علیحدہ خدمت گار اور غلام بھی ہوتے تھے۔ ان اَدوار سے لے کر، جن کا پتا ہمیں تاریخی اَسناد سے چلتا ہے، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایشیا کے بے درخت میدانوں (steppes) میں رہنے والے ترکی قبائل مختلف طبقات میں منظّم ہوا کرتے تھے۔ بڑے سردار اور دوسرے سرداروں کے چھوٹے سرداروں اور ان کے ''آلْپ لَر'' کے باہمی تعلقات بھی مروّجہ قانون کے مطابق منظّم و معیّن ہوتے تھے۔ اگر فریقین میں سے ایک فریق ان شرائط کی رعایت نہ کرتا تو دونوں کے باہمی روابط فی الفور منقطع ہو جاتے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ خانہ جنگی یا بغاوت پھوٹ پڑتی۔ قدیم ترکی مشرکانہ (pagan) عقائد اور رسوم و آئین سے ماخوذ قانونی شرائط کی وجہ سے قبیلے کا سردار مجبور تھا کہ اپنے آلْپوں کی مقررہ اوقات میں اور بعض مقررہ رسوم کے مطابق بڑے بڑے پیمانے پر ضیافتیں کرے اور اس کے بعد اپنا مال و دولت [ان پر] لُٹا دے۔ یہ ضیافتیں جن کے ترک قبیلوں میں الگ الگ نام تھے، مثلاً اِیچمہ۔ یِیمہ (içme-yeme) (شُرب و خورد = خورونوش)، شولِن Şölen ([= ''شیلان'']، ضیافت)، یا آش [پکی ہوئی خوراک: رکّ بہ آ ترکی، بذیل مادّہ]، کسی سردار کی حاکمیت کے استحکام کا بڑا ذریعہ تھیں۔ اس کے برعکس جو رئیس یا سردار ایسی ضیافتیں نہ کرتا وہ اپنے آلْپوں پر حکومت و اقتدار سے ہاتھ دھو بیٹھتا تھا۔

قبیلے کی اجتماعی زندگی میں آلْپوں کی جماعت کا جو حصّہ تھا یا اُس زمانے میں جب حصولِ مال کا بڑا ذریعہ تاخت و تاراج ہی تھی، اُس کے رہنے سہنے کا جو طریقہ

تھا ان باتوں کی وضاحت دِدِہ قُورقُد (Dede Korkut) کی حکایتوں میں موجود ہے۔ اس کتاب سے، جس میں تیرھویں اور چودھویں صدی کے دوران میں مشرقی آناطولی کے نیم خانہ بدوش اوغوز قبائل کی طرزِ زندگی کی تصویر کشی جان دار مناظر کی شکل میں کی گئی ہے، اُن اوغوز قبائل کی طرزِ زندگی کے متعلق بھی کچھ اندازہ ہوسکتا ہے جوظہورِ اسلام سے پہلے سیحون کے شمال کے بے درخت میدانوں میں رہتے تھے؛ بشرطیکہ یہ مان لیا جائے کہ قبائلی زندگی اور قبائلی تشکیلات بالکل اُسی ایک شکل میں صدیوں سے باقی چلے آئے ہیں۔ اس کتاب میں ایک خارجی جلا کی طرح تہذیبِ اسلامی کی تہ جما دی گئی ہے، تاہم اس سے اُن کے حقیقی تصوّرات اور بے دینی کے بقیہ آثار کی کچھ زیادہ پردہ پوشی نہیں ہوتی۔ تیرھویں اور چودھویں صدیوں کے یہ ترکمان زیادہ تر بایِندِروں (رکّ بہ بایندر، در آ، ترکی) کے قبیلے (بُوی) سے تعلّق رکھتے تھے۔ چونکہ ان کی زندگیاں گرجستان، اَرمنیہ اور طَربزُون کے یونانیوں اور دوسرے عیسائیوں کے خلاف مسلسل جنگ و پیکار میں بسر ہوتی تھیں اس لیے ان داستانوں میں جن ترک آلپوں کا ذکر آتا ہے وہ سب ''آلپ غازی'' تھے۔ وہ شکار کی خطرناک مہمّوں پر جاتے تھے، کافروں کے خلاف جہاد کرتے تھے؛ سب کے پاس گلّے اور ریوڑ تھے۔ وہ نہایت اچھے شہسوار تھے، تیر و نیزہ و شمشیر سے جنگ کرتے تھے اور ان کے درمیان خونی عداوتیں (blood-feuds) تھیں، جنگوں میں مبارزے (جنگِ تن بتن = single combats) ہوتے تھے۔ ان میں بھاٹ (اوزانلر) یعنی گویّے شاعر بھی ہوا کرتے تھے۔ اس زمانے کی عورتیں بھی بالعموم اسی قسم کی بہادرانہ صفات سے متصف تھیں۔ جو قبیلے مغربی آناطولی میں بوزنطی سرحد پر رہتے تھے بلاشبہہ وہ بھی انھیں حالات میں زندگی بسر کرتے تھے۔ عثمانی فتوحات اور جزیرہ نمائے بلقان میں مملکتِ اسلامی کی حدود کو آگے بڑھانے والے اس دَور کی خصوصیات، جسے ہم آلپ لر کے عہد سے تعبیر کر سکتے ہیں، سب کی سب بالکل اسی طرح یہاں بھی موجود تھیں، بشرطیکہ معاشرتی و سیاسی ارتقا کے باعث جو بعض فرق پیدا ہوگئے تھے ان سے قطع نظر کر لیں۔

چودھویں صدی کے آغاز میں مشہور شاعر عاشق پاشا [رکّ بآن] نے ترکی آلپوں کا بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ روایت آناطولی میں اُس وقت تک پوری قوت کے ساتھ باقی تھی۔ اس شاعر کے قول کے مطابق ''آلپ'' بننے کے لیے نو چیزیں ضروری ہیں: تندرست دل یعنی شجاعت، قوّتِ بازو، غیرت، اچھا گھوڑا، مخصوص لباس، کمان، شمشیر جوہردار، نیزہ اور ایک ہمدرد ساتھی (فؤاد کوپرولو: تورک اِدبیاتنده ایلک متصوّفلر، ص ۲۷۳)۔ اس کے ایک صدی بعد مراد اوّل کے زمانے میں سلجوق نامہ کے مصنّف یازیجی علی نے تیرھویں صدی کے سلجوقی آناطولی کی تصویر کھینچتے ہوے ''آلپ لر'' کی بعض خصوصیات بیان کی ہیں: ''آلپ لر'' اپنے گھوڑوں کی گردنوں میں سنہری یاک کے بالوں کے زیور آویزاں کرتے تھے۔ جو لوگ شکار میں تیر سے شیر کو ہلاک کر دیتے تھے وہ اپنی کلائیوں پر شیر کی دم لپیٹ لیا کرتے تھے اور جو ایک ہی تیر میں پرندے کو مار گراتے تھے وہ اس کے پروں کی کلغی لگاتے تھے (کتابِ مذکور، ص ۲۷۲ ببعد)۔ اگرچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بیان بالخصوص مصنّف کے اپنے زمانے کے مشاہدات پر مبنی ہے، تاہم یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ تیرھویں صدی والے آناطولی کے ترکمان قبائل کے متعلق بھی فی الجملہ درست ہوگا۔ محمود کاشغری نے بعض ایسی رسوم کا ذکر کیا ہے جو آلپ لر کے بارے میں بھی بعض معلومات فراہم کرتی ہیں (مثلاً یہ کہ وہ اپنے گھوڑوں کی دموں کو ریشم سے گوندھتے تھے، ۲:۲۸۰) اور اگر اس کے ساتھ ہی ہم ان بے شمار تحریرات کو بھی سامنے رکھ لیں جو سولھویں اور سترھویں صدیوں میں روم ایلی کی سرحد کے عثمانی بہادروں اور حملہ آوروں کی طرزِ زندگی اور ان کی شجاعانہ عادات کے متعلّق ہیں (فؤاد کوپرولو: مِلّی ادبیاتن ایلک مُبصّرلری، استانبول ۱۹۲۸ء، ص ۲۷ ببعد) تو یہ امر آسانی سے سمجھ میں آ جاتا ہے کہ ابتدائی زمانۂ شجاعت کے، جسے ہم عہدِ ''آلپ لر'' کہتے ہیں، تصوّرات اور روایات کس طرح صدیوں تک ترکوں میں باقی رہیں۔ مَیں ایک موقع پر ذکر کر چکا ہوں کہ وہ ''رُوم غازی لر'' (غازیانِ روم)، جن کا ذکر عاشق پاشا زادہ نے اس قدر شدّ و مدّ سے کیا ہے، حقیقت میں زمانۂ اسلام کے آلپ لر کے سوا اور کچھ نہ تھے۔

(۴)

ترکیہ میں بعض مقامات کے ناموں میں اب تک آلپ، آلپی اور آلپاگُت کے نام موجود ہیں: قارص میں ''آلپ قلعہ''؛ قسطمونی میں ''آلپ آرسلان کوئ''؛ قسطمونی، زونگولداک اور اِسکی شہر میں ''آلپی'' نام کے گاؤں؛ چُورُم بُولو، قسطمونی، بروسہ، انقرہ، کوتاہیہ، چانغری، بِیلہ جک، چناق قلعہ اور قرق لرایلی میں ''آلپاگوت''، ''آلپاوُوت'' نام کے گاؤں (دیکھیے ''کویلریمِز Köylerimiz'' شائع کردۂ وزارتِ داخلہ، استانبول ۱۹۳۳ء)۔ اگر کوئی شخص پرانی قلمروِ عثمانی کے ممالک میں اور ان وسیع جغرافیائی علاقوں میں جو آج بھی ترکوں سے آباد ہیں احتیاط سے تلاش کرے تو خیال ہے کہ اس قسم کے اَور بہت سے نام مل جائیں گے۔ دیہات میں ''آلپاگُت'' کا نام اکثر ملتا ہے اور، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک قبیلے کا نام تھا جس کے چھوٹے چھوٹے گروہ اپنے الگ الگ گاؤں بسانے کی غرض سے مختلف اطراف میں منتشر ہو گئے یا مرکزی حکومت نے انھیں منتشر کر دیا؛ بہرحال وہ اپنا نام ساتھ لیتے گئے اور یہی وجہ ہے کہ یہ نام بہت عام ہے۔ روم ایلی میں اس نام کے جو دیہات ہیں وہ یقیناً قبیلۂ آلپاگُت کے ان افراد کے آباد کیے ہوے ہیں جو بلقان پر عثمانیوں کے قبضے کے بعد آناطولی سے یہاں لائے گئے تھے۔ اس میں یہ بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ اِوْلیاء چلبی نے سترھویں صدی میں ''تُوقاد'' میں موجود ایک ''تکیہ'' [درویشوں کی خانقاہ] کا ذکر کیا ہے، جس کا نام ''آلپ غازی'' تھا اور بعینہٖ اسی نام کی ایک سیرگاہ (''مسیرہ'') کا بھی، جو اس کے قرب و جوار میں تھی (سیاحت نامہ، ۵: ۶۰، ۶۸، ۷۱)۔

مقامی روایت آلپ غازی کو دانشمندیوں کے عہد سے منسوب کرتی تھی۔

مآخذ: چونکہ اب تک اس لفظ کے متعلق لسانیاتی یا تاریخی نقطۂ نگاہ سے کوئی خاص تحقیق نہیں کی گئی اس لیے ہم نے مجبورًا اپنے مآخذ علیحدہ علیحدہ مقام پر متن میں دے دیے ہیں۔ Van Berchem کی *Amida*، ص ۹۲، حاشیہ ۵ میں ایک مختصر تصریح موجود ہے اور اس طرح Z. Gombocz کی *Arpádkori* (جو فی الحال میرے پاس نہیں ہے) کے ص ۴۳ بعد میں کچھ لسانیاتی معلومات درج ہیں۔ ان دونوں کے علاوہ ''آلپ لر'' اور ''عہدِ آلپ لر'' کے متعلق تاریخی معلومات کے لیے اہم ترین کتابیں یہ ہیں: (۱) فؤاد کوپرولو: تورک ادبیاتنده ایلک متصوفلر، استانبول ۱۹۱۸ء؛ (۲) وہی مصنف: *Les origines de l' Empire Ottoman* (Études orientales, 11)، پیرس ۱۹۳۵ء، (دیکھیے اشاریہ)۔

(محمد فؤاد کوپرولو)

---

* **آلپ آرْسلان** (۱): [آلپ ارْسلان] عضد الدولہ، محمد بن [داؤد] چغری بیگ، مشہور سلجوق سلطان، جو اپنے شاہی خانوادے کا دوسرا فرمانروا تھا (۴۵۵ھ/ ۱۰۶۳ء-۴۶۵ھ/ ۱۰۷۳ء)، وہ غالبًا ۴۲۱ھ/ ۱۰۳۰ء میں پیدا ہوا اور کم سنی ہی سے اپنے والد چغری بیگ کی افواج کی قیادت (بالخصوص آلِ غزنہ کے خلاف) بڑی کامیابی سے کرنے لگا۔ ۴۵۰ھ/ ۱۰۵۸ء میں اس نے ایران میں ابراہیم اینال کی بغاوت کے دوران میں اپنے چچا طُغرل بیگ کی جان بچائی۔ دو تین سال بعد اس نے چغری بیگ کی جگہ سنبھالی، جو عرصے سے بیمار چلا آ رہا تھا اور [۴۵۵ھ]/ ۱۰۶۳ء کے آواخر میں [اس خانوادے کے پہلے سلطان] طُغرل بیگ کا جانشین ہوا، جو لاولد فوت ہو گیا تھا۔ اس طرح وہ تمام سلجوقی مملکت کو اپنے زیرنگین لے آیا۔ اس نے کسی مشکل کا سامنا کیے بغیر اپنے سوتیلے بھائی سلیمان سے نجات حاصل کر لی، جسے غالبًا طُغرل بیگ نے متبنّٰی کیا تھا۔ الکُنْدُری وزیر کو اپنی اس ناعاقبت اندیشی کی پاداش میں جان سے ہاتھ دھونا پڑے کہ اس نے پہلے پہل سلیمان کی حمایت کی تھی۔ خلیفہ القائم نے آلپ آرْسلان کی حکومت تسلیم کر لی اور اسے وہ تمام امتیازات عطا کیے جو اس کے پیش رووں کو حاصل تھے۔ آلپ آرْسلان نے ہرات کے مقام پر اپنے چچا بیغو کو اطاعت اختیار کرنے پر مجبور کیا اور پھر چغری بیگ اور طُغرل بیگ کے ایک چچا زاد بھائی قُتُلْمُش کو شکست دی، جس نے کچھ عرصے سے اُن پہاڑوں میں، جو بحیرۂ خزر کے جنوب میں واقع ہیں، بغاوت برپا کر رکھی تھی۔ قُتُلْمُش اس جنگ میں ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ آلپ آرْسلان نے اپنے بڑے بھائی قاوُرد، والیِ کرمان، کے لیے بھی مشکلات پیدا کیں، جو موروثی حکومت میں کم از کم اپنا حصّہ وصول کرنے کا متمنّی تھا؛ چنانچہ اسی غرض سے اس نے آلپ آرْسلان کے مقابلے میں کُرد شیخ فضْلُویہ کی اعانت کی تھی۔ بعد ازاں، (۴۵۷ھ/ ۱۰۶۵ء، ۴۵۹ھ/ ۱۰۶۷ء اور ۴۶۱ھ/ ۱۰۶۹ء میں) آلپ آرْسلان نے براہ راست اس کے خلاف قدم اٹھایا اور فضْلُویہ کو، جو قاوُرد سے سمجھوتہ کر چکا تھا، چل کر فارس پر بڑے مستحکم طریق سے قابض ہو گیا۔ قاوُرد کو بدستور، اس شرط کے ساتھ، کرمان کا حاکم رہنے دیا گیا کہ وہ آلپ آرْسلان کا مطیع رہے۔ مملکتِ قراخانیہ میں اور بحیرۂ ارال تک کے علاقے میں اپنی فوجی قوّت کے ایک مظاہرے سے (۴۵۷ھ/ ۱۰۶۵ء) آلپ آرْسلان نے اُس اقتدار کو جو قبل ازیں وہاں اُس کے والد کو حاصل تھا تقویت پہنچائی۔ جہاں تک آلِ غزنہ کا تعلق ہے، آلپ آرْسلان نے اُس صلح نامے کی پابندی کی جو چغری بیگ کے عہد کے آخری ایام میں طے پایا تھا۔

بعد میں آنے والی نسلوں میں آلپ آرْسلان کی شہرت مغربی محاذ پر اُس کی سرگرمی کی مرہونِ منّت ہے۔ اپنے پیش رو طُغرل بیگ اور جانشین ملک شاہ کی طرح اُسے بھی ہوس تھی کہ مصر پر حملہ کر کے فاطمی رافضیّت کے اُس مستحکم مرکز کو تباہ و برباد کر کے رکھ دے لیکن اس کے ساتھ ہی اُسے اِس بات کا پورا احساس تھا کہ ترکمانوں پر اپنی سیادت قائم رکھنا کس قدر ضروری ہے، کیونکہ انھیں پر اس کے خانوادۂ شاہی کی فوجی قوّت کا دارومدار تھا اور ان کی اوّلین خواہش یہ تھی کہ آذربیجان کے پرے کی مسیحی مملکتوں میں، جہاں وہ ایک مرکز پر جمع ہو گئے تھے، حملے کیے جائیں تاکہ گراں بہا مالِ غنیمت ہاتھ آئے۔ یہی وجہ ہے کہ آلپ آرْسلان نے اپنی تخت نشینی کے کچھ ہی عرصہ بعد بوزنطیوں اور ان کے ارمنی اور گُرجستانی ہمسایوں کے خلاف مہمّات کا ایک سلسلہ شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ترکمانوں کے خودمختار جتھے ان علاقوں میں دور دور تک دھاوے مارنے لگے۔ ان مہمّوں کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ بعض قدیمی اسلامی حلقوں میں آلپ آرْسلان کا وقار بلند ہو گیا۔ ۴۵۶ھ/ ۱۰۶۴ء میں اس نے آنی اور قَرْص پر قبضہ کر لیا۔ اور یہ مختصر سی گُرجستانی سلطنت عہدِ اطاعت کرنے پر مجبور ہو گئی۔ گُرجستان پر مزید لشکرکشی، جس میں ارّان کے شدّادی فرمانرواؤں نے حصّہ لیا تھا، ۴۶۰ھ/ ۱۰۶۸ء میں ضروری ہو گئی۔ ان مہمّات سے جو بڑے فائدے حاصل ہوئے وہ یہ تھے کہ آذربیجان کی سرحدیں محفوظ و مستحکم ہو گئیں اور ترکمانوں کو رودِ ارس کی چراگاہوں سے مستفید ہونے کی آزادی حاصل ہو گئی۔ اس امر کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ترکمان، جو بیک وقت ایک طرف تو بوزنطی ایشیاے کوچک کے قلب تک پہنچ گئے تھے اور دوسری طرف دیارِ بکر اور دیارِ مُضر کی اسلامی مملکتوں میں داخل ہو گئے تھے، کس حد تک آلپ آرْسلان کے زیرِ ہدایت کام کر رہے تھے۔ بہرحال ترکمانوں نے آلپ آرْسلان کے لیے راہ کھول دی لیکن خود مالِ غنیمت بٹور کر پیچھے ہٹ آئے۔ مزید براں اُن کی سرگرمیوں سے برانگیختہ ہو کر بوزنطیوں نے اسلامی سلطنت کی شامی اور ارمنی سرحدوں پر جوابی حملہ کر دیا (۱۰۶۸-۱۰۶۹ء)، جس پر دونوں سلطنتوں کے درمیان گفت و شنید کا آغاز ہو گیا۔

بوزنطیوں کی طرف سے خود کو خاصا محفوظ تصوّر کرنے کے بعد آلپ آرْسلان نے اب حکومتِ مصر کے باغیوں کی درخواست پر کان دھرے اور خلافتِ بغداد اور

عقائد اہلِ السنّت والجماعت کی حمایت میں فاطمیوں کے خلاف لشکر کشی کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ راستے میں اس نے اَرْجیش اور ملاذْ گِرْد (Mantzikert) کو، جن پر بوزنطیوں نے قبضہ کیا ہوا تھا، اپنے تصرّف میں لے لیا، الرُّھاء پر حملہ آور ہوا اور بلا تاخیر بڑھتا چلا گیا۔ حَلَب میں اس نے مِرداسی فرمانروا محمود کو مطیع کیا، جس نے عین آخری وقت خلافتِ عبّاسیّہ کو تسلیم کرکے اپنی جان بچانے کی کوشش کی تھی۔ سلطان آلُپ آرْسلان کا ارادہ جنوبی شام میں پیش قدمی کرنے کا تھا، جہاں مختلف ترکمانی جتھّے اس سے پہلے پہنچ چکے تھے کہ اسے خبر ملی کہ بوزنطی شہنشاہ رومانوس دیوجانس (Romanus Diogenes) ایک بہت بڑا لشکر لے کر اَرْمِینِیَہ میں اس کے عقب کو خطرے میں ڈال رہا ہے، ناچار اُسے پوری تیزی سے لوٹنا پڑا۔ [وقت کی کمی کے باوجود] اس نے کافی فوجیں مرتّب کرلیں اور ذوالقعدہ ۴۶۳ھ/ اگست ۱۰۷۱ء میں مَلاذْ گِرْد (Mantzikert) کے مقام پر بوزنطی لشکر سے معرکہ آرا ہوگیا۔ چونکہ بوزنطی فوجیں مختلف اقوام کے لوگوں پر مشتمل تھیں اور ہمت و جرأت کے اعتبار سے بھی اُن میں بڑا فرق تھا، اس پر مستزاد یہ کہ وہ فوجی داؤ پیچ سے بھی ناواقف تھیں، لہٰذا ان کا چست و چالاک ترکوں سے کوئی مقابلہ ہی نہ تھا، جو اُن کے مقابلے میں نسبۃً بہت قلیل التعداد ہونے کے باوجود جذبۂ جہاد سے سرشار تھے۔ شام ہوتے ہوتے بوزنطی لشکر تباہ و برباد ہوگیا اور تاریخ میں پہلی بار کسی بوزنطی شہنشاہ کو ایک مسلمان فرمانروا نے اپنا اسیر بنا لیا۔ آلُپ آرْسلان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ بوزنطی سلطنت کو نیست و نابود کردیا جائے، چنانچہ اس نے سرحدوں کی ترتیبِ جدید، خراج کے وعدوں اور دوستی کے معاہدے پر اکتفا کیا۔ لیکن یہ معاہدہ رومانوس دیوجانس کے زوال کی وجہ سے دیرپا ثابت نہ ہوا۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ جنگ ملازگرد سے ترکوں کی فتوحات کے لیے ایشیاے کوچک کا دروازہ کھل گیا۔ آنے والے ایّام میں ایشیاے کوچک کا کوئی شاہی خانوادہ ایسا نہ تھا جو اس امر پر فخر نہ محسوس کرتا ہو کہ اس کے اسلاف میں سے کسی نہ کسی نے اس عظیم الشّان معرکے میں حصّہ لیا تھا.

اس فتحِ عظیم کے بعد خود آلُپ آرْسلان کو موت کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ موت اس کے شایانِ شان نہ تھی۔ سلطنت کے دوسرے سرے پر قرہ خانیوں کے ساتھ شادیوں کے ذریعے اتحاد قائم ہوگیا تھا مگر اس کے باجود ایک بار پھر بگاڑ پیدا ہوگیا۔ اوائلِ ۴۶۵ھ/ اواخرِ ۱۰۷۲ء میں آلُپ آرْسلان نے ان کے ملک پر حملہ کیا۔ ایک قیدی سے جھگڑے کے دوران میں آلُپ آرْسلان اس کے ہاتھوں مہلک طور پر زخمی ہوا اور اواخرِ ربیع الاوّل ۴۶۵ھ/ [اوسط دسمبر ۱۰۷۲ھ] میں اس نے عین عالمِ جوانی میں اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کردی۔ اس نے اپنے بیٹے مَلِک شاہ کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا.

سنّی مسلمانوں کی نظر میں آلُپ آرْسلان ایک ایسا قائد اور سپہ سالار تھا جو نظم وضبط قائم رکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا، کریم النّفس، انصاف پرور اور دیندار تھا اور مخبروں سے متنفّر تھا۔ عیسائی آنی کے قتلِ عام جیسے واقعات کے پیشِ نظر اسے قَسّی القلب گردانتے اور اس کے مقابلے میں اس کے بیٹے مَلِک شاہ کے بارے میں نسبۃً اچھی راے کا اظہار کرتے تھے۔ یہاں اس کی گنجائش نہیں کہ اس کے نظم ونسق کے بارے میں قلم اٹھایا جائے، جو دراصل اس کے وزیر نظام الملک کا کارنامہ تھا۔ اس پر مفصّل بحث مقالۂ نظام الملک اور آلِ سلجوق کے عمومی مقالے میں کی گئی ہے۔ خراسانی [مذکور، یعنی نظام الملک] پر آلُپ آرْسلان ہی کی نظرِ انتخاب پڑی تھی، جو بہت جلد شہرت کے مدارج طے کرکے مَلِک شاہ کے عہد میں سلطنت کا حقیقی مختارِ کلّ بنا۔ ہوسکتا ہے کہ الکُنْدُری کی سزاے موت میں سلطان کے نئے وزیر کا اثر کارفرما ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ آلُپ آرْسلان نے انتہائی عروج حاصل کرنے کے بعد بھی بغداد میں قدم رکھنے سے قصدًا احتراز کیا کہ مبادا خلیفہ یا عراقی عربوں سے اس قسم کے پریشان کن اور فضول جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوں جن کے باعث طُغْرِل بیگ کے عہد کے آخری سالوں میں طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہوچکی تھیں۔ دوسری طرف اُس نے عراق میں حقوقِ سلطنت کی تکمیل واجرا میں بڑی مستعدی سے کام لیا۔ اسے اپنی سلطنت کی سرحدوں پر عُقَیلیّہ، موصل اور شدّادیۂ ارّان جیسی متوسّل ریاستوں کے قائم رہنے پر کوئی اعتراض نہ تھا، لیکن ان پر وہ بڑی کڑی نظر رکھتا تھا اور اس سلسلے میں بصرے کی ہزاراسپی ریاست کا نام بطورِ مثال لیا جاسکتا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ اس جانب سے بھی کسی قسم کی عہد شکنی کا روادار نہیں تھا۔ آلُپ آرْسلان نے خراسان میں آلِ سلجوق کے قدیمی مقبوضات کو اپنے خاندان کے ممتاز شہزادوں میں مختلف جاگیروں کی صورت میں بانٹ دیا تھا۔ اُس کے اِس اقدام کو سمجھنے کے لیے مذکورۂ بالا حالات، نیز اس جذبۂ احترام کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے جو اس کے دل میں قبائلی تنظیم سے موروث خاندانی روایات کے لیے موجود تھا.

جہاں تک ثقافت کا تعلّق ہے، آلُپ آرْسلان کا عہد روایتی اسلامی یا ترکی نقطۂ نظر سے کچھ زیادہ اہمّ نظر نہیں آتا۔ ہاں اس امر کا ذکر شاید دلچسپی کا موجب ہو کہ آلُپ آرْسلان کے لیے ایک کتاب مَلِک نامہ تصنیف ہوئی تھی، جس میں کسی گمنام مصنّف نے آلِ سلجوق کی اصل کا تاریخی اعتبار سے سراغ لگانے اور اسے مکرّر ترکیب دینے کی خواہش کی تھی (قبّ کاہین در *Oriens*، ۱۹۴۹ء).

مآخذ: مآخذ کی جامع تر فہرست مادّۂ سلجوق (آل) کے تحت ملے گی۔ اہم ترین وقائع نامے یہ ہیں: (۱) از عمادالدین الاصفہانی (در نسخۂ البُنداری، طبع ہُوتُسما: *Recueil*، ج ۲)؛ (۲) گمنام مصنّف کی اخبار الدولۃ السلجوقیّۃ، (طبع محمد اقبال، لاہور ۱۹۳۳ء)؛ (۳) الرّاوندی: راحت الصُّدور، طبع محمد اقبال، ۱۹۲۱ء؛ (۴) ابن الأثیر: الکامل؛ اور ایک تصنیف جو اکثر نظر انداز ہوتی رہی ہے، یعنی (۵) سبط ابن الجوزی: مرآۃ الزمان (جس میں سے متعلّقہ فصول عنقریب شائع ہوں گی)۔ دیگر قسم کی کتابوں میں اہمّ ترین تصانیف (۶) ابن البلخی: فارس نامہ؛ اور (۷) نظام الملک:

سیاست نامہ ہیں۔ بوزنطی، سریانی، آرامی اور گرجستانی مآخذ کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیے۔ زمانۂ مابعد کی ایرانی تاریخیں ناقابلِ اعتماد تصور ہونی چاہئیں۔ عہدِ حاضر میں آلپ آرسلان یا آلِ سلجوق پر کوئی جامع کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔ بلادِ مشرق میں ان کی سرگرمیوں کے بارے میں ایک ماہرانہ بیان کے لیے دیکھیے (۸) Barthold : *Turkestan*؛ بلادِ مغرب میں ان کی سرگرمیوں کے بارے میں عام رہنمائی حاصل کرنے کے لیے دیکھیے (۹) E. Honigmann: *Die Ostgrenze des byzantinischen Reiches*، برسلز ۱۹۳۵ء؛ (۱۰) Cl. Cahen: *La première pénétration turque en Asie-Mineure*، در *Byzantion*، ۱۹۴۸ء؛ اور (۱۱) V. Minorsky: *Studies in Caucasian History*، کیمبرج ۱۹۵۳ء؛ (۱۲) Cl. Cahen نے *History of the Crusades*، فلاڈلفیا ۱۹۵۵ء، ص ۱۳۵-۱۷۶ میں آلِ سلجوق کی تاریخ کا ایک ہنگامی اور عارضی جائزہ پیش کیا ہے.

(کاہین Cl. CAHEN)

⊗ **آلُپ آرسلان** (۲): [اَلُپ اَرسلان] محمد بن داؤد (چَغرِی بیگ) عضُد الدولہ [۴۵۵ھ/۱۰۶۳ء - ۴۶۵ھ/۱۰۷۳ء]، کنیت ابوشجاع، مشہور سلجوقی حکمران، وہ یکم محرم ۴۲۰ھ/۲۰ کانون ثانی (جنوری) ۱۰۲۹ء کو اور بعض کے نزدیک ۴۲۴ھ کو پیدا ہوا۔ اپنے باپ کی زندگی ہی میں وہ بہادر و ہنرمند سردار کی حیثیت سے نام پیدا کر چکا تھا۔ بہت سی مہموں میں کامیابی سے حصّہ لینے کے باعث اس کے باپ نے اُسے خراسان کا ولی عہد مقرّر کر دیا۔ اس کی تخت نشینی کی صحیح تاریخ متعیّن کرنا ممکن نہیں، کیوں کہ اسناد سے معلوم ہوتا ہے کہ چَغرِی بیگ کی وفات بعض کے نزدیک ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں اور بعض کی رائے میں ۴۵۱ھ بلکہ ۴۵۲ھ/۱۰۶۰ء میں واقع ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی قریب قریب یقینی ہے کہ اپنے باپ کے عہدِ حکومت کے آخری سالوں میں درحقیقت آلپ آرسلان ہی ملک کا حکمران تھا۔ اس کے بعد اس کا چچا طُغرِل بیگ ۴۵۵ھ/ ایلول (ستمبر ۱۰۶۳ء) میں لاولد مر گیا اور اس کے وزیر الکُندُرِی [رکّ بآن در آ، ترکی] نے یہ اعلان کر کے کہ طُغرِل بیگ نے آلپ آرسلان کے [سوتیلے] بھائی سلیمان کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا اسے تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن بہت سے ترکی سرداروں نے اُس کی مخالفت کی اور آلپ آرسلان سے بیعت کر لی۔ وزیر الکُندُری نے بھی اظہارِ اطاعت میں تاخیر نہ کی اور خلیفہ [بغداد] القائم بامراللہ نے ۷ جمادی الاولیٰ ۴۵۶ھ/۲۷ نیسان (اپریل) ۱۰۶۴ء کو ایک مجلس منعقد کی، جس میں آلپ آرسلان کی سلطانی کا اعلان نہایت شان و شوکت [اور اس کے پیش رو کے تمام امتیازات] کے ساتھ کر دیا گیا۔ اس کے باوجود آلپ آرسلان کے بعض قریبی رشتہ دار اُس کی اطاعت پر آمادہ نہ تھے، بلکہ خود سلطان بننا چاہتے تھے اور ان میں سے قوی ترین امرا کی سرکوبی کرنا باقی تھا مگر آلپ آرسلان کی عسکری برتری میں کوئی شُبہ نہ تھا، چنانچہ اس نے نہایت سرعت اور مستعدّی سے کام لے کر بغاوتوں کی بیخ کنی کر دی، لیکن اسے آخر میں اپنے اقربا میں سے باغیوں کے سب سے بڑے سردار قُتُلمُش [رکّ بآن، در آ، ترکی] کا شدید اور خطرناک مقابلہ کرنا پڑا۔ جیسے ہی یہ شخص ایک جنگ میں مارا گیا ویسے ہی آلپ آرسلان اپنی فوج لے کر ربیع الاوّل ۴۵۶ھ/فروری ۱۰۶۴ء میں بوزنطی سرحد پر پہنچ گیا۔ راستے میں بہت سے امیر اور بیگ اس کے ساتھ ہو گئے؛ چنانچہ اس نے ایک لشکرِ جرّار کے ساتھ گرجستان پر حملہ کیا۔ بہت سے شہروں پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے بادشاہوں پر گراں سنگ خراج عائد کرنے کے بعد قارص اور آنی [رکّ بآن] پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس اثنا میں اس کے بھائی قاوُرد [رکّ بآن] (کرمان کے سلاجقہ کے مُورثِ اعلیٰ) نے باغیوں کی سی روش اختیار کر لی اور آلپ آرسلان کو مزید پیش قدمی روک دینا پڑی۔ آلپ آرسلان پے بہ پے منزلیں طے کرتا ہو براہِ اِصفہان کرمان پہنچ گیا اور قاوُرد اس غیر متوقع اقدام سے ایسا گھبرایا کہ اس نے اطاعت قبول کر لی۔ اس کے بعد آلپ آرسلان مَرْو گیا، جہاں اس نے اپنے بیٹوں ملک شاہ اور آرسلان شاہ کی شادیاں غزنوی اور ترکی خاقانوں کی شہزادیوں سے کر دیں اور اس طرح اپنی حکومت کے استحکام کا سامان کیا۔ اس کے دوسرے سال ۴۵۷ھ/[۱۰۶۵ء] میں اس نے آمو دریا کو عبور کر کے [بحیرۂ اَرال تک] اُس علاقے کے بادشاہوں کے ساتھ تعلّقات قائم کیے اور اس کے بعد مرو واپس آ گیا۔ اُس نے اپنے بیٹے مَلِک شاہ کو اپنا جانشین مقرّر کیا اور قلمرو کی مختلف ولایات سلجوقی امرا میں تقسیم کر دیں۔ ۴۵۹ھ میں کرمان کے حاکم نے پھر سرکشی اختیار کی اور آلپ آرسلان کو اس کے خلاف نئے سرے سے فوج کشی کرنا پڑی.

اسی سال آلپ آرسلان نے ایک طرف تو بذاتِ خود بحیرۂ اَرال کے شمال اور مشرق میں رہنے والی ترک قوموں اور قبائل کو زیرِ نگین کیا اور دوسری طرف ان امرا میں سے جو اس کے ہمراہ تھے بعض بیگوں کو آناطولی پر تاخت کرنے کا حکم دیا۔ ان میں سے گُمُش تگین، اَفشین اور احمد شاہ نے دجلہ اور فرات کے درمیان مشرقی آناطولی کے علاقے میں بہت سی کامیابیاں حاصل کیں۔ ۱۰۶۷ء میں سرحدِ آناطولی کے سپہ سالار اَفشین نے مَلَطِیہ کے نواح میں بوزنطی سلطنت کی ایک فوج کو ہزیمت دی اور قیصریّہ پر قبضہ کر کے اپنی یلغار وسطی آناطولی تک جاری رکھی اور پھر کِلِیکِیہ (Cilicia) کے راستے واپس لوٹا۔ ۱۰۶۸ء میں سلطان آلپ آرسلان دریائے اَرَس کو دوسری دفعہ عبور کر کے گرجستان میں داخل ہو گیا۔ گرجستان کے بادشاہ بغرات (Bagrat) نے سلطان کی سیادت تسلیم کر لی۔ اس کے بعد آلپ آرسلان خود تو خراسان واپس آ گیا لیکن شہزادوں اور بعض امیروں کو غزا کے لیے آناطولی بھیج دیا۔ ان شہزادوں میں ایک قُرِدجی تھا، جو اِرِیسْغُن کا بیٹا اور سلطان کا عم زاد بھائی اور بہنوئی بھی تھا۔ نئے بوزنطی شہنشاہ رومانُوس دیوجانس (Romanus Diogenes) نے ترکوں کے حملوں کو روکنے کے لیے خود فوج

کشی کی اور چند بے نتیجہ سی فتوحات بھی حاصل کیں۔ ۱۰۶۹ء میں اس نے مشرق کی طرف کوچ کیا۔ مقصد یہ تھا کہ امراے سلطانی کے روز افزوں حملوں کو روک دے اور ان کے جنگی مرکز اَخلاط پر قبضہ کر لے، لیکن جب وہ پالُو کے مقام پر پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ جس فوج کو وہ مَلَطیَہ میں چھوڑ آیا تھا وہ جنوب سے حملہ کرنے والے ترکی لشکر کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو چکی ہے اور کچھ مدّت بعد یہ خبر آئی کہ ترکی فوج نے قونیہ بھی لے لیا ہے۔ چنانچہ اس پر شہنشاہ واپس جانے پر مجبور ہو گیا۔

۱۰۷۰ء میں شہنشاہ نے مانوئل قومنِنُس (Manuel Comnen) کو ترکی حملوں کے سدِّ باب پر مامور کیا، لیکن سلطان کے بہنوئی قُرتِجی نے اسے شکست دے کر قیدی بنا لیا۔ لیکن پھر اس شہزادے نے خود سلطان کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کر دیا اور ترکمانوں کے ان قبائل میں سے جو اُس کے گرد و پیش جمع ہو گئے تھے قبیلہ [ایوہ؟] Yivek کو ساتھ لے کر اندرونِ آناطولی کی طرف کوچ کیا۔ سلطان نے اَفشِین کو اس شہزادے کے تعاقب پر مامور کیا۔ اس پر شہزادہ قُرتِجی نے مانوئل قومنِنُس اور دوسرے گرفتار شدہ بوزنطی سرداروں کو رہا کر کے ان سے اتحاد کر لیا اور اَفشِین سے بچنے کی خاطر انھیں اور اپنے تمام متوسّلین کو ساتھ لے کر شہنشاہ سے حفاظت کا طالب ہوا اور بذاتِ خود قُسطَنطِینِیَہ پہنچ گیا۔ اَفشِین نے آناطولی میں اپنی یلغار جاری رکھی اور قاپادوقیہ (Capadocia) [قُبادق] میں بہت سے مراکز پر قبضہ کر لینے کے بعد ولایتِ فریجیہ میں داخل ہوا اور خُونَاس (Honas) موجودہ خُنَس اور [موجودہ شہر دِنگزِلی] کے قریب لاذِق یا لاذِقِیَّہ (Laodicea) [دیکھیے لی سٹرینج، ص ۵۳] پر قبضہ کرنے کے بعد بحیرۂ اِیجَہ کے سواحل تک چھاپے مارتا چلا گیا، لیکن شہزادۂ قُرتِجی کو گرفتار نہ کر سکا۔ اس وقت سلطان آلپ آرسلان خراسان میں تھا اور مصر پر حملے کی تیاریاں کر رہا تھا، کیونکہ بعض مصری امرا نے اس سے حملے کی درخواست کی تھی [اور وہ فاطمیوں کو ختم کرنا چاہتا تھا]۔ ۱۰۷۰ء کے وسط میں وہ اپنی تمام مشرقی افواج کے ساتھ آذربیجان پہنچا اور جھیل وان کے شمال سے گھوم کر مَلاذْ کِرْد کے سامنے آیا۔ اور اس مستحکم شہر پر، جسے اپنے وقت میں اس کا چچا طُغرِل بیگ سر نہ کر سکا تھا، اس نے آسانی سے قبضہ کر لیا۔ پھر جنوب کی طرف اپنی یلغار جاری رکھی اور دجلہ اور اس کے معاون دریاے مراد کے طاس کے دوسرے مقامات اور قلعوں پر، جنھیں تُرک اب تک نہ لے سکے تھے، قبضہ کر لیا۔ آخر سلطان مَیّافارِقین اور آمد پہنچ گیا۔ علاقۂ دیارِ بکر کے حکمران نَصر اور سعید دو بھائیوں نے، جو "مروان اوغول لَر" کے قبیلے سے تعلّق رکھتے تھے، حاضر ہو کر سلطان کا استقبال کیا اور اس سے امارت کا منشور حاصل کیا۔ اس کے بعد سلطان الجزیرہ کے علاقے میں آیا اور سویداء تک پہنچنے کی غرض سے بہت سے قلعے فتح کیے۔ پھر پچاس دن تک اورفہ [الرُّہا] کا محاصرہ کرنے کے بعد حلَب کی طرف متوجّہ ہوا اور ۱۰۷۱ء کے آغاز میں فُرات کو عبور کر کے حلب کے سامنے جا پہنچا۔ چونکہ اس شہر کا حکمران محمود خوف کی وجہ سے سلطان کا استقبال باہر نکل کر نہ کر سکا اس لیے سلطان نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن آخر میں جب محمود نکل کر باہر آیا اور واجبی تعظیم و تکریم بجا لایا تو سلطان نے شہر کو لینے کا قصد ترک کر دیا۔ اُن مہینوں کے دوران میں، جب سلطان حلب کے سامنے مقیم تھا، بوزنطی سفیر حاضر ہوا اور مصالحت اور دوستی کی بات چیت کرنے کے بعد ضمانت پیش کی اور واپس چلا گیا۔ کچھ مدّت بعد آلپ آرسلان مصر کو فتح کرنے کے ارادے سے حلَب چلا، لیکن ایک دن کے کُوچ کے بعد ہی معلوم ہوا کہ بوزنطی شہنشاہ فوج لے کر مشرق کی طرف آ رہا ہے اور سلطان کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر پہلے مشرقی آناطولی کے علاقوں کو دوبارہ فتح کرنا چاہتا ہے اور پھر ایران اور آذربیجان پر قبضے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس پر آلپ آرسلان نے فوج کے ایک حصّے کو شام کی تسخیر کے لیے پیچھے چھوڑا اور باقی فوج کے ساتھ واپس ہو کر دجلے کو عبور کیا اور دیارِ بکر کے راستے اَخلاط کی طرف کوچ کر کے بوزنطی شہنشاہ کے مقابلے میں پہنچ گیا، جس نے کچھ پہلے آ کر مَلاذْ کِرْد پر قبضہ کر لیا تھا۔ مَلاذْ کِرْد کے میدان میں ۲۷ ذی القعدہ ۴۶۳ھ/ ۲۶ اگست ۱۰۷۱ء کو جنگ ہوئی، جس کا خاتمہ آلپ آرسلان کی مکمل فتح اور قیصر رُومانوس دِیوجانِس (Romanus Diogenes) کی گرفتاری پر ہوا۔ اس جنگ میں سلطان کی فوج چوّن ہزار سپاہیوں تک پہنچ گئی تھی، جس میں چار ہزار ترک ممالیک، زعامت کی فوج [یعنی خراج گزار امرا کی فوج] کے چالیس ہزار باقاعدہ سوار اور کوئی دس ہزار رضاکار شامل تھے۔ بوزنطی شہنشاہ کی فوجی تعداد اس سے کم از کم دگنی تھی۔ یہ فتح ترکی اور اسلامی تاریخ کے اہم ترین واقعات میں سے ہے اور اس سے پورے آناطولی کا راستہ تُرک آبادکاری کے لیے کھل گیا۔ اس فتح کی وجہ سے آلپ آرسلان کو تمام تاریخِ اسلامی میں ایک بے نظیر مقام حاصل ہو گیا اور وہ اسلام کے عظیم فاتحین اور غازیوں میں شمار ہونے لگا۔

سلطان نے قیدی قیصر سے خسروانہ سلوک کیا اور مختصر سی قید کے بعد اُسے محافظ دستے کے ساتھ آناطولی واپس بھیج دیا، لیکن جس معاہدۂ صلح پر دستخط ہوے تھے وہ بے نتیجہ رہا، کیونکہ جب دیوجانِس واپس گیا تو بوزنطی شہنشاہی پر میخائیل ہشتم (Miḥael VIII) قابض ہو چکا تھا۔ بوزنطیہ کے خلاف جو جنگ شروع ہوئی تھی اس کی قیادت آلپ آرسلان بذاتِ خود جاری نہ رکھ سکا، بلکہ مئی ۱۰۷۲ء میں اس نے ماوراء النہر کو عبور کیا اور یہاں ایک قلعہ دار نے، جسے سلطان نے جنگ میں قیدی بنایا تھا، سلطان کو بری طرح زخمی کر دیا۔ چنانچہ چند روز بعد اس زخم کی وجہ سے نومبر [دسمبر؟] ۱۰۷۲ء میں وہ چالیس یا پینتالیس برس کی عمر میں انتقال کر گیا۔ آلپ آرسلان اپنی بلند ہمّتی اور شجاعت کی وجہ سے ممتاز تھا۔ اس نے بوزنطی شہنشاہ اور اپنے بھائی قاوُرد سے جس حسنِ سلوک کا ثبوت دیا اُس سے اُس کے بلند اور شریفانہ کردار کا پتا چلتا ہے۔ اس کے باوجود کہ وہ تعلیم سے محروم تھا اور غالبًا پڑھنا بھی نہ جانتا تھا لیکن اس کی ذہانت اور فراست کا یہ ثبوت ہے کہ اس نے اپنے وزیر نظام الملک کے خلاف اتہامات کی جانب اعتنا نہ کیا بلکہ تمام امورِ سلطنت اسی کی تحویل میں رہنے دیے۔

مآخذ: (۱) *Rec. de textes relát.à l'hist. des Seldjoucides*،

(شائع کردہ ہوتسما Houtsma)، ۲: ۱۶ ببعد؛ (۲) ابن الأثیر (طبع .Tornb)، [ج] ۹ و۱۰؛ (۳) میر خواند: *Hist. Seldschukidarum* (طبع Vullers)؛ (۴) حمداللہ مُستوفی: تاریخ گزیدہ (طبع Gantin)؛ (۵) الحُسینی (طبع Süssheim)، ص ۴۵ ببعد؛ (۶) ابن خلّکان (بولاق ۱۲۹۹ھ)، ۲: ۴۴۲؛ (۷) نظام الملک: سیاست نامہ (مرتبۂ Schefer)، ضمیمہ، ص ۹۵-۱۰۲؛ (۸) Weil: *Gesch. de Chalifen*، ۳: ۸۵ ببعد؛ (۹) Müller: *Der Islam im Morgen-und Abendland*، ۲: ۸۶ ببعد؛ (۱۰) بارٹولڈ (Barthold): *Turkestan v epohu mongolsk. naşestv*، ۲: ۳۲۴ ببعد؛ (۱۱) von Rosen: *Zapiski vostoc. otd. imper. russk. arheol. obşc*، ۱: ۱۹، ۱۸۹، ۲۴۸؛ (سلطان آلپ آرسلان کے متعلق مآخذ کی مفصل فہرست کے لیے دیکھیے (۱۲) مُکرِمین خلیل: انادولونون فتحی، استانبول ۱۹۳۴ء، ص ۵۰ ببعد، [اس مقالے میں مُکرِمین خلیل ینانچ نے تصحیح و توسیع کی ہے].

[از آآ، ترکی]

----

* **آلپتکِین**: [اَلپ تِگین] دولت غزنویہ کا بانی، اپنے زمانے کے بہت سے عسکری امرا کی طرح وہ بھی تُرک غلام تھا، جسے خرید کر سامانی بادشاہوں کی فوجِ خاصّہ [باڈی گارڈ] میں بھرتی کیا گیا اور پھر وہ بتدریج ترقّی کرتے کرتے حاجب الحُجّاب (یعنی فوجِ خاصّہ کے سپہ سالار) کے منصب پر فائز ہو گیا۔ اس سپہ سالاری کی حیثیّت سے سامانی خاندان کے نوجوان بادشاہ عبدالمَلِک اوّل کے دورِ حکومت میں اختیارات کی باگ ڈور دراصل اُسی کے ہاتھ میں تھی؛ وزارت کے عہدے پر ابوعلی البَلعَمی کی تقرّری اُسی کی وجہ سے ہوئی اور چونکہ بَلعَمی اپنی تقرّری کے لیے اس کا رہینِ منّت تھا، وہ کبھی آلپ تِگین کے ''مشورے اور علم کے بغیر'' کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کرتا تھا اُسے دارالسلطنت سے دور کرنے کی غرض سے بادشاہ نے اُسے والیِ خراسان مقرّر کر دیا (ذوالحجہ ۳۴۹ھ/جنوری-فروری ۹۶۱ء).

یہ عہدہ اُس وقت سلطنت میں سب سے بڑا عسکری عہدہ متصوّر رہوتا تھا۔ جب شاہ منصور ابنِ نوح نے، جس کی تخت نشینی کی اِس نے مخالفت کی تھی، اُسے اِس عہدے سے برطرف کر دیا تو وہ بلخ کی طرف ہٹ آیا۔ ربیع الاوّل ۳۵۱ھ/اپریل-مئی ۹۶۲ء میں اُس نے سامانی فرمانروا کے لشکر کو، جو اُس کے خلاف بھیجا گیا تھا، شکست دی اور خود غزنہ جا پہنچا، جہاں اس نے مقامی حکمران خاندان کو معزول کر کے ایک خود مختار شہنشاہیت کی بنیاد ڈالی۔ اُس کی وفات کی تاریخ کے بارے میں مؤرّخین میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک وہ ۳۵۲ھ/۹۶۳ء سے پیشتر وفات پا گیا۔ اس کا عالم فاضل بیٹا ابواسحٰق ابراہیم (اس کے حال کے لیے دیکھیے ابن حوقل، [طبع ڈخویہ de Goeje، ص ۱۳ ببعد]) غزنہ کے سابق فرمانروا کی بغاوت کے موقع پر صرف سامانیوں کی اعانت ہی سے اپنا تاج و تخت سلامت رکھ سکا۔ گویا اوّل اوّل غزنوی سلطنت کا وجود سامانیوں کے [کی] باج گزار ریاست ہی کی حیثیت سے تھا۔ ابواسحٰق لاولد مر گیا تو فوج کے (جس کے بل بوتے پر یہ نوزائیدہ سلطنت قائم تھی) قائدین نے فوجِ خاصّہ کے سردار بِلْگا تکِین (تِگین) (۳۵۵-۳۶۴ھ/۹۶۶-۹۷۴ء) کو اس کا جانشین منتخب کیا، اس کی امانت و دیانت کی یاد دلوں میں باقی رہی۔ اس کے بعد پِری تکِین (تِگین) کو منتخب کیا گیا۔ اس کے عہدِ حکومت میں سابق حکمران خاندان کے حامیوں کی آخری بغاوت کا قلع قمع کر دیا گیا لیکن لشکر نے اس بغاوت کے دبانے والے فاتح سُبُکتکِین [سُبُکتگِین] کو، جو آلپ تکِین کا داماد اور سابق سردارِ اعظم تھا، تخت نشین کر دیا (شعبان ۳۶۶ھ/اپریل ۹۷۷ء) اور وہی غزنوی [رکّ بہ غزنویہ] خاندان کا بانی ہوا.

مآخذ: آلپ تکِین اور اس کے متصل بعد آنے والے جانشینوں کی ایک مختصر مگر جامع تاریخ جس میں تمام مآخذ بھی جمع کر دیے گئے ہیں (۱) محمد ناظم کی کتاب *The life and times of Sultān Maḥmūd of Ghazna*، کیمبرج ۱۹۳۱ء، باب اوّل میں ملے گی۔ بڑے بڑے مآخذ یہ ہیں: (۲) گَرْدِیزی: زَین الأخبار، طبع محمد ناظم، برلن ۱۹۲۸ء اور (۳) جُوزْ جانی: طبقاتِ ناصری؛ (۴) نظام الملک کے بیانات سیاست نامہ (طبع شیفر Schefer)، ص ۹۵-۱۰۱ میں۔ اس کتاب میں آلپ تکِین اور سُبُکتکِین کو مثالی حکمران ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کے کردار کے روشن پہلو ہی اجاگر کیے گئے ہیں۔ غزنی کی نئی حکومت کے وجود میں آنے سے سرحدِ سیستان پر جو اثرات پڑے اُن کا مطالعہ کرنے کے لیے محمد ناظم کے مآخذ کے علاوہ دیکھیے (۵) مصنّف نامعلوم: تاریخ سیستان، طبع بہار، تہران ۱۳۱۴ش، ص ۳۲۶ ببعد.

(بارٹولڈ W. BARTHOLD - [کاہن CL. CAHEN])

----

* **آلپامیش** (Alpamīsh): [اَلپامِیش] وسطِ ایشیا کی مشہور ترین ترکی داستانوں میں سے ہے، جس کی تخلیق دو قدیم موضوعوں کی مرہونِ منّت ہے: (۱) منگیتر کی جستجو اور چاہنے والوں کی رقابت؛ (۲) بیوی کی دوبارہ شادی کے دن اس کے شوہر کی مراجعت (یُولِسّیز (Ulysses) کی واپسی کا موضوع یہی ہے)۔ آلپامِیش نامی ایک اوزبک قہرمان، جس کی قوم قونگُورات (Kungurat) ہے، اپنی بنتِ عمّ اور منگیتر بارْچِین کی تلاش میں قالُمِیق کے علاقے میں پہنچتا ہے اور اپنے قالُمِیق رقیبوں پر غالب آتا ہے اور بارْچِین سے شادی کر کے اُسے اپنی قوم میں واپس لے آتا ہے۔ اس داستان کے دوسرے حصّے میں آلپامِیش کی ایک اَور مہمّ کا حال بیان ہوا ہے، جس میں وہ قالُمِیق کے علاقے میں اپنی بیوی کے باپ کو چھڑا لانے کے لیے جاتا ہے۔ اسے قالُمِیق خان گرفتار کر لیتا ہے اور سات سال تک قید میں رکھتا ہے۔ آخرکار وہ خان کی بیٹی کی اعانت سے رہائی حاصل کرتا ہے اور عین اسی دن اپنے وطنِ مألوف میں واپس پہنچتا ہے جس دن اس کی بیوی کی مرضی کے خلاف اس کی شادی ایک غلام کے لڑکے کے ساتھ ہو رہی تھی، جس نے آلپامِیش کے اقتدار کو غصب کر لیا تھا۔ آلپامِیش اس غاصب کو قتل کر دیتا ہے اور از سرِنو اپنی قوم کی سرداری حاصل کر لیتا ہے.

آلپامیش کی تالیف کی صحیح تاریخ کا پتا لگانا دشوار ہے، اگرچہ یہ تاریخ سولھویں صدی کے آغاز سے پہلے یا سترھویں صدی کے اختتام کے بعد نہیں ہو سکتی۔ داستان میں قُونگُورات قوم تحصیل بَیسُون (Baysun) کے آس پاس ترمِذ کے شمال میں (جواب جنوبی اُوزبکستان کا ضلع سُرخان دریا ہے) خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے دکھائی گئی ہے۔ قُونگُورات قوم صرف ۱۵۰۰ء کے قریب شیبانی خان کی فوجوں کے ساتھ اس علاقے میں آئی تھی۔ داستان کی تینوں روایتوں یعنی اُوزبکی، قازاقی اور قرہ قلپاقی میں آلپامیش اور قُونگُورات کو اُوزبک کہا گیا ہے، جس سے یہ لازمًا نتیجہ نکلتا ہے کہ داستان کی ابتدا شیبانی فتوحات کے بعد ہوئی۔ دوسری طرف اس حماسی داستان کے اصل موضوع یعنی قالمیق 'کُفّار' کے خلاف مسلمان خانہ بدوش تُرکوں کی جنگ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ سولھویں اور سترھویں صدی کے درمیان پیش آیا تھا جب کہ اویرات سلطنت کے قالمیقوں نے وسط ایشیا میں خون ریز حملوں کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا۔

ژِرمُنسکی (Zirmunskiy) اور ظریفوف (Zarifov) یقین کرتے ہیں کہ آلپامیش کی موجودہ روایتوں کی تہ میں ایک زیادہ قدیم روایت کا سراغ لگایا جا سکتا ہے جو اس وقت ناپید ہو چکی ہے اور جس کی تاریخ گیارھویں۔ بارھویں صدی تک جاتی ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ قُونگُورات قوم کے اجداد بحیرۂ ارال کے آس پاس خانہ بدوشی کی زندگی بسر کر رہے تھے (اوغوز قوم کی نظم بَمسی بَیرک (Bamsi-Bayrek) پر قیاس کرتے ہوئے) یا اس سے بھی قدیم تر زمانے سے تعلق رکھتی ہے، جب کہ یہ لوگ کوہِ آلتائی کے دامن میں آباد تھے (منگولی نظم خان خَرَنگُوئی (Khān Kharangui) پر قیاس کرتے ہوئے)۔

آلپامیش کی سب وسط ایشیائی روایتیں نظم میں ہیں۔ نثر کے ٹکڑے صرف نظم کے مختلف واقعات کو منفصل کرنے کے لیے آجاتے ہیں۔ نظم کی ساخت سادہ رکھی گئی ہے۔ ایک ہی قافیے کے اعادے و تکرار سے نظم مختلف طول کے بندوں میں بٹ جاتی ہے (ہر بند میں دو چار سے لے کر دس پندرہ بیت ہیں)۔ یہ سادہ اندازِ شاعری اس طریقے کے لیے نہایت موزوں ہے جس کے ذریعے یہ نظم روایت کی جاتی ہے، یعنی یا تو اسے کوئی 'بخشی' (='بھاٹ') پڑھ کر سناتا ہے یا کوئی 'شاعر' ('مطرب') اسے قُوبوز (دوتارے) کے ساتھ گاتا ہے۔

آلپامیش کی متعدد روایتیں اس وقت موجود ہیں: اوزبکی، قازاقی، قرہ قالپاقی، جو ایک دوسرے سے خاصی مطابقت رکھتی ہیں لیکن جزئیات میں کہیں کہیں مگر نمایاں اختلافات بھی ہیں۔ سب سے اچھی اور سب سے زیادہ مقبول روایت اُوزبکی ''بخشی'' فاضل (فاضِیل Fazyl) یُولداش کی ہے۔ (یہ شخص ۱۸۷۳ء میں سمرقند کے قریب قِیشلاق لَیک ضلع بولونگر میں پیدا ہوا تھا)۔ اس کا متن سب سے پہلے قدرے اختصار کے ساتھ حامد علیم جان نے ۱۹۳۹ء میں ''یُولداش اوغلی فاضِیل: آلپامِیش'' کے نام سے تاشقند سے شائع کیا تھا۔ اس کتاب کے پہلے حصے کی مختصر صورت کا منظوم ترجمہ (V. V. Deržavin) اور (A. S. Kočetov) نے روسی زبان میں شائع کیا اور دوسرے حصے کے مکمل متن کا ترجمہ (L. M. Pen'kovskiy) نے کیا۔ یہ دونوں ترجمے، جو علیم جان کے متن پر مبنی ہیں اور جن کا پیش لفظ V. M. Žirmunskiy کے قلم سے ہے، ۱۹۴۴ء میں ''فاضِیل یُولداش: آلپامِیش'' کے نام سے تاشقند میں شائع ہوئے۔ بالآخر L. M. Pen'kovskiy نے یُولداش والے متن کا پہلا مکمل ترجمہ *Alpamysh uzbekskiy epos* کے نام سے ۱۹۴۹ء میں تاشقند سے شائع کیا۔ علاوہ ازیں متن کی اور اُوزبکی روایتیں بھی موجود ہیں، جو دوسرے 'بخشیوں' سے مروی ہیں اور جو اس وقت تک شائع نہیں ہوئیں۔ بعض جزئیات کے اعتبار سے ان میں اختلافات بھی ہیں۔

قازاقی روایت کا (صرف دوسرا حصہ) شیخ الاسلاموف نے ۱۸۹۶ء میں قازان سے شائع کیا۔ اس کا مکمل متن دیوااِیف (Divaev) نے ۱۹۲۲ء میں بمقام تاشقند بعد تصحیح طبع کیا اور ۱۹۳۳ء میں آلما اَتا (Alma-Ata) کے مقام پر اس کی دوبارہ تصحیح اور طباعت ہوئی۔ یہ آلپامِیش باتِیر (*Alpamys-Batyr*) کے نام سے ایک مجموعۂ اشعار موسوم بہ باتِیرلَر ژِیرِی (*Batyrlar Zyry*)، مطبوعۂ آلما اَتا ۱۹۳۹ء، ص ۲۴۹-۲۹۶ میں ملتا ہے۔

قرہ قالپاقی روایت (صرف پہلا حصہ مع روسی ترجمہ) تورتکول کے بخشی جِیا مراد بک محمدوف (Djiya Murad Bek Muhammedov) کے متن پر مبنی ہے (A. Divaev: *Alpamys-Batyr, Etnografičeskie materyaly*، کراسہ ۷، در *Sbornik materyalov dlya statistiki Syrix Daryinskoy oblasti*، تاشقند ۱۹۰۱ء)۔ قرہ قالپاقی مکمل روایت ماسکو میں پہلی مرتبہ ۱۹۳۷ء میں اور دوبارہ ۱۹۴۱ء میں تورتکول (Törtkül) اور تاشقند میں 'Aimbet uly Kally: *Alpamys*'' کے نام سے شائع ہوئی۔

ان کے علاوہ داستان کی دو منثور روایتیں باشقر اور آلتائی زبان میں بھی موجود ہیں، جو وسط ایشیا کی روایتوں سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ باشقر روایت *Alpamysh hem Barsyn Kh'yluu* کو N. Dimitriev نے A. G. Bessonov کے روسی ترجمے کے ساتھ *Bashkirskie Narodnye Skazski* کے کراسہ ۱۹ میں بمقام اُوفا (Ufa) ۱۹۴۱ء میں شائع کیا۔

اس سے بظاہر قدیم تر آلتائی روایت آلیپ مَنَش (*Alyp-Manash*) کا متن، جسے N. U. Ulagashev نے متعیّن کیا تھا، 'آلتای بُوچے' (*Altay Bučay*؛ قبیلۂ اُویُرات کے حماسۂ ملّی) میں شائع ہوا، طبع A. Koptelev، نووسِبِرسک (Novosibirsk) ۱۹۴۱ء، ص ۷۹-۱۲۶۔

داستان کی سب سے طویل روایت فاضِیل یُولداش کی ہے، جو چودہ ہزار بندوں پر مشتمل ہے۔ قازاقی اور قرہ قالپاقی روایتیں نسبۃً مختصر ہیں اور علی الترتیب اڑھائی اور تین ہزار بندوں پر مشتمل ہیں۔

مآخذ: (۱) V. M. Žirmunskiy اور Kh. T. Zarifov: *Uzba-*

kskiy Narodniy Geroičeskiy Epos، ماسکو ۱۹۴۷ء؛ (۲) Antologiya، Uzbekskoy Poezü طبع آی بک (M. Aibek) وغیرہ، ماسکو ۱۹۵۰ء.

(H. CARRÈRE D'ENCAUSSE, A. BENNIGSEN)

✱ **آلتای** [آلتُون طاغ]: وسطی ایشیا کے مشرقی حصے میں تقریباً ہزار میل لمبا ایک عظیم الشان سلسلۂ کوہ، جو جنوب مغرب میں بحیرۂ سَیسان (Saisan Sea) سے لے کر بالائی [دریاے] سِلِنغہ (Selenga) اور بالائی [دریاے] اورخُون [یا اورقند] تک پھیلا ہوا ہے.

اوب (‘Ob’)، اِرتیش اور ینیسی (Yanassei) دریا اسی میں سے نکلتے ہیں۔ یہاں اور شمال مشرق کے ملحقہ علاقے میں موجودہ مغولستان (منگولیا) تک تُرکوں، مغلوں اور ان کے آبا و اجداد کا قدیم ترین مسکن تھا۔ اس کے بعد مدّت مدید تک ترکوں کی ”پناہ گاہ“ کوہستان اُتورکان Ötökän [رک بآن] میں رہی۔ جنوبی آلتای کا قدیم ترین ترکی نام، جس طرح وہ اُورخونی کتبات میں ملتا ہے، آلتن یِیش (سونے کا پہاڑ) تھا، جسے چینی زبان میں کِن۔شان (وہی معنی) کہتے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ایک تاگ (Ektag؛ غالباً تحریف اَق داغ = کوہ سفید) کا نام، جس کا ذکر یونانیوں نے کیا ہے، تیِیان شان (T'ien-shan) سے متعلق ہے (E. Chavannes: *Documents Sur les Tou-Kieu occidentaux*، ص ۲۳۶ بعد)۔ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا ہے کہ آیا اس موجودہ نام کا، جو سب سے پہلے دَورِ قالُموق میں استعمال ہوا ہے، منگولی لفظ آلتَن (Altan) بمعنی سونا سے تعلق ہے یا نہیں۔ مقامی باشندے غلط اشتقاق کی بنا پر اس کی تاویل آلتی آیُ (چھے ماہ) کرتے ہیں.

مآخذ: (۱) Cotta: *Der Altai*، طبع لائپزگ ۱۸۷۱ء؛ (۲) J. Granö: *Les formes du reliefs dans l'Altaï russe*، ہلسنگفورز (Helsingfors) ۱۹۱۷ء؛ (۳) P. FickeleR: *Der Altai*، ۱۹۲۵ء؛ (۴) *Bol'šaya Sovetskaya Entsiklopediya*، طبع دوم، ۲: ۱۳۶-۱۵۱۔ ترکی تہذیب وتمدن کے ارتقاء میں آلتای کے مقام کے لیے قب A. von Gabain: *Steppe und Stadt im Leben der ältesten Türken*، در *Isl.*، ۱۹۴۹ء، ص ۳۰-۶۲؛ نیز دیکھیے مادۂ تُرک.

(B. SPULER شپولر)

✱ **آلتائیہ**: [اَلتائیَّۃ] (Altaians)، جبالِ آلتای کا ایک ترکی قبیلہ، جس کے کچھ لوگ، کم و بیش برائے نام، کلیساے خاور [آرتھوڈوکس] سے وابستہ ہونے کے مدّعی ہیں اور کچھ شامَنی مذہب کے (Shamanistic) ہیں۔ ہرچند کہ اسلام ان میں موجود نہیں ہے، تاہم اسلامی تہذیب کے ساتھ ان کا کچھ نہ کچھ تعلق رہا ہے، اگرچہ ممکن ہے کہ یہ تعلق بلاواسطہ نہ ہو (اس کا ثبوت بعض مستعار کلمات سے ملتا ہے، مثلاً کُدای، یعنی خدا؛ شیطان) (ان کلمات کے لیے قب G. Teich اور H. Rübel: *Völker .... der UdSSR*، لائپزگ ۱۹۴۳ء، ص ۲۸-۴۳، ۱۳۷ بعد، ۱۴۲؛ راڈلوف (W. Radloff): *Proben aus der Volksliteratur der türkischen Stämme Süd-Sibiriens*، ج ۱؛ وہی مصنف: *Aus Sibirien*، ۱: ۲۵۰ بعد؛ *Bol'shaya Sovetskaya Entsiklopediya*، طبع ثانی، ص ۱۴۱ بعد).

مفروضہ ترکی۔منگولی نسل کے لوگوں کے لیے ”تورانی“ (Turanian) [رک بآن، در آ، طبع دوم] کی جو اصطلاح میکس مولر (Max Müller) نے وضع کی تھی اس کی جگہ ۱۸۷۴ء کے قریب سے اور خصوصاً بیسویں صدی عیسوی میں M. A. Castrén کی تجویز کے مطابق Altais (آلتائیان) کی اصطلاح استعمال ہونے لگی ہے۔ اس سے وسیع تر تصوّر یورال۔آلتائیان (Ural- Altaians) کا ہے، جو ذیل کی اقوام پر بھی حاوی ہے: زمرۂ سامویِد (Samoyed)، زمرۂ فِینو۔اوغری (Finno-Ugrians) اور زمرۂ تُونغُوز (Tunguses) (قب مثلاً (۱) *Ural-Altaische Jahrbücher*، وِیس باڈن (Wiesbaden) از ۱۹۵۲ء؛ (۲) J. Benzing: *Einführung in das Studium der altaischen Philologie und der Turkologie*، وِیس باڈن ۱۹۵۳ء، مع فہرستِ مصادر؛ (۳) W. K. Matthews: *Languages of the USSR*، کیمبرج ۱۹۵۱ء) مگر ترکوں [رک بہ مادۂ ترک] کے سوا ان میں سے کوئی قوم بھی اسلام کے دائرے میں شامل نہیں.

مآخذ: (۱) M. A. Castrén: *Ethnologische vorlesungen über die altaischen Völker*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۵۷ء؛ (۲) H. Winkler کی تا بیک حدّ خیالی اور اوہام آمیز تصنیفات، جن میں سے آخری ہے: *Die altaischen Völker und ihre Sprachenwelt*، لائپزگ ۱۹۲۱ء؛ (۳) O. Donner: *Die uralatais chen Sprachen, Finnischugrische Forschungen*، جلد ۱/۱، ۱۹۰۱ء: ص ۱۲۸؛ (۴) M. Cohen: *Les langues du monde*، پیرس ۱۹۲۴ء، ص ۱۵۳-۲۴۳؛ (۵) P. Melioranskiy، در Brockhaus-Efron: *Entsiklopedičeskiy Slovar*، A/xxxiv: ۸۶۲ بعد؛ (۶) *IA*، بذیل کلمہ (از محمد فؤاد کوپرولو)؛ (۷) O. Pritsak: *Stammesnamen und Titulaturen der altaischen Völker, Uralaltaische Jahrbücher*، طبع ۱۹۵۳-۱۹۵۴ء، نقشہ جات؛ (۸) A.Hermann: *Atlas of China*، کیمبرج (میساچوسٹس) ۱۹۳۵ء، ص ۶۶-۶۷؛ (۹) *Völkerkarte der Sowjet -Union, Europ. Teil*، طبع ثانی، برلن ۱۹۴۱ء.

(B. SPULER شپولر)

----

* **آلتِلِق**: رکَ بہ SIKKA.

----

* **آلتون تاش الحاجب**: [اَلتُون تاش الحاجب] ابوسعید (اس کا دوسرا نام ہارون، جو صرف ایک جگہ ابن اثیر کے متن (۹: ۲۹۴ [= طبع المکتبۃ التجاریۃ الکبرٰی، قاہرہ، ۸: ۵، س ۱۷]) میں آیا ہے، غالبًا سہوِ مصنف یا سہوِ کاتب کا نتیجہ ہے [بظاہر متنِ ابن اثیر میں ''وزیر ہارون (بن التونتاش) والتونتاش'' پڑھنا چاہیے بجائے ''وزیر ہارون التونتاش''، قبَ سیف الدین: آثار الوزراء، نسخۂ خطّی، مکتبۂ شفیعیہ، ۸ ب و دستور الوزراء، ص ۱۴۴ و تاریخ بیہقی، طبع غنی و فیاض، تہران، ص ۳۵۶]، ترکی غلام [رکَ بہ تاریخ بیہقی، طبع مذکور، ص ۴۵۰]، جو بعد میں غزنوی سُبُکتگین اور اس کے دو جانشینوں کا سپہ سالار اور خوارِزم کا والی رہا۔ سُبُکتگین ہی کے عہد میں وہ شاہی محافظ دستے میں ''حاجبِ بزرگ'' کے منصبِ جلیلہ پر سرفراز ہو چکا تھا۔ محمود کے عہدِ حکومت میں قراخانیوں کے خلاف جنگِ عظیم میں اس نے شاہی لشکر کے دائیں بازو کی قیادت کی (۲۲ ربیع الثانی ۳۹۸ھ/ ۴ جنوری ۱۰۰۸ء)۔ ۴۰۱ھ/ ۱۰۱۰-۱۰۱۱ء میں اس کا ذکر والیِ ہرات کی حیثیت سے ہوا ہے۔ ۴۰۸ھ/ ۱۰۱۷ء میں خوارزم کی فتح پر وہ اس ولایت کا والی مقرر اور خوارزم شاہ کے لقب سے ملقّب ہوا۔ اپنی موت (یعنی ۴۲۳ھ/ ۱۰۳۲ء) تک اس عہدے پر قائم رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آلتون تاش نے اس دور افتادہ سرحدی صوبے کا انتظام جانفشانی اور دور اندیشی سے کیا اور ہمسایہ ترکی قبائل سے اسے ہر طرح محفوظ رکھا، لیکن چونکہ اس طریقے سے اس نے سلاطین [غزنہ] کی حکومت سے زیادہ خود اپنی حکومت کو مستحکم کیا اس لیے محمود اور مسعود دونوں اس کے اقدامات و حرکات کو شبہے کی نظر سے دیکھتے تھے اور کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں اس تکلیف دہ والی کو دھوکے سے معزول کرنے کے درپے رہے۔ ۴۲۳ھ/ ۱۰۳۲ء میں آلتون تاش نے سلطان مسعود کے حکم سے علی تگین کے خلاف مہمّ شروع کی [رکَ بہ قراخانیہ] اور دَبُوسِیّہ کی لڑائی میں ایک کاری زخم کھا کر ہلاک ہو گیا۔ آلتون تاش کی جگہ اُس کا بیٹا ہارون [رافعی، جس کی ماں رافع بن سیّار امیر خراسان کے خاندان سے تھی۔ تاریخ بیہقی، طبع مذکور، ص ۳۵۵] والی مقرر ہوا۔ لیکن مسعود نے خوارزم شاہ کا لقب خود اپنے بیٹے سعید کو دے دیا اور ہارون فقط امیر سعید کے نمائندے [''خلیفۃ الدارِ خوارزم شاہ''] کی حیثیت سے ملک کا انتظام کرتا رہا [تاریخ بیہقی، طبع مذکور، ص ۳۴۲-۳۵۵]۔ رمضان ۴۲۵ھ/ اگست ۱۰۳۴ء میں ہارون نے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا، لیکن اگلے ہی سال غزنویوں کے ایما پر قتل کر دیا گیا۔ [ہارون کا ایک بھائی ستی بن آلتون تاش بھی دربارِ غزنہ میں تھا، جو عہدِ مسعود اوّل میں چھت سے گر کر مر گیا تھا اور ہارون کے عصیان کے اسباب میں یہ موت بھی تھی کیونکہ بعض شرانگیزوں نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ امیر مسعود نے اُسے مروا دیا ہے، [دیکھیے تاریخ بیہقی، طبع غنی و فیاض، اشاریّہ]۔ ہارون کا جانشین اور بھائی اسمٰعیل خندان [۴۲۷ھ/ ۱۰۳۶ء سے، تاریخ بیہقی، طبع مذکور، ص ۵۰۰] ۴۳۲ھ/ ۱۰۴۱ء تک برسرِ حکومت رہا؛ جب کہ غزنویوں کے حکم سے شاہ مَلِک، صاحبِ ولایت جَنْد، نے اُسے نکال باہر کیا۔ اس طرح وہ حکمران خاندان جس کی بنیاد آلتون تاش نے رکھی تھی ختم ہو گیا۔

مآخذ: (۱) عُتْبی: التأریخ الیمینی، ص ۴۰۳-۴۰۶؛ (۲) گُردیزی: زین الاخبار، ص ۷۳ بعد؛ (۳) بیہقی (طبع Morley)، ص ۵۹ بعد، ۹۱ بعد، ۳۸۹ بعد، ۴۱۹ بعد، ۴۹۹ بعد، ۸۳۴ بعد [طبع غنی و فیاض بہ امدادِ اشاریّہ]۔ جو تاریخیں ابن اثیر (قبَ اشاریہ) میں درج ہیں انھیں مصنّفین مذکور کے بیانات کی رو سے درست کرنا چاہیے۔ نیز قبَ وہ حکایات جو نظام الملک نے سیاست نامہ (طبع شیفر Schefer) میں دی ہیں اور غالبًا ابو الفضل بیہقی کی عظیم الشان تاریخ کے گم شدہ حصّوں سے ماخوذ ہیں، ص ۲۰۶؛ اور عوفی، در بارتولڈ: *Turkestan*، روسی طباعت، ۱: ۸۹، قبَ محمد نظام الدین: *Introduction to the Jawámi‘-ul-Ḥikáyát* (بہ امدادِ اشاریّہ)؛ (۴) بارتولڈ: *Turkestan*، ص ۲۷۵-۲۷۹؛ (۵) محمد ناظم: *The life and times of Sultān Maḥmūd of Ghazna*، ص ۵۶-۶۰؛ (۶) B. Spuler: *Iran in frühislamischer Zeit*، ص ۱۱۵، ۱۲۰۔

(بارتولڈ W. BARTHOLD)

----

* **آلتی پرمق**: [اَلتی پَرْمَق] (وہ آدمی جس کے پاؤں [یا ہاتھ] میں چھے انگلیاں ہوں؛ چھنگا، شش انگشتی) محمد بن محمد۔ ایک تُرک عالم اور مترجم کتب؛ وہ اُسکُوب (Üsküp) میں پیدا ہوا، جہاں اس نے تعلیم حاصل کی اور صوفیوں کے طریقۂ بیرامیّہ [رکَ بآن] میں شامل ہو کر پہلے استانبول اور بعد میں قاہرہ میں وعظ و تدریس میں مشغول رہا۔ اُس نے قاہرہ ہی میں ۱۰۳۳ھ/ ۱۶۲۳-۱۶۲۴ء میں وفات پائی۔ (۱) اس کی اہم تصنیف دلائلِ نُبُوّۃِ محمدی و شمائلِ فُتُوّۃِ احمدی ہے، جو معین الدّین بن شرف الدّین فَراہی معروف بہ مُلّا مِسکین (م ۹۰۷ھ/ ۱۵۰۱-۱۵۰۲ء) کی فارسی کتاب مَعارِجُ النُّبُوّۃ کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کے بے شمار قلمی نسخے استانبول، قاہرہ اور دیگر مقامات میں ہیں اور استانبول ۱۲۵۷ھ اور بولاق ۱۲۷۱ھ کے مطبوعہ نسخے بھی موجود ہیں (دیکھیے سٹوری، ۱: ۱۸۸؛ براکلمان: تکملہ، ۲: ۶۶۱)۔ محتویاتِ کتاب کی تفصیل کے لیے دیکھیے فلوگل (Flügel): *Handschr. Wien*، جلد ۲، شمارہ ۱۲۳۱؛ (۲) اس نے فارسی کتاب نگارِستان کا ترجمہ بھی کیا، جس کا مصنّف جامی نہیں، جیسا کہ براکلمان (۲: ۵۹۰) میں ہے، بلکہ احمد بن محمد غَفّاری (م ۹۷۵ھ/ ۱۵۶۷-۱۵۶۸ء) ہے، قبَ سٹوری، ۱: ۱۱۴۔ آلتی پرمق کے اس ترجمے کا نام نزہتِ جہان و نادرۂ دَوران ہے۔ استانبول میں اس کے کئی قلمی نسخے موجود ہیں؛ (۳) اس نے ابوبکر ابن احمد بن محمد بن زید طوسی (زمانہ غیر متعیّن، قبَ سٹوری، ۱: ۲۹، شمارہ ۱۰) کی کتاب سِتّین، کا ترجمہ بنامِ جامع لطائف البساتین بھی کیا ہے۔ یہ کتاب ساٹھ ''مجالس'' میں قرآن [مجید] کی بارھویں

سورۃ [سورۂ یوسف] کی صوفیانہ تفسیر ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ استانبول کے کتب خانۂ کوپرؤلو میں موجود ہے؛ (۴) ان کے علاوہ اس نے کاشِف العُلوم و فاتح الفنون کے نام سے شرح تلخیص المعانی کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ اس کے ترجمے کا قلمی نسخہ استانبول کے کتب خانۂ عمومی میں موجود ہے۔ بظاہر یہ وہی ترجمہ ہے جسے حاجی خلیفہ نے (دیکھیے طبع فلوگل، ج ۲، عدد ۳۵۴۱ [طبع اوّل، استانبول، ۱: ۴۷۲]) تفتازانی (قب براکلمان، ۱: ۳۵۴) کی مُطوَّل کا ترکی ترجمہ بتایا ہے۔

مآخذ: (۱) المحبّی: خلاصة الأثر، ۴: ۱۷۴؛ (۲) بُروسہ لی محمد طاہر: عثمانلی مؤلّفلری، ۱: ۲۱۲ بعد.

(J. SCHACHT شاخت)

آلتی شَہر: [اَلتی شَہر] یا آلتا شَہر (یعنی ''چھے شہر'') (چینی ترکستان میں لفظ آلتی کو ہمیشہ آلتا کی شکل میں لکھا جاتا ہے)۔ یہ چینی ترکستان (سِن کِیانگ) [ترکستانِ شرقی] کے اس حصّے کا نام ہے جس میں کُوچہ، آق صُو، اوچ طُرفان) (یا اوش طُرفان)، کاشغر، یارقند اور خُتن واقع ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے کے لیے یہ نام پہلے اٹھارھویں صدی میں استعمال کیا گیا ہے (قب ہارٹمان (H. Hartmann): *Der Islamiche Orient*، ۱: ۲۲۶، ۲۷۸) بعض اوقات ساتواں شہر یعنی یَنگی حِصار بھی، جو کاشغر اور یارقند کے درمیان ہے، اس ولایت میں شامل کیا جاتا ہے (گو بسا اوقات اسے بھی چھے میں شمار کر لیا جاتا ہے اور اس صورت میں کُوچہ یا اوچ طُرفان میں سے کسی ایک کو حذف کر دیا جاتا ہے)۔ یہی وجہ ہے کہ جدید کتابوں میں اکثر اس حصّۂ ملک کو جِتی (یا یِتی Djiti or Yiti) شَہر یعنی ''سات شہر'' لکھا جاتا ہے۔ قب مثلاً تاریخ اَمانیّہ، جو ۱۳۲۱ھ / ۱۹۰۳ء میں لکھی گئی اور (N. Pantasow) نے ۱۹۰۵ء میں قازان سے شائع کی (نیز دیکھیے ان شہروں میں سے ہر ایک کے اور ترکستان کے مادّے [در اِ اِ]۔

(W. BARTHOLD بارتولڈ)

آلتِین: [اَلتین] یا آلتُون (ترکی)، سونا یا سونے کے سکّے۔ یہ لفظ اکثر تُرکی مقامات اور اشخاص کے ناموں میں پایا جاتا ہے۔ جیسے آلتین کوپرؤ، آلتین طاش (آلتُون طاش) نیز دیکھیے مادّۂ سکّہ [در اِ اِ]۔

آلتین اوردو (یا اردو): [آلتِن اردو] یہ ترکیب عصرِ جدید کی ترکی زبان میں روسی اصطلاح ''Zolotaya Orda'' کی تقلید میں وضع کی گئی ہے، ''اردوی طلائی'' [رک بہ مادّۂ باتُو، آل]۔

آلتین طاش: [اَلتِن طاش] (نیز آلتون طاش، مقامی تلفظ آلتین دیش)۔ آناطولی میں ایک گاؤں کا نام، عرض بلد ۳۹ درجہ ۵ دقیقہ شمالی اور طول بلد ۳۰ درجہ ۱۰ دقیقہ مشرقی، جو کوتاہیہ کی 'قضا' و 'ولایت' میں ایک 'ناحیہ' ہے (اگرچہ ناحیے کا مرکز اس گاؤں میں نہیں بلکہ موضع گُرز کوریو میں ہے جو اس گاؤں سے قدرے مغربی جانب واقع ہے)۔ یہ مقام دریاے پوڑسُق کے منبعوں کے علاقے میں اَفیُون قرہ حصار ـ کوتاہیہ کی سڑک سے قدرے مغرب کی طرف ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے آباد ہے۔ گاؤں میں انیسویں صدی کی ایک ''تُربَہ'' [مقبرہ] ہے اور زمانۂ حال کی مسجد بھی، جس میں بعض زیادہ پرانے باقی ماندہ حصّے بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔ یہ عمارت ایک قدیم تر اور وسیع تر مسجد کی جاے وقوع پر تعمیر کی گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس سابق مسجد کا کتبۂ تعمیر، جو علاء الدّین کیقباد کا ہے، آق شہر کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ یہ بادشاہ سلاجقۂ روم میں سے تھا۔ جو کتبہ اب مسجد کے رِواق (porch) کے اوپر نصب ہے اور اس میں کسی پُل کی تعمیر کا ذکر ہے اور اس پر تاریخ ۶۶۶ھ / ۱۲۶۷-۱۲۶۸ء دی ہے؛ اس جگہ دو چھوٹے چھوٹے قدیم پل ہیں۔ چاگر ساز (Čakarsaz) میں، جو یہاں سے قریب ہی ہے اور جسے یہاں کے باشندے چاکیر ساز کہتے ہیں، ایک پرانی عثمانی 'خان' (کاروان سرائے) ہے، جس میں تین اندرونی دالان (naves) ہیں، جن کی چھت پر پانچ آہنی شہتیر ہیں۔ اس عمارت میں ایک جالبِ نظر رواق بھی ہے، جس کی تعمیر میں قدیم عمارت کے بقیہ اجزا بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔ آلتین طاش بُروسہ اور اُسکُدار سے اَفیُون قرہ حصار اور قونیہ جانے والی شاہراہ پر ایک منزل تھی۔ یہ منزل غالباً آلتین طاش اور چاگر ساز دونوں پر مشتمل تھی۔

مآخذ: (۱) اِیوار (Cl. Huart): *Konia*، پیرس ۱۸۹۷ء، ص ۸۷، ۲۵۴؛ (۲) علی جواد: ممالکِ عثمانیّہ نکّ تأریخ و جغرافیا لغاتی، ص ۲۶؛ (۳) تیشنر (Fr. Taeschner): *Das anatolishe Wegenetz*، لائپزگ ۱۹۲۴-۱۹۲۶ء، ج ۲، اشاریہ.

(FR. TAESCHNER تیشنر)

آلتین (آلتون) کوپرؤ: [اَلتِن (آلتون) کوپرؤ] عراق کا ایک قصبہ، جو دریاے زابِ اسفل کے ـ جو آج کل اپنے دونوں کناروں کے باہر بہ نکلتا ہے ـ ایک چھوٹے سے پتھریلے جزیرے پر بہت خوش نما طریقے پر تعمیر کیا گیا ہے (طول بلد ۴۴ درجہ ۸ دقیقہ مشرقی اور عرض بلد ۳۵ درجہ ۴۵ دقیقہ شمالی)۔ یہ قصبہ کرکُوک ہی نام کے لِوا (صوبے) کی 'قضاے کرکُوک' میں ایک 'ناحیے' کے صدر مقام کی حیثیت رکھتا ہے اور پہلے موصل کی 'ولایت' میں شامل تھا۔ دریاے زاب اسی جگہ لواء کرکُوک اور لواء اِربل کے درمیان حدِ فاصل ہے؛ عربی میں اس کا مقامی نام محض القَنطرہ ہے۔ ترکی نام (''طلائی پُل'') کی مختلف طرح تشریح کی گئی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ نام ایک ترک یا کُرد خاتون کے نام پر رکھا گیا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس میں ان بڑی رقموں کی طرف اشارہ

ہے جو قافلے زرِراہداری کے طور پر سابقًا ادا کیا کرتے تھے، اس لیے کہ یہ جگہ بغداد ـ٭ـ موصل کی قدیم شاہراہ پر واقع ہے۔ کئی اور لوگ اسے آلتین صُوْ کور پرؤ کا اختصار سمجھتے ہیں (یعنی ''آلتین صُوْ [=نہرِزرّیں] کا پُل'') لیکن ان وجوہِ تسمیہ کی صحت کا جتنا احتمال ہے کم ازکم اسی قدر اس کی صحت کا احتمال بھی ہے کہ دریا کا نام (جواب شاذّ و نادر ہی استعمال ہوتا ہے) خود قصبے کے نام کا پتا دیتا ہو۔ اس مقام نے، جس کی حیثیت قرونِ وسطٰی میں ایک مجہول اور غیر مذکور گاؤں سے زیادہ نہ تھی [مگر دیکھیے یزدی: ظفر نامہ، ۱: ۶۶۱، جہاں اسے التون کوپروک لکھا ہے]، ان دو پُلوں کی تعمیر کے بعد، جنھیں (کہا جاتا ہے کہ) سلطان مراد رابع نے بنوایا تھا اور کچھ عرصے کی منظم حکومت کی بدولت، گیارھویں/سولھویں صدی سے خاصّی اہمیت حاصل کر لی۔ ان وجوہات سے بہت سے مغربی سیاح یہاں آئے، جنھوں نے اس کے حالات قلم بند کیے۔ چونکہ اسے ایک صحت مند اور نہایت خوش منظر مقام سمجھا جاتا ہے اس لیے ابھی حال کے زمانے میں صفائی، مواصلات اور دیگر سہولتوں کے لحاظ سے اس کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہوگئی ہے۔ یہاں کے مشہور سنگین پُل، جن میں سے جنوبی پل میں ایک، تقریبًا ناقابلِ گزر، بلند وسطٰی محراب تھی، ۱۹۱۸ء میں ترکوں نے مسمار کر دیے اور بعد میں ان کی جگہ جدید طرز کے آہنی پل تعمیر کیے۔ عراقی ریلوں کی کرکوک ـ٭ـ اربل شاخ، ان پلوں کے قریب ہی، اوپر کی طرف سے، دریاے زاب کو عبور کرتی ہے۔

آلتین کور پرؤ کے باشندوں میں، جن کی تعداد کوئی ۳,۵۰۰ ہوگی، کُرد، ترکمان اور عرب ملے جلے ہیں، یہی حال ان تین گاؤں کا بھی ہے جو اس ''ناحیے'' میں شامل ہیں۔ ان میں سے بہت سے گاؤں کرکوک کے اس وسیع علاقے میں واقع ہیں جہاں مٹی کے تیل کے حاصل خیز چشمے پائے جاتے ہیں (یہ چشمے ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء میں دریافت اور ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء سے پوری طرح رواں ہوے)۔ مٹی کا تیل نکالنے سے متعلّق مختلف اعمال کی بدولت یہاں کے بہت سے باشندوں کو روزگار مل گیا ہے۔ ان کے دیگر اہم ذرائع معاش میں زراعت ہے (جس کا انحصار کچھ تو بارش پر ہے اور کچھ جدید طرز کے سامانِ آبپاشی کے استعمال پر)۔ اس کے علاوہ سڑکوں پر آمد و رفت سے متعلّق لازمی اداروں کا قیام اور ضروری سامان کی بہم رسانی کِلِکّ کشتیوں (یعنی مشکوں پر بندھے ہوے تختوں) کے ذریعے، جو یہاں کی خصوصی اشیا ہیں، مسافروں کو دریاے زاب کے آرپار لے جانا اور تھوک اور پرچون تجارت شامل ہیں۔

مآخذ: ترکی عہد کے لیے دیکھیے: (۱) کوینے V. Cuinet: *La Turquie d' Asie*، ۲: ۸۵۵؛ (۲) S. H. Longrigg: *Four Centuries of Modern Iraq*، اوکسفرڈ ۱۹۲۵ء؛ اور بہت سے سیّاحوں کی یادداشتیں مثلاً (۳) Niebuhr: *Reisebeschreib. nach Arabien*، کوپن ہیگن ۱۷۷۸ء، ۲: ۳۴۰؛ (۴) Olivier: *Voyage dans 'lempire Ottoman*، پیرس ۱۸۰۱ء، ۲: ۳۷۲؛ (۵) Rousseau: *Description du Pachali de Bagdad*، پیرس ۱۸۰۹ء، ص ۸۵؛ (۶) C. J. Rich: *Narrative of a Journey to the Site of Babylon*، لنڈن ۱۸۳۹ء، ۲: ۱۰-۱۲؛ (۷) Petermann: *Reisen im Orient*، لائپزگ ۱۸۶۱ء، ۲: ۳۱۹؛ (۸) Czernik در *Petermann's Geogr. Mitteilungen Ergänzungsheft*، شمارہ ۴۴ (۱۸۷۵ء)، ص ۴۷؛ نیز دیکھیے (۹) K. Ritter: *Erdkunde*، ۹: ۶۳۷-۶۳۹؛ (۱۰) E. Reclus: *Norw. géogr. univ.*، ۹: ۴۳۱؛ (۱۱) G. Hoffmann: *Auszüge aus syr. Akten pers. Martyrer*، ۱۸۸۰ء، ص ۲۵۸، ۲۶۳؛ بیسویں صدی کے لیے دیکھیے [(۱۲) سامی: قاموس الاعلام، ۱: ۳۰۷]؛ (۱۳) S. H. Longrigg: *Iraq 1900 to 1950*، لنڈن ۱۹۵۳ء۔

(لانگرگ S. H. LONGRIGG)

----

* **الآلُوسی:** ایک خاندان کا نام، جس کے ارکان میں (انیسویں اور بیسویں صدی کے اندر) بغداد کے بہت سے متبحّر علما شامل تھے۔ آلوسی آلُوس سے منسوب ہے، جو دریاے فُرات کے مغربی کنارے پر ابوکمال اور رَمادِی کے درمیان واقع ہے۔ اپنی خاندانی روایت کے مطابق آلوسی خاندان حسنی اور حسینی سیّد ہیں۔ ان کے اجداد مغل فاتح ہُولاگو سے جان بچا کر آلوس بھاگ آئے تھے؛ پھر کہیں گیارھویں/سترھویں صدی میں ان کی اولاد بغداد واپس آئی۔ اس خاندان کے اُن بے شمار افراد میں سے جنھوں نے عراق کی ثقافتی اور سیاسی تاریخ میں نور کی افزائش کی ہے مندرجۂ ذیل ہیں:

(۱) عبداللہ صلاح الدین، جو خاندان کا مُورثِ اعلیٰ تھا (م ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۰ء).

(۲) ان کا بیٹا ابوالثناء محمود شہاب الدین بن عبداللہ صلاح الدین (۱۲۱۷-۱۲۷۰ھ/ ۱۸۰۲-۱۸۵۴ء)؛ یہ کئی سال تک بغداد کے مفتی رہے، لیکن وہ نامور معلّم، مفکّر اور مُناظر بھی تھے۔ ان کی بیشمار تصنیفات میں کتبِ ذیل شامل ہیں: رُوح المعانی (در تفسیرِ قرآن، بولاق ۱۳۰۱-۱۳۱۰ھ/ ۱۸۸۳-۱۸۹۲ء، ۹ جلد)، کتبِ نحو و عروض کی شرحیں اور کچھ معمولی سے ''مقامات''۔ عقائد پران کے دلائل الرسالۃ اللاھُوریۃ (اشاعت ۱۳۰۱ھ/ ۱۸۸۳ء) اور الاَجوبۃِ العِراقیۃ عن الأسئلۃ الإیرانیۃ، استانبول ۱۳۱۷ھ) میں درج ہیں۔ مفتی کے عہدے سے برطرفی کے بعد انھوں نے سفرِ استانبول اختیار کیا۔ کتبِ ذیل اس سفر کی سرگزشت پر مشتمل ہیں: نَشْوَۃ الشَّمُول فی الذَّھاب الی اسلامْبُول؛ نشوۃ المُدام فی العَوْد الی دار السلام اور غرائب الاِغْتِرابِ و نُزْھَۃُ الاَلْباب۔ پہلی اور دوسری ۱۲۹۱-۱۲۹۳ھ/ ۱۸۷۴-۱۸۷۶ء میں اور تیسری ۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۹ء میں بغداد سے شائع ہوئی۔

(۳) عبدالرحمٰن، سابق الذّکر [ابوالثناء] کا بھائی (م ۱۲۸۴ھ/ ۱۸۶۷ء)، وہ بغداد کا خطیب تھا اور اپنے زمانے کا ''ابن الجوزی'' اور اپنے عہد کا ''ابن نُباتہ''

کہلاتا تھا.

(۴) عبدالحمید سابق الذّکر [عبدالرحمٰن] کا بھائی، (۱۲۳۲-۱۳۲۴ھ/ ۱۸۱۶-۱۹۰۶ء)، معلّم اور واعظ بعض منظومات اور نثر للآلی علٰی نظم الامالی کا مصنّف.

(۵) عبداللہ بہاء الدّین، شمارہ ۲ [ابوالثناء] کا بڑا بھائی (۱۲۴۸-۱۲۹۱ھ/ ۱۸۳۲-۱۸۷۴ء)، قاضی بصرہ، نحو کے ایک رسالے، منطق پر دو کتابوں اور تصوّف کے ایک رسالے کی شرح کا مصنّف.

(۶) عبدالباقی سعد الدّین، سابق الذّکر [عبداللہ بہاء الدین شمارہ ۵] کا بھائی (۱۲۵۰-۱۲۹۳ھ/ ۱۸۳۴-۱۸۷۶ء). وہ ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء میں قاضی کرکُوک تھا. اس نے زیادہ تر نحو اور تقطیعِ عروضی کے رسالوں پر شرحیں لکھیں یا ان میں تصرّف کر کے حسبِ ضرورت ترمیمات کیں؛ علاوہ ازیں ایک راہنماے حج بنام اَوْضح مَنْہج الی معرفۃ مَناسِک الحجّ بھی اس کی تصنیف ہے (طبع سنگی، قاہرہ ۱۲۷۷ھ).

(۷) نُعمان خیر الدین ابو البرکات [الشہیر بابن الآلوسی البغدادی]، سابق الذّکر [عبدالباقی، شمارہ ۶] کا بھائی (۱۲۵۲-۱۳۱۷ھ/ ۱۸۳۶-۱۸۹۹ء)، معلّم اور واعظ، مصنّف جَلاء العَیْنَین فی المحاکمَۃ بین الاحمَدَین [یا فی محاکمَۃ الاحمَدَین]، جو اس نے ابن تیمیہؒ کی حمایت میں لکھی اور جس سے بڑی سنسنی پھیل گئی [قاہرہ ۱۳۸۱ھ]. اس نے مناظرانہ رنگ میں دو اور کتابیں بھی تصنیف کیں، یعنی الجواب الفصیح (ردِّ نصاریٰ میں) اور شقائق النُّعمان فی ردِّ شقاشق ابن سُلیمان؛ اس کے مواعظ ونصائح ایک اور تصنیف غالیۃ المواعِظ میں جمع ہیں. یہ بہت مطوّل کتاب ہے اور کئی طباعتوں میں موجود ہے.

(۸) محمد حمید، سابق الذّکر [نعمان خیر الدّین، شمارہ ۷] کا بھائی (۱۲۶۲-۱۲۹۰ھ/ ۱۸۴۶-۱۸۷۳، ۱۸۷۴ء).

(۹) احمد شاکر، برادرِ سابق الذّکر [محمد حمید] ۱۲۶۴-۱۳۳۰ھ/ ۱۸۴۸-۱۹۱۱، ۱۹۱۲ء، قاضی بصرہ.

(۱۰) محمود شُکری (المعروف ایضًا محمود آلوسی زادہ) پسر [عبداللہ بہاء الدّین، شمارہ ۵] (۲۹ رمضان ۱۲۷۳ھ/ ۱۴ مئی ۱۸۵۷ء - ۳ شوّال ۱۳۴۲ھ/ ۸ مئی ۱۹۲۴ء). اپنے خاندان میں سب سے زیادہ شہرت انھیں نے حاصل کی، جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ محمد بَہْجَت الاَثَری نے ان کی تصانیف شائع کرنے میں بڑی سرگرمی دکھائی. انھوں نے تاریخ، فقہ، سیرت، لغۃ، بلاغت اور مباحثِ کلامیّہ پر پچاس کے قریب کتابیں لکھیں. تاریخ پر انھوں نے جو کتابیں لکھیں اُن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر یہ ہیں: بُلوغُ الاَرَب فی مَعْرِفَۃِ اَحوالِ العَرَب (طبع ۱۳۱۴ھ/ ۱۸۹۶ء). یہ زمانۂ جاہلیّت کے عربوں کے متعلّق ایک سوال کے جواب میں لکھی گئی، جو اورینٹل کانگرس کے آٹھویں اجلاس (۱۸۸۹ء) میں اُٹھایا گیا تھا اور تأریخ نجد (قاہرہ ۱۳۴۳ھ) [میں بھی]. علمِ سِیَر میں انھوں نے المِسک الاَذْفَر لکھی (طبع بغداد ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۳۰ء). یہ بارھویں-تیرھویں صدی کے علماے بغداد کے بارے میں ہے؛ عوامی بولیوں کے علم سے متعلّق (dialectology) انھوں نے امثال العوام فی مدینۃ السلام لکھی؛ اور مناظرے میں شدّت آمیز مجادلانہ تصانیف کا ایک سلسلہ لکھا: رِفاعیوں اور شیعیوں کے خلاف، فقہ کی جدید حنبلی اصلاحات کی تائید میں، وغیرہ وغیرہ، جن میں سے غایات الأمانی، جو ایک فرضی نام سے شائع کی گئی (قاہرہ ۱۳۲۷ھ)، خاص طور پر قابلِ ذکر ہے. وہ عصرِ حاضر کے اسلام کے سب سے زیادہ سرگرمِ عمل نمائندوں میں سے تھے. تحریر وتقریر اور اپنے طرزِ عمل سے وہ 'بدعت' کی روک تھام میں کوشاں رہتے تھے. ان کا شمار 'سَلَفِیّہ' تحریک کے قائدین میں ہوسکتا ہے.

(۱۱) علاء الدین علی [بن نُعمان خیر الدّین، شمارہ ۷] (م ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) معلّم؛ اس کی واحد تصنیف نحو پر ایک منظوم درسی رسالہ ہے. تراجم کا ایک مجموعہ، جس کی تالیف انھوں نے شروع کی، نامکمّل ہی رہ گیا.

(۱۲) محمد دَرْویش بن احمد شاکر [احمد شاکر کے لیے دیکھیے شمارہ ۹] (م بعد ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۲ء) معلّم اور واعظ، اس کی کئی تصانیف ہیں لیکن تمام غیر مطبوعہ.

مآخذ: (۱) محمود شہاب الدّین الآلُوسی: روح المعانی، ج ۱، مقدّمہ؛ (۲) محمود شُکری الآلوسی: المِسک الاَذْفَر، ۱: ۳-۵۹؛ (۳) براکلمان، ۲: ۴۹۸؛ تکملہ، ۲: ۷۸۵-۷۸۹؛ (۴) محمد بَہْجَت الاَثَری: اَعْلام العِراق، ص ۷ ببعد، ۵۷-۶۸؛ (۵) محمد صالح السُّہرَوردی: لُبُّ الالباب، ۲: ۲۱۸-۲۲۴، ۳۶۰-۳۶۲، ۲۱۳۰-۲۱۳۳؛ (۶) سَرکیس، عمود ۳-۸؛ (۷) زِرِکْلی: الأَعْلام، ۳: ۱۰۱۳ ببعد؛ (۸) عبدالحیّ الکِتّانی: فِہرِس، ۱: ۹۷؛ ۲: ۸۴؛ (۹) جرجی زیدان: تاریخ آداب اللغۃ العَربیّۃ، ۴: ۲۸۵ [طبع جدید، ۴: ۲۵۷ ببعد]؛ (۱۰) وہی مصنّف: مشاہیر الشَرق، ۲: ۱۷۵-۱۷۷؛ (۱۱) سَنْدُوبی: اَعْیان البیان، ص ۹۹-۱۱۰؛ (۱۲) عمر الدَّسُوقی: فی الادب الحدیث، ۱: ۴۹، ۵۱، ۱۳۹-۱۴۱؛ (۱۳) شیخو (L. Cheikho): *Litt. ar. au XIX*es، ۱: ۷۳، ۸۵-۸۶، ۹۳-۹۷؛ (۱۴) H. Pérès: *Litt. ar. et Isl. par les textes*، ص ۷۴-۷۵؛ (۱۵) ماسینیون (L. Massignon)، در *RMM*، ۱۹۲۴ء، ص ۲۴۴-۲۴۶ (نیز دیکھیے xxxvi: ۳۲۰ ببعد اور lviii: ۲۵۴)؛ (۱۶) لغۃ العرب، ۴: ۳۴۳، ۳۴۶-۳۹۹، ۴۰۲؛ (۱۷) مشرق، ۱: ۸۶۵-۸۶۹، ۱۰۶۶-۱۰۷۱؛ (۱۸) گولڈ تسیہر (I. Goldziher): *Zāhiriten*، ص ۱۸۸، ۱۹۰؛ (۱۹) نُعیم الحِمْصی: تأریخ إعجاز القرآن، در *MMIA*، ۲۹: ۴۲۰-۴۲۲؛ [(۱۹) عباس العزّاوی: ذکری الی الثناء الآلوسی].

(H. PÉRÈS)

----

* **آلہ:** اوزار، برتن یا ظرف. ('اَداۃ' کا مرادف ہے، جس کی جمع اَدَوات آتی ہے).

(۱) علمِ صرف و نحو کی اصطلاح میں 'آلۃ' اور 'اَدَاۃ' کے لفظ ایسے مرکّبات میں استعمال ہوتے ہیں جیسے کہ 'آلۃ التعریف' [یعنی 'آلۂ تخصیص'] (حرف التعریف: ال)، 'آلۃ التشبیہ'، (=حرف ك) وغیرہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ لفظ آلہ (اور اسی طرح لفظ اَدَاۃ) تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے عرب نحویوں نے استعمال نہیں کیا، چنانچہ ایسی تصانیف میں جیسے کہ ابنِ فارس کی ہے لفظِ 'اداۃ' صرف ایک مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے اواخر میں 'حرف' کی اصطلاح کی بابت کہا جا سکتا ہے کہ اس سے وہ صرفی اور نحوی وسائط بھی مراد لیے جاتے تھے جنھیں بعد میں 'آلہ' اور 'اداۃ' سے تعبیر کیا گیا۔ اس سے بظاہر یہ غرض معلوم ہوتی ہے کہ حرف سے ''عارضی اور اتفاقی'' فعل کا اثر کسی منفعل پر بیان کیا جاتا ہے۔ 'آلہ' اور 'اداۃ' سے وہ ترکیبی تعلّقات ظاہر ہوتے ہیں جو قطعی، دیرپا، مخصوص اور ایضاح کرنے والے ہوں، مثلاً تاکید، تحقیق اور تشبیہ.

مآخذ: ابن فارس: الصاحِبی، ص ۱۰۲؛ تھانوی: کشّاف اصطلاحات الفنون، طبع شپرنگر (Sprenger)، کلکتہ ۱۸۶۲ء، مقالہ ''اداۃ'' و ''آلۃ''.

(R. BLACHÈRE بلاشیر)

----

(۲) تقسیم علوم کی صورت میں آلات سے مراد وہ علوم و فنون ہیں جن کی تحصیل مقصود بالذّات نہیں ہوتی (یعنی خود ان کا حصول اصل مقصد نہیں ہے) بلکہ ''کسی اَور چیز کی تحصیل کے لیے بطور وسیلے اور واسطے کے سیکھے جاتے ہیں''، مثلاً علم لغت و علم منطق کی تحصیل اس غرض سے کی جاتی ہے کہ وہ دینی علوم کی تحصیل میں مدد دیں۔ چنانچہ ''العلوم الآلیّۃ''، ''العلوم الشرعیّۃ'' کے مقابل ٹھیرے، دیکھیے ''آلات المُنادَمۃ'' کی ترکیب، یعنی وہ علم اور ہنر جو ندیمی یعنی آپس کے میل جول اور باہمی بات چیت کے لیے کارآمد ہوں۔ اس بنا پر اصطلاح 'آلہ' اور اصطلاح 'ادب' [رکّ بآں] میں فقط یہ فرق ہے کہ آلہ اکتسابی فضائل کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ ان کا علم سے کیا تعلّق ہے، نیز قبّ عیون الاخبار، طبع براکلمان، ۱: ۴۔ آلات کی اصطلاح ὄργανα کے عین مطابق ہے، جسے تورانیوْن آمیسوسی [=صامسُونی] (Tyrannion of Amisus) نے علوم اللّغہ کو تقسیم کرتے وقت استعمال کیا ہے؛ دیکھیے H. Usener: *Philologie und Geschichtswissenschaft*، بوْن (Bonn) ۱۸۸۲ء، ص ۲۳.

مآخذ: (۱) غزالی: احیاء، کتاب العلم، باب ۲ (اِتحاف السّادۃ، ۱: ۱۴۹)؛ (۲) Snouck Hurgronje: *Mekka*، ۲: ۲۰۶؛ (۳) Goldziher، در *Steinschneider-Festschrift*، ۱۱۴ (جہاں دیگر حوالہ جات مندرج ہیں).

(I. GOLDZIHER گولٹ تسیہر)

----

(۳) حکمائے مشّائین کے نظریے کے تتبّع میں منطق کو آلہ کہا جاتا ہے، کیونکہ اس نظریے کی رُو سے منطق فلسفہ سیکھنے کا ایک وسیلہ (ὄργανον) ہے، فلسفے کا جز نہیں ہے (قبّ گولٹ تسیہر، در مآخذ متعلقہ ۲، در سطورِ بالا؛ S. van den Bergh: *Averroes' Epitome d. Metaphysik*، ص ۱۴۸؛ البیرونی: دیباچہ، الصیدنۃ (طبع M. Meyerhof، در *Quellen u. Stud. z. Gesch. d. Naturw. u. Med.*، ۱۹۳۲ء) اور مادّۂ منطِق).

آلہ کے دوسرے معنوں کے لیے دیکھیے مادّہ حِیَل اور نَوبۃ.

آمانُوس: [اَمانوس] رکّ بہ اِلْما طاغ. *

آمِد: رکّ بہ دِیارِ بَکْر. *

آمِدجی: (ترکی) دولتِ عثمانیہ کے مرکزی ادارۂ حکومت کا عہدے دار؛ * 'تنظیمات' سے پیشتر وہ براہِ راست 'رئیس الکُتّاب' کے ماتحت ہوتا تھا اور جو گزارش نامے (رپورٹیں) رئیس مذکور لکھتا تھا وہ ان کی نقلیں رکھتا اور معمولی معاملات کے متعلّق خود بھی گزارش نامے تیار کیا کرتا تھا۔ غرض وہ رئیس الکُتّاب کے دفتر کے تمام دفتری فرائض سرانجام دیتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ رئیس اِفندی اور سُفَرا کی ملاقات کے دوران میں حاضر رہتا اور کارروائی کی رسمی روداد لکھتا تھا، بیلکجی (Beylikdji) کی طرح وہ بھی 'خواجگان لِق' کے لقب سے ملقّب تھا۔ اس عہدے کا نام اور اس کی اصل فارسی لفظ آمد سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں 'آیا' یا 'وصول ہوگیا'۔ یہ کلمہ رسید واجبات کی تمام دستاویزوں پر درج ہوتا تھا یعنی اُن واجبات کی جو نئے مقرّر شدہ فوجی عہدے دار اپنی 'تیماروں' اور 'زِعامتوں' کے لیے رئیس الکُتّاب کو ادا کرتے تھے۔ جو شخص یہ اندراج کرتا تھا وہ آمِدجی کہلاتا تھا اور ادارے کے اُس دفتر کو جہاں اس قسم کی دستاویزوں سے متعلّق رسمی کارروائی انجام دی جاتی 'آمِدی' کہتے تھے۔ آمِدی کاتبی (آمِدی کا کاتب) اور آمِدی قلمی (سررشتۂ آمِدی) کی اصطلاحات بھی مستعمل تھیں.

یہ عہدہ بظاہر سترھویں صدی کے بعد معرضِ وجود میں آیا۔ 'تنظیمات' کے بعد 'آمِدجی' کے عہدے کی اہمیّت بڑھ گئی اور اسے 'آمِدی دِیوانِ ہمایُون' بھی کہتے تھے۔ اُس کا کام یہ تھا کہ ان تمام دستاویزات کی نُقول تیّار کرے جو اَور وزارتوں یا اداری محکموں کی طرف سے 'صَدارت' کو ارسال ہوں اور جن کے لیے مجلسِ وزرا یا صدرِ اعظم کی قراردادوں کے بعد بادشاہ کی منظوری کی ضرورت ہو۔ جن دستاویزوں کے بارے میں اس رسمی کارروائی کی ضرورت نہ ہوتی اُن کی تصحیح کرنا، رجسٹروں میں ان کا اندراج کرنا اور انھیں 'حاجب الحُجّاب' (Head Chamberlain) کے پاس ارسال کرنا اس محکمے کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔ دوسری طرف اس کا یہ بھی فرض تھا کہ شاہی احکام و فرائض، جو صدارت کی طرف بھیجے جاتے، رجسٹر میں درج کرے۔ آمِدجی ان کاتبوں کی نگرانی بھی کرتا تھا جن کا یہ کام تھا کہ مجلسِ وزرا کے اجلاس کی روداد قلم بند کریں۔ اُس کا شمار بابِ

عالی کے پانچ اعلیٰ ترین عہدے داروں میں تھا؛ یہ محکمہ 'صدارت' کے دیگر محکموں سے زیادہ اہمّ اور زیادہ ممتاز تھا۔ دوسرے دستور سیاسی کے اعلان کے بعد 'آہِدی دیوانِ ہمایون' کا نام بدل کر دفتر مجلس وکلا و محکمۂ مترجمان [''مجلس وکلا و معروضات قلمی باش کاتب لیغی''] رکھ دیا گیا اور وہ ایک ہی افسر کے ماتحت ہو گیا لیکن بعد میں (۱۹۱۲ء میں) پھر سابقہ نام برقرار کر دیا گیا۔ نیز دیکھیے میرا مقالہ *IA* میں.

(طیّب گورک بِلگِن M. TAYYIB GÖK BILGIN)

⊗ **الآمِدِی**: ابوالقاسم (یا ''ابوعلی'') الحسن بن بِشر بن یحیٰی ['بحر' بجاے 'یحیٰی' در روضات الجنّات] نحوی اور نقّادِ سخن، کاتبِ [امرا و قضاۃ] اور شاعر، دوسری صدی ہجری کے اواخر میں بصرے میں پیدا ہوا (قبّ ایوار (Huart)، ص ۱۴۷) اور وہیں اس نے تعلیم پائی۔ مزید علم حاصل کرنے کے لیے وہ بغداد گیا، جہاں اس نے [سلیمان بن احمد] الحامِض (م ۳۰۵ھ)، الاَخفش الاَصغر (م ۳۱۵ھ)، ابن السّرّاج [محمد بن السَّرِیّ البغدادی] (م ۳۱۶ھ) اور ابن دُرَید (م ۳۲۱ھ) جیسے بلند پایہ علما کی صحبت سے فیض پایا۔ الزَّجّاج (م ۳۱۱ھ) اور نِفطَوَیہ (م ۳۲۳ھ) کے نام بھی اس کے اساتذہ کی فہرست میں شامل ہیں.

ابوالقاسم الآمِدی خلیفہ المقتدر باللہ کے دربار میں صاحبِ عُمان کے نمائندوں ابوجعفر ہارون بن محمد بن ہارون الضَّبّی (م ۳۳۵ھ) وغیرہ کا کاتب تھا۔ بعد کو جب الآمدی بصرے میں مستقل طور پر مقیم ہو گیا تو وہاں ابوالحسن احمد اور ابواحمد طلحہ بن الحسن بن المثنّٰی کے ہاں کاتب رہا۔ پھر شہر بصرہ کے قاضی ابوالقاسم جعفر بن عبدالواحد الہاشمی نے اور اس کے بعد اس کے بھائی قاضی ابوالحسن محمد نے اپنے وقت میں دیوان الاوقاف کا کام الآمِدی کے سپرد کر رکھا تھا۔ ابوالحسن کے بعد الآمِدی نے کسی کی ملازمت اختیار نہیں کی۔ اس کے آخری زمانے میں جب وہ بصرے میں تھا روایتِ اخبار اُس سے ہوتی تھی.

عام روایت کے مطابق الآمِدی نے ۳۷۰ھ میں بصرے میں وفات پائی (معجم البلدان، ۱:۶۹؛ ابن الاثیر: الکامل (طبع ۱۳۵۳ھ)، ۷:۱۰۶) لیکن یاقوت الحَمَوی کا بیان ہے کہ اس کی نظر سے المُبَرَّد کی کتاب القوافی کا ایک نسخہ، جو ابوالمنصور الجوالیقی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، گزرا ہے، جس کی اسناد میں یہ درج تھا کہ عبدالصّمد بن (احمد بن) حُنَیش (یا حُنَبُش، دیکھیے تأریخ بغداد، ۱۱:۴۲) الخَولانی الحِمصی النحوی نے یہ کتاب ابوالقاسم الآمدی کے سامنے ۳۷۱ھ میں پڑھی۔ ابن النّدیم نے اپنی کتاب الفہرست (سنۂ تصنیف: ۳۷۷ھ) میں ابوالقاسم الآمدی کی نسبت لکھا ہے: ''قریب زمانے کا آدمی ہے اور میں گمان کرتا ہوں کہ وہ ابھی زندہ ہے''.

ابوالقاسم الآمدی کی مصنّفات جو ہم تک پہنچی ہیں ملیح اور جیّد ہیں اور اسلوبِ تصنیف میں وہ جاحظ کا پیرو نظر آتا ہے۔ ان میں سے کتاب الموازنة بین ابی تمّام و البُحتُری (= کتاب الموازنة بین الطائیَّین) (۲ جلد، آستانہ ۱۲۸۸ھ) اہم ترین کتاب ہے، جس میں اُس نے البُحتُرِی کو ابوتمّام کی نسبت کہیں زیادہ سراہا ہے۔ المؤتلِف و المختلِف فی اسماء الشعراء و القابہم نے بھی بہت شہرت پائی [خزانة الادب میں اس کے ۷۵ حوالے دیے ہیں، دیکھیے اقلید الخزانة، ص ۱۲۲ اور سُیوطی: شرح شواهد المغنی میں بیس سے زیادہ]۔ المختلِف کو المرزبانی کی معجم الشعراء کے ساتھ قاہرہ ۱۳۵۴ھ میں بتصحیح کرنکو (F. Krenkow) شائع کیا گیا۔ دیگر تالیفات میں حسبِ ذیل شامل ہیں:۔

دیوان [تقریبًا سو ورق، جو اب ناپید ہو گیا ہے، چند متفرّق اشعار ملتے ہیں]؛ کتاب معانی شعر البحتری؛ نثر المنظوم؛ فعلت و افعلت [''لم یصنّف مثله'' ۔ یاقوت]؛ کتاب الحروف من الأصول فی الأضداد؛ الرّد علیٰ [علیُّ] بن عمّار فیما خطّأ فیه أبا تمّام؛ کتاب فی انّ الشّاعرین لا یتّفق خواطرهما؛ کتاب ما فی عِیار الشعر لابن طباطبا من الخطأ [ابن طباطبا = ابو المُعمر یحیٰی بن محمد طباطبا العلوی النحوی ۔ روضات الجنّات]؛ فرق ما بین الخاصّ والمشترک من معانی الشّعر؛ کتاب تفضیل شعر امرئ القیس علی الجاهلیّین؛ کتاب فی شدّة حاجة الانسان الی أن یعرف نفسه؛ شرح دیوان المسیّب بن عَلَس [خال الاعشٰی ۔ شرح شواهد المغنی، ص ۲۹۷، و شرح دیوان الاعشٰی (میمون)] (ہر دو مذکور در السیوطی: شرح شواهد المغنی، ص ۱۴، ۴۱، ۹۰، ۳۲۷)؛ تبیین غلط قدامة ابن جعفر فی کتاب نقد الشّعر؛ [الامالی، مذکور در حریری: دُرّة الغوّاص؛ منفرد قبائل کے اشعار کے بہت سے مجموعے، مثلًا دیکھیے خزانة الادب، ۳:۱۰۸ اور تکملۂ براکلمان، ۱:۱۷۲ س ۱۲؛ اور المؤتلف، جس میں جابجا اُن کا ذکر ہے، مثلًا دیکھیے ص ۳۶، ۳۷، ۴۹ وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے اکثر کتابیں اب ناپید ہیں].

مآخذ: (۱) ابن الندیم: الفہرست، طبع فلوگل، لائپزگ ۱۸۷۱ء، ص ۱۵۵؛ (۲) ابوالقاسم المحسّن التنوخی: نشوار المحاضرة، قاہرہ ۱۹۲۱ء، ص ۵۰؛ (۳) الثعالبی: یتیمة الدهر، ۱:۸۷ [''لیس یحضرنی شعره'']، ۲:۱۴۲؛ (۴) یاقوت الحَمَوی: ارشاد الاریب، ۳:۵۴-۶۱؛ (۵) ابن القفطی: انباه الرُّواة، ۱:۲۶۵؛ (۶) ابن خَلِّکان: وفیات، [قاہرہ ۱۳۱۰ھ]، بذیلِ مادّۂ حبیب بن اوس [۱:۱۲۱]، وذوالرّمة [۱:۴۰۴]؛ (۷) حاجی خلیفہ: کشف الظنون، طبع یورپ، رقم ۴۵۹۱؛ [(۸) سیوطی: بُغْیَة، ۲۱۸؛ (۹) وہی مصنّف: شرح شواهد المغنی، قاہرہ ۱۳۲۲ھ؛ (۱۰) الخوانساری: روضات الجنّات، ۱۳۸۶ھ، ص ۲۱۹]؛ (۱۱) ہامر ۔ پورگشٹال (Hammer-Purgstall): *Lit. Gesch. Arab.*، Wien ۱۸۵۳ء، ۵:۴۴۴؛ (۱۲) ایوار (Cl. Huart): *History of Arabic Literature*، لنڈن ۱۹۰۳ء، ۱۴۷-۱۴۸؛ (۱۳) زکی مبارک: النثر الفنّی، قاہرہ ۱۹۳۴ء، ۲:۸۲ ببعد؛ (۱۴) براکلمان: *GAL*، ۱:۱۱۱؛ تکملہ، ۱:۱۷۱ ببعد؛ (۱۵) آآ، طبع دوم، بذیلِ مادّہ؛ [(۱۶) عبدالعزیز میمن: اقلید الخزانة، لاہور ۱۹۲۷ء].

(احسان الٰہی رانا)

---

* **الآمِدی:** علی بن ابی علی بن محمد التَّغلَبِی، سیف الدّین [از روے ابن ابی اصیبعہ و سُبکی؛ مگر ابن خلّکان میں علی بن ابی علی محمد بجاے علی ... محمد]، عرب عالم دین، جو آمِد میں ۵۵۱ھ/ ۱۱۵۶ - ۱۱۵۷ء میں پیدا ہوا۔ پہلے حنبلی تھا مگر بعد میں بغداد جا کر شافعیوں کے زمرے میں شامل ہو گیا۔ اُس نے معقولات کو اپنے مطالعے کا خاص موضوع بنایا [علم اوائل اس نے کَرخ کے عیسائیوں اور یہودیوں سے حاصل کیا۔ ابن القِفطی] اور ملکِ شام جا کر بھی اسے جاری رکھا۔ قاہرہ پہنچ کر القرَافۃ الصُّغرٰی کے مدرسے میں، جو [امام] الشافعیؒ کے مقبرے سے متّصل ہے [''مُعِید''] رہا، پھر ۵۹۲ھ/ ۱۱۹۵ - ۱۱۹۶ء میں جامع الظافِری (قاہرہ) میں صدر مدرّس ہو گیا [اور ایک مدّت تک صدارت پر فائز رہا]۔ اُس نے اپنی ذہنی صلاحیتوں اور علومِ عقلیّہ میں مہارت کے باعث درخشاں شہرت حاصل کی، لیکن یہی روشنیٔ طبع اس کے لیے بلا بن گئی، کیونکہ فقہا نے اس پر الحاد و زندقہ (''فساد العقیدۃ و انحلال الطویۃ و التعطیل و مذھب الفلاسفۃ و الحکماء''۔ ابن خلّکان) کا الزام لگایا [اور اپنے دستخطوں سے محضر تیار کیا، جس سے اس کا خون مباح ہوتا تھا]، چنانچہ اُسے بھاگ کر حماۃ جانا پڑا۔ حماۃ میں اس نے ایّوبی سلطان الملک المنصور [ناصر الدّین محمد بن الملک المظفر تقی الدین عمر] کی ملازمت اختیار کر لی (۶۱۵ھ/ ۱۲۱۸ - ۱۲۱۹ء)۔ المنصور کی وفات (۶۱۷ھ) پر سلطان الملک المُعظّم [شرف الدین عیسٰی بن الملک العادل ابی بکر ایّوبی] نے اسے دمشق بلا کر مدرسۃ العزیزیّۃ کا صدر بنا دیا (۶۱۷ھ/ ۱۲۲۰ - ۱۲۲۱ء)۔ مگر الملک الاشرف نے اُسے ۶۲۹ھ/ [۱۲۳۲ء] میں اس عہدے سے اِس بنا پر معزول کر دیا کہ وہ فلسفہ پڑھاتا رہا تھا۔ اس نے صفر ۶۳۱ھ/ نومبر ۱۲۳۳ء میں دمشق میں وفات پائی۔

[اُس کے شاگرد ابن ابی اُصَیبِعَہ نے اسے اوحد فضلا اور سیدِ علما لکھا ہے اور کہا ہے کہ وہ اپنے زمانے کا ذکی ترین آدمی تھا؛ علومِ حِکمیّہ اور مذاہبِ شرعیّہ اور مبادی طبیّہ کو اُن سب سے زیادہ جاننے والا، خوش شکل، فصیح الکلام، جیّد التصنیف شخص تھا۔ ابنِ خلکان نے بھی کہا ہے کہ معقول میں سے اُس نے بہت کچھ حفظ کیا اور اس میں ماہر ہوا، اس کے زمانے میں ان علوم کا حافظ اس سے زیادہ کوئی نہ تھا]۔

اس کی [کوئی بیس مفید تصانیف اصول الدّین، فقہ، منطق، حکمت اور خلاف] سے متعلّق ہیں؛ [مثلاً] اَبکار الافکار [جو علم کلام میں ہے اور] مخطوطے کی شکل میں ملتی ہے۔ یہ فلسفیوں، معتزلیوں، صابئین اور مانویّہ کے ردّ میں ہے۔ [اس کی منائح القرائح (کتاب مذکور کا اختصار ہے)]۔ اصول الدّین پر اُس نے احکام الحُکّام فی اصولِ الاَحکام، الملک المُعظّم کے نام پر لکھی، طبع قاہرہ ۱۳۴۷ھ؛ مُنْتَھَی السُّئُول [فی الأُصول]، طبع قاہرہ، بلا تاریخ، اسی کا خلاصہ ہے۔ اُس کی ذیل کی تصنیفات مخطوطات کی شکل میں موجود ہیں۔ فنِ مناظرہ پر الجَدَل، فلسفے پر دقائق الحقائق فی المنطِق، التمویھات [فی شرح التنبیھات]، جو المنصور کے نام پر لکھی گئی اور ابن سینا کے ردّ میں ہے۔

مآخذ: (۱) سُبکی: طبقات الشّافعیۃ، ۵: ۱۲۹ - ۱۳۰؛ (۲) ابن خَلّکان: قاہرہ ۱۹۴۸ء، ۲: ۴۵۵، شمارہ ۴۰۵، [طبع قاہرہ ۱۳۱۰ھ، ۱: ۳۲۹]؛ (۳) ابن ابی اُصَیبِعَہ، ۲: ۱۷۴؛ (۴) ابن القِفطی: ص ۲۴۰ - ۲۴۱؛ (۵) النُّعَیمی: الدارِس، دمشق ۱۹۴۸ - ۱۹۵۱ء، ۱: ۳۶۲، ۳۸۹، ۳۹۳؛ ۲: ۴، ۱۲۹؛ (۶) براکلمان: GAL، ۱: ۳۹۳ - ۳۹۴؛ تکملہ، ۱: ۶۷۸؛ المشرق، ۱۹۵۴ء، ص ۱۶۹ - ۱۸۱.

(D. SOURDEL سُورڈِل)

----

* **الآمر بِأحکامِ اللہ:** ابو علی المنصور، فاطمی خاندان کا دسواں خلیفہ، جس کی تاریخ پیدائش ۱۳ محرّم ۴۹۰ھ/ ۳۱ دسمبر ۱۰۹۶ء ہے۔ وہ ابھی پانچ سال کا بچّہ تھا کہ وزیر الافضل نے اس کے باپ خلیفہ المُستعلی کی وفات پر، جو ۱۴ صفر ۴۹۵ھ/ ۸ دسمبر ۱۱۰۱ء کو واقع ہوئی، اس کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ اس کے متّصل بعد کے بیس سال تک زمام حکومت وزیر الافضل [رکّ بآن] کے ہاتھ میں رہی۔ ۵۱۵ھ/ ۱۱۲۱ء میں [المُستعلی کے بھائی] نزار کے فرستادہ آدمیوں نے الافضل کو قتل کر دیا، لیکن اس قتل کی سازش میں شرکت کا الزام خلیفہ پر بھی لگایا گیا۔ الافضل کی جگہ المأمون بن البَطائحی [رکّ بآن، در آ، طبع دوم] وزیر مقرّر ہوا مگر وہ بھی اپنی باری پر ۴ رمضان ۵۱۹ھ/ ۱۱۲۵ء کو قید کر دیا گیا (اور تین سال بعد قتل ہوا)۔ اس کے بعد کوئی نیا وزیر مقرّر نہ ہوا، لیکن مالیہ کا عیسائی صدر محصّل نَجاح بن قنّاء کا بہت اثر و رسوخ رہا، مگر ۵۲۳ھ/ ۱۱۲۹ء میں وہ بھی گرفتار ہو کر مارا گیا۔

الافضل کے عہدِ وزارت میں صلیبیوں کے مقابلے میں کچھ سرگرمی دکھائی گئی اور سَعد الدّولہ الطّواشی (۴۹۵ھ/ ۱۱۰۱ء)، الافضل کے بیٹے شَرَف المعالی (۴۹۶ھ/ ۱۱۰۲ء)، تاج العجم و ابن قادُوس (۴۹۷ھ/ ۱۱۰۳ء)، جَمال المُلک (۴۹۸ھ/ ۱۱۰۴ء)، الافضل کے ایک اَور بیٹے سَناء المُلک الحُسین (۴۹۹ھ/ ۱۱۰۵ء) اور بعد ازاں الاَعَزّ (۵۰۵ھ/ ۱۱۱۲ء) اور مسعود (۵۰۶ھ/ ۱۱۱۳ء) کے زیرِ قیادت متعدّد مہمیں بھیجی گئیں (فلسطین میں ان جنگی سرگرمیوں کا بڑا مرکز عَسقَلان تھا)۔ اس کے باوجود فلسطین اور شام کے ساحلی علاقے کا بیشتر حصّہ صلیبیوں کے قبضے میں چلا گیا، طَرطُوس ۴۹۵ھ/ ۱۱۰۲ء میں، عَکّہ ۴۹۷ھ/ ۱۱۰۳ء میں، طرابُلُس [الشّام] ۵۰۲ھ/ ۱۱۰۹ء میں (قبّ مادّہ ''عمّاریّہ'')، صَیدا ۵۰۴ھ/ ۱۱۱۱ء میں، صُور ۵۱۸ھ/ ۱۱۲۴ء میں۔ بالڈون (Baldwin) شاہ یروشلم [القدس] نے ۵۱۱ھ/ ۱۱۱۷ء میں خود مصر پر بھی چڑھائی کی اور فَرَما پر قبضہ کر کے تِنّیس تک جا پہنچا، مگر بیمار ہو جانے کی وجہ سے واپس آنے پر مجبور ہوا اور راستے ہی میں مر گیا۔

مصر پر [بربروں کے] لُواتہ قبائل کی یلغار اس عہد کا ایک اَور قابلِ ذکر واقعہ ہے؛ وہ اسکندریہ تک پہنچ گئے تھے، لیکن [وزیر] المأمون نے انھیں پسپا کر دیا.

الآمِر کے عہد میں نِزاری شِقاق و اختلاف سے فاطمی خاندان اسمٰعیلی اعتزالیوں (''diaspora'') کے حصّۂ غالب کی حمایت سے محروم ہو گیا، بلکہ خود مصر کا ملک معرضِ خطر میں آ گیا۔ لہٰذا المأمون کو تادیبی کارروائی کرنا پڑی، تاکہ

نزاری فرقے کے گماشتے مصر میں داخل نہ ہو سکیں نیز قاہرہ میں ایک بڑا عام مظاہرہ کیا گیا (شوّال ۵۱۶ھ/دسمبر ۱۱۲۲ء) تاکہ نزاری دعوے کے باطل ہونے اور مُستَعلی شاخ کے شرعًا برحق ہونے کی تشہیر کی جائے۔ اس موقع کا ایک وثیقہ جو الهداية الآمِريّة کے عنوان سے شائع کیا گیا تھا محفوظ رہ گیا ہے (طبع آصف علی اصغر فیضی (A. A. A. Fyzee)، اوکسفرڈ ۱۹۳۸ء).

۵۲۴ھ/۱۱۳۰ء میں الآمر کے ہاں تاج و تخت کا وارث پیدا ہوا، جس کا نام الطّیّب رکھا گیا۔ مگر یہ معلوم نہیں کہ اس کا کیا انجام ہوا۔ ۲ ذوالقعدہ ۵۲۴ھ/ ۱۸ اکتوبر ۱۱۳۰ء کو خلیفہ الآمر باحکام اللہ نزاریوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا اور ناگہانی تغیّر کا دور شروع ہوا (قب مادّہ ہاے ''الافضل''، و ''کُتَیفات''، و ''الحافظ''، در آ، طبع دوم).

مآخذ: (۱) ابن المُیَسَّر: اخبار مصر (طبع Massé)، ص ۴۲-۴۳، ۵۶-۶۷ (بعض عبارتیں، جو ناقص مخطوطے میں موجود نہیں، النُّوَیری نے فاطمیوں سے متعلّق باب میں محفوظ کر دی ہیں)؛ (۲) ابن الاَثیر: [الکامل] بہ امداد اشاریہ؛ (۳) ابن خَلِّکان، شمارہ ۵۳و ۷۵ و ۲۸۰ [طبع قاہرہ ۱۳۱۰ھ، ۲:۱۲۸؛ ۱:۵۷] (ترجمہ از دیسلان (de Slane)، ۳:۴۵۵)[و ۱:۱۵۹]؛ (۴) ابوالفداء (طبع (Reiske-Adler)، بہ امدادِ اشاریہ؛ (۵) ابن خَلدُون: عِبَر، ۴: ۶۸-۷۱؛ (۶) ابن تَغری بِردی، ۲:۳۲۶-۳۹۱، اور جابجا؛ (۷) ابن دُقماق: انتصار، بہ امدادِ اشاریہ؛ (۸) مقریزی: خِطَط، ۱:۴۶۸-۴۹۳؛ ۲:۱۸۱، ۲۸۹ بعد؛ (۹) سُیُوطی: حسن المحاضرة، ۲:۱۶ بعد؛ (۱۰) H. C. Kay: *Yaman, its early medieval history by Najm al-Din Omārah al-Ḥakamí*، بہ امدادِ اشاریہ؛ (۱۱) Röhricht: *Gesch. d. Königreiches Jerusalem*، جابجا؛ (۱۲) R. Grousset: *Histoire des Croisades*، ج ۱، جابجا (بالخصوص ص ۲۱۸-۲۸۴، ۵۹۷-۶۱۸)؛ (۱۳) F. Wüstenfeld: *Gesch. der Fatimiden-Chalifen*، ص ۲۸۰ بعد؛ (۱۴) S. Lane-Poole: *A hist. of Egypt*، بہ امدادِ اشاریہ؛ (۱۵) B. Lewis در *History of the Crusades*، فلاڈلفیا ۱۹۵۶ء، ۱:۱۱۸ بعد؛ (۱۶) S. M. Stern: *The Epistle of the Fatimid caliph al-Āmir* (*al-Hidāya al-Āmiriyya"* [الهداية الآمِريّة]) در *JRAS*، ۱۹۵۰ء، ص ۲۰-۳۱؛ (۱۷) وہی مصنف: *The Succession to the Fātimid caliph al-Āmir*، در *Oriens*، ۱۹۵۱ء، ص ۱۹۳ بعد؛ اور قب مآخذ مادّہ ہاے ''الافضل''، ''المأمون ابن البطائحی''، در آ، طبع دوم.

(S. M. STERN)

----

* **آمُل:** دو شہروں کا نام.

(۱) مازَندَران کے مشرقی میدان کے جنوب مغربی کونے میں ایک شہر ہے، جو دریاے ہَرہاز کے کنارے بحیرۂ خزر کے جنوب میں بارہ میل کے فاصلے پر اُس ضلع میں واقع ہے جو کلاسیکی مصنّفین کے بیان کے مطابق ماردُواۓ *Μάρδοι* [مردی] (امارد واۓ Αμάρδοι [امردی] قوم کے لوگوں کا گہوارہ تھا (ہو سکتا ہے کہ آمُل جدید فارسی میں قدیم (مفروضہ) ایرانی نام اَمَرْدَھہ (Amardha) کی بدلی ہوئی صورت ہو)۔ ابن اسفندیار (تأریخ طبرستان، تہران ۱۹۴۱ء، ص ۶۲ بعد) کا بیان ہے کہ آمُل کی بنیاد ایک دَیلَمی سردار کی بیٹی اور بلخ کے بادشاہ فیروز کی بیوی آمُلَہ نے رکھی تھی، ادھر حمد اللہ مُستَوفی (نُزہَۃُ القلوب، ص ۱۵۹) کہتا ہے کہ اس شہر کا بانی شاہ طَہمُورَث تھا، لیکن یہ محض افسانے ہیں۔ ساسانیوں کے عہد میں آمل کے ضلع اور گیلان (Gēlān) (موجودہ گیلان) کو ملا کر ایک نسطوری اُسقُفی کے مقرّ کی تشکیل ہوتی تھی (*ZDMG*، ۴۳: ۴۰۷)۔ شاہنامہ (فردوسی) میں بھی اس شہر کا ذکر کئی مرتبہ آیا ہے۔ مسلمانوں کے عہد میں آمُل ایک اہم تجارتی اور صنعتی مرکز بن گیا۔ مُؤرّخِ اعظم طَبَری اور مشہور فقیہ ابوالطیّب الطبری اسی شہر میں پیدا ہوے تھے۔ حدود العالم (ص ۱۳۴، ۱۳۵) کا مجہول الاسم مصنّف آمُل کو ایک بڑا شہر اور طبرستان کا دارالحکومت بتاتا ہے۔ ان دنوں یہ شہر بہت خوش حال تھا اور بہت سے تاجروں اور علما کا مسکن۔ یہاں متعدّد صنعتیں موجود تھیں اور اس کے گرد و نواح کے علاقے میں طرح طرح کے میوے کثرت سے پیدا ہوتے تھے۔ تقریبًا اسی زمانے میں ابن حَوقَل کہتا ہے کہ آمُل کا شہر قزوین سے بڑا تھا.

آمُل کو محمود غزنوی کے بیٹے مسعود نے ۴۲۶ھ/[۱۰۳۴-۱۰۳۵ء] میں تاراج کیا اور اس کے تقریبًا ۳۵۰ سال بعد تیمور نے اس پر تُرکتاز کی۔ سر ٹامس ہربرٹ، جو ۱۶۲۸ء میں آمُل گیا تھا، آمُل کو ایک ''پرمیوہ اور بابرکت'' شہر بتاتا ہے اور لکھتا ہے کہ ''اس میں تین ہزار مکان ہیں، جو بہت کم حیثیّت کے نہیں'' (*A Relation of a Journey begun in 1610*، لنڈن ۱۶۳۲ء، ص ۱۰۶-۱۰۷)۔ آمُل کئی بار زلزلوں اور سیلابوں کے ہاتھوں تباہ ہوا لیکن اُن تباہیوں کے باوجود اب بھی خاصا بڑا شہر ہے۔ (موجودہ آمُل پرانے شہر کے محلِّ وقوع سے کسی قدر مشرق میں واقع ہے؛ پرانے شہر کے کھنڈر دور تک پھیلے ہوے ہیں).

موجودہ آمُل ایک خوبصورت شہر ہے اور اس کے مکانات پختہ اینٹوں کے بنے ہوے ہیں، جن کی چھتیں سرخ ٹائلوں کی ہیں۔ آمُل اپنے مضافات سے، جو ہَرہاز کے مشرقی کنارے پر واقع ہیں، ایک عمدہ پل کے ذریعے ملا ہوا ہے، جس میں بارہ محرابیں ہیں۔ اسی طرح یہ شہر سڑکوں کے ذریعے مشرق میں بحیرۂ خزر کی چھوٹی سی بندرگاہ محمود آباد اور بارُبُل (بارفُرُوش) سے اور مغرب میں چالُوس اور رَشت سے ملا ہوا ہے۔ ۱۹۴۱ء میں آمُل کی آبادی ۱۴,۱۲۶ تھی لیکن موسم کے لحاظ سے آبادی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، کیونکہ بہت سے لوگ گرمی کے موسم میں گرمی اور مچھروں سے بچنے کے لیے پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں.

مآخذ: (۱) یاقوت، ۱:۶۸؛ (۲) لی سٹرینج (Le Strange)، ص ۳۷۰؛

(۲) اُوزْلے (Sir W.Ouseley): *Travels in various countries of the East*، لنڈن ۱۸۱۹ء، ص ۲۹۶ - ۳۱۶؛ (۴) B. Dorn: *Auszüge aus muhammed. Schriftstellern betreffend die Gesch. und Georg. der südl. Küstenländer des Kaspischen Meeres*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۵۸ء، ص ۳۸۲؛ (۵) شپیگل (F. Spiegel): *Eranische Altertumskunde*، لائپزگ ۱۸۷۱ء، ۱: ۷۰؛ (۶) E. Reclus: *Nouv. géogr. univ.*، ۹: ۲۳۵، ۲۳۷؛ (۷) پاؤلی وسووا (Paully-Wissowa)، بذیلِ مادّہ ہاے Amardoi، Amarusa؛ (۸) رابینو (H. L. Rabino): *Mazandaran and Astarabad*، لنڈن ۱۹۲۸ء، ص ۳۳ - ۴۰.

(L. Lockhart لاکہارٹ)

[آمُل (دوم)]: ایک شہر، جو ۳۹ درجہ، ۵ دقیقہ عرض بلد شمالی اور ۶۳ درجہ ۱۴ دقیقہ طول بلد مشرقی پر آمو دریا کے بائیں کنارے سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ ازمنۂ وسطٰی کے عربی دور میں آمُل خراسان کی وسیع ولایت میں شامل تھا، مگر آج کل (چارجُو یا چارجُوی کے نام سے) جمہوریۂ شوروی ترکمنستان میں شامل ہے۔ اگرچہ آمُل کے ہر طرف صحرا ہے مگر کسی زمانے میں تجارتی کاروانوں کے نقطۂ نظر سے اُسے بڑی اہمیّت حاصل تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ شہر خراسان سے ماوراء النہر اور خیوہ کو جانے والی تجارتی شاہراہوں کے مقام اتّصال پر واقع تھا۔ آلِ سامان کے فرمانروا اسمٰعیل نے ۲۸۷ھ/ ۹۰۰ء میں محمد بن بشیر عَلوی اور اس کے لشکر کو آمُل کے قریب شکستِ فاش دی تھی۔ مغلوں کے حملے اور تیمور کی فتوحات کا حال بیان کرنے والے مآخذ میں آمُل کا ذکر کئی بار آیا ہے۔ اس شہر کے نام کو (آمُلِ [مازندران] کی طرح) ماردوائے (Μάρδοι) (امادروائے Aμάρδοι) قوم، خصوصاً اس کی مشرقی شاخ، سے منسوب کیا جا سکتا ہے (قب بلینیوس Pliny، ۶: ۴۷)۔ جیسا کہ یاقوت نے لکھا ہے "اس شہر کو آمُلِ [مازندران] سے متمیّز کرنے کے لیے بعض اوقات اس کے نام کے ساتھ اضافی کلمات شامل کر دیے جاتے تھے، مثلاً اسے کبھی آمُلِ زَمّ کہتے تھے (قب مثلاً البلاذری، طبع ڈخویہ، ص ۴۱۰ و ۴۲۰)، یعنی آمُل جو زَمّ کے قریب ہے (زَمّ موجودہ کرکی [جو کرخی کا پرانا نام ہے۔ یہ مقام] آمُل سے جنوب مشرق کی جانب ۱۲۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے) اور کبھی آمُل جیحون، یعنی دریا جیحون والا آمُل، یا آمُل الشطّ، یعنی دریا پر کا آمل، کہتے تھے۔ اس شہر کا ایک اور نام، جو زمانۂ وسطٰی میں استعمال ہوتا رہا ہے، آمُوْیہ (قب بالخصوص البلاذری، ۴۱۰؛ یاقوت، ۱: ۶۵،۳) یا آمُو (یاقوت، ۱: ۷۰) ہے۔ نام کی یہ آخری صورت شاید مقامی عوامی بولی سے ماخوذ ہوگی، جس سے ممکن ہے زمانۂ وسطٰی میں دریاے جیحون کا نام "آمُو دریا" نکلا ہو۔ یعنی آمُو کا دریا (یہ خیال بارٹولڈ کا ہے، قب مادّہ "آمُو دریا") لیکن یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس دریا کے ایک پرانے مقامی نام آمو سے اس شہر کا نام آمُویہ پڑ گیا ہو۔ موجودہ نام چارجُوی (چار ندیاں) دریاے جیحون کے ایک اہم گھاٹ کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو اس مقام سے قریب ہی واقع ہے۔ اب چارجوی ریل سے مغرب میں مَرو اور کراسنو وَوڈسک (Krasnovodsk) سے اور شمال مشرق میں بخارا، سمرقند اور تاشقند سے ملحق ہے۔ ریل کی لائن دریاے جیحون کو ایک لمبے پُل کے ذریعے عبور کرتی ہے، جو شہر کے شمال مشرق میں ہے۔

مآخذ: (۱) یاقوت، ۱: ۶۹، ۷۰، ۳۶۵؛ (۲) لی سٹرینج (Le Strange)، ص ۴۰۳ ببعد، ۴۳۴؛ (۳) مارکارٹ (Marquart): *Eranšahr n.d. Geo-gr. d. Pseudo Moses-Xorenac'i*، برلن ۱۹۰۱ء، ص ۱۳۶، ۳۱۱؛ (۴) وہی مصنّف: *Untersuchungen zur Gesch.von Eran*، لائپزگ ۱۸۹۵ء، ۲: ۵۷.

(M. Streck شٹرک)

معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کا موجودہ نام چارجوی تیموریوں کے عہد میں پڑا تھا۔ بابر ۹۰۳ھ/ ۱۴۷۷ - ۱۴۷۸ء کے واقعات کا حال بیان کرتے ہوئے (بابر نامہ، طبع بیورج (Beveridge)، ورق ۵۸) دریا کے چار جُو والے گھاٹ ('چارجُو گُذری') کا ذکر کرتا ہے۔ ۹۱۰ھ/ ۱۵۰۴ء میں چارجُو کے قلعے (محمد صالح: شیبانی نامہ، طبع Melioranski، ص ۱۹۷: "چارجُو قلعَہ سی" [بنّائی:] شیبانی نامہ فارسی میں، جس کا اقتباس Samoilovič: *Zap. Vost. Otd. Arkh. Obshc.*، ۱۹: ۱۷۳ میں دیا ہے: "قلعۂ چہار جوی") کو اُزبکوں کے آگے ہتھیار ڈالنا پڑے۔

ازمنۂ وسطٰی کی طرح ازبکوں کے تسلّط کے زمانے میں بھی دریاے جیحون کو عبور کرنے کا سب سے اہم مقام چارجوی تھا۔ اس مقصد کے لیے اس جگہ ہر وقت کشتیاں تیار رہتی تھیں۔ بڑے بڑے لشکروں کے گزرنے کے لیے بعض اوقات یہاں کشتیوں کے پل تیار کر لیے جاتے تھے، مثلاً ۱۱۵۳ھ/ ۱۷۴۰ء میں، جب نادر شاہ کے لشکر کے لیے اس قسم کا پل تیار ہوا۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے کسی مستند مصنّف نے اس دور میں یہ نہیں کہا کہ چارجوی کوئی بڑا شہر ہے، چہ جائیکہ یہ کہا ہو کہ وہ کسی قابلِ ذکر اہمیّت کے شہزادے یا والی کی قیام گاہ ہے (قب Burnes: *Travels*، ۳: ۷ ببعد [یہ سیّاح ۱۸۳۲ء میں اس شہر میں گیا تھا]؛ وولف (J.Wolff): *Narrative of a Mission to Bokhara*، ۱۸۴۴ء، ص ۱۶۲ ببعد سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے؛ Mushketow: *Turkestan*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۶ء، ص ۲۰۶ ببعد۔ [وہ چارجوی میں ۱۸۷۹ء میں تھا]).

۱۸۸۴ء میں مرو کے ترکمانوں کو روس کی اطاعت قبول کرنا پڑی اور کاروانوں کی پرانی شاہراہ کی جگہ ریلوے لائن بن گئی، جو ۱۸۸۶ء میں آمو دریا تک پہنچ گئی۔ اس سے چارجوی کی اہمیّت بہت جلد بڑھ گئی۔ اس شہر کی، جہاں بخارا کا ایک بیگ رہا کرتا تھا، روسی انقلاب سے پہلے آبادی پندرہ ہزار نفوس تھی۔

چارجوئِ قدیم سے دس میل دور اور ریلوے سٹیشن آمودریا کے قریب، اس زمین پر جو بخارا کے امیر نے روسی حکومت کو دے دی تھی، ایک نیا قصبہ آباد ہوا، جو روس کے ایک فوجی کمانداں کا مستقر تھا اور جس کی آبادی ۱۹۱۴ء میں چار پانچ ہزار تک تھی۔ ۱۹۰۱ء میں آمودریا پر ریلوے کا ایک پل تعمیر ہوا اور اس طرح سے چارجوی، ــ، بخارا ــ، تاشقند کے درمیان ریلوں کی آمد و رفت کا پختہ انتظام ہو گیا.

شوروی حکومت کے ماتحت جدید چارجوی ایک اہمّ اداری مرکز اور ۱۹۲۴ء کے بعد سے ایک بڑا صنعتی مرکز بن گیا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں اس کی آبادی بڑھ کر ۱۳,۹۵۹ ہو گئی تھی، اس میں سے ۸,۰۶۹ روسی، ۱۸۴۶ ارمنی، ۱۵۲۵ ازبک اور صرف ۴۵۸ ترکمان تھے۔ ۱۹۳۳ء تک آبادی ۵۴,۵۰۰ ہو گئی مگر ترکمان بہرحال اقلیّت ہی میں رہے۔ ۱۹۵۵ء میں آمل جمہوریۂ شورویۂ ترکمنستان کا دوسرا بڑا شہر بن گیا۔ کچھ عرصے تک (۱۹۳۰ء سے پہلے) یہ تجویز زیر غور رہی کہ اس شہر کو جمہوریۂ مذکور کا صدر مقام بنا دیا جائے۔ ۲۱ نومبر ۱۹۳۹ء سے چارجوِ نَو اس نام کے ضلع (oblast) کا صدر مقام چلا آ رہا ہے۔ یہ جدید طرز کا ایک شہر ہے، جو پورے کا پورا سیدھے خطوط میں بنایا گیا ہے۔ اس کے تعمیری منصوبے میں یہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ اس کی آبادی آگے چل کر دو لاکھ ہو جائے گی۔ یہ شہر بے شمار صنعتوں کا گھر ہے اور مواصلات کا اہمّ مرکز۔ [مواصلات کی تفصیل یہ ہے] ریل کی صورت میں: کراسنووڈسک (Krasnovodsk) ــ تاشقند کی لائن ہے اور چارجوی ــ قونگرات (Kungrat) کی لائن؛ سڑک کی صورت میں: چارجوی ــ خیوہ والی موٹر کی سڑک؛ دریا کی صورت میں: آمودریا میں ترمِذ (تِرمِذ) سے بحیرۂ آرال تک جہاز رانی ہو سکتی ہے.

چارجوی کا پرانا شہر (موجودہ کا گانووِیچِسک Kaganovičesk) مضافاتِ چارجوی سے پانچ میل کے فاصلے پر اب مزدوروں کی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ ۱۹۳۱ء میں اس کی آبادی صرف ۲,۰۴۲ تھی، جس میں زیادہ تر سالور (Salor) قبیلے کے ترکمان اور ازبک شامل تھے.

چارجوی ضلع (oblast') کا، جو ۲۱ نومبر ۱۹۳۹ء کو بنایا گیا تھا، کل رقبہ ۳۶ ہزار مربّع میل ہے۔ یہ مشرقی ترکمنستان میں واقع ہے۔ نخلستانِ چارجوی، جو آمودریا اور صحرائے قرہ قُوم کے درمیان پھیلا ہوا ہے، اس ضلع کا مرکز ہے۔ یہ ضلع زرخیز زراعتی علاقہ ہے (ریشم کی پیداوار، باغبانی، کپاس کی کاشت، انگور کی کاشت اور قَرہ قلی بھیڑوں کی پرورش یہاں کے لوگوں کے اہمّ مشاغل ہیں).

(A. BENNIGSEN)

----

* **آمِنہؓ**: نبی [کریم ﷺ] کی والدہ۔ آپ کے والد وَہب بن عبدمناف بن زُہرہ القُرَشی تھے اور والدہ بَرّہ بنت عبدالعُزّٰی [بن عثمان بن عبدالدار]۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے ولی آپ کے چچا وُہَیب [یا اُہَیب] ابن عبدمناف تھے اور جس روز انھوں نے عبداللہ ابن عبدالمُطّلِب کے ساتھ آمنہ کی منگنی کی اسی روز اپنی بیٹی ہالہ کی نسبت عبدالمُطّلِب کے ساتھ کر دی (ابن سعد، ۱/۱: ۵۸)..... معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کے بعد [بی بی] آمنہ اپنے میکے ہی میں رہیں اور عبداللہ وہیں آتے جاتے رہے۔ عبداللہ کے بارے میں عام روایت یہی ہے کہ وہ نبی [کریم ﷺ] کے پیدا ہونے سے پہلے وفات پا گئے تھے۔ جب تک آمنہ زندہ رہیں نبی [کریم ﷺ] نے انھیں کی نگرانی میں پرورش پائی؛ گویا بظاہر انھیں کے گھر والوں کے ساتھ رہے (سوا اس زمانے کے جب آپؐ کو ایک بدوی قبیلے کی انّا [حلیمہ] کے پاس بھیج دیا گیا تھا)۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب رسول [کریم ﷺ] چھے سال کے تھے تو [بی بی] آمنہ نے مدینے سے واپس آتے ہوے، جہاں وہ [رسول اللہ ﷺ] کے [جدّی] رشتے داروں سے ملنے گئی تھیں، مکّے اور مدینے کے درمیان الاَبواء کے مقام پر وفات پائی۔ [گو] مدینے کی طرف [حضرت] آمنہ [کے اس سفر کے پورے کوائف معلوم نہیں] لیکن مذکورۂ بالا روایت کو ردّ کرنے کی کوئی معقول وجہ بھی نہیں ہے۔ ایک اَور روایت کی رُو سے [ابن ہشام، ص ۱۰۲] جب وہ حاملہ تھیں تو ایک رات انھوں نے دیکھا کہ ایک نور ان کے جسد مبارک سے نکلا اور اس سے ملکِ شام کے [شہر] بُصْرٰی (Bostra) کے محلّات [انھیں نظر آئے].

مآخذ: (۱) ابن ہشام، ص ۷۰، ۱۰۰ ـ ۱۰۲، ۱۰۷؛ (۲) ابن سعد، ۱/۱: ۶۰ ببعد، ۷۳ ببعد؛ (۳) طبری، ۱: ۹۸۰، ۱۰۷۸ ـ ۱۰۸۱؛ [(۴) مُصْعَب الزُبیری: نسب قریش، قاہرہ ۱۹۵۳ء، ص ۶۲۱؛ (۵) محمد بن حبیب: المُحَبَّر، بہ اِمدادِ اشاریہ]؛ (۶) ابن حَجَر العَسْقَلانی: الاصابة، طبع کلکتہ، ۱: ۲۶۷، شمارہ ۱۸۱۸]؛ (۷) Caetani: *Annali*، ۱: ۱۱۹ ببعد، ۱۵۰، ۱۵۶ ببعد.

(W. MONTGOMERY WATT [و ادارہ])

⊗ **آمو دریا**: یونانی مآخذ میں اس دریا کا جو نام ملتا ہے یعنی Ὦξος (نیز Ὦξοε؛ لاطینی اَوُکسُس) وہ یقیناً ترکی لفظ اوغُوز (ögüz) سے ماخوذ ہے دیکھیے کاشغری، ۱: ۵۹، ۳۲۲؛ ۳: ۲۵۲)، جس کے معنٰی ہیں ''بڑا دریا''، اور جس کا اطلاق آمو دریا، سِیر دریا اور ان کے معاون دریاؤں پر خصوصیت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس نظریے سے، جسے سب سے پہلے وَامُبیری (Vambéry) نے پیش کیا تھا (*Die Scheibaniade*، لائپزگ ۱۸۸۵ء، مقدّمہ، xii؛ *Das Türkenvolk*، لائپزگ ۱۸۸۵ء، ص ۵، ۳۸۳)، ہم آگے چل کر البیرونی کے Ὠξειάνοί (''آمو دریا والے'') لوگوں سے متعلّق ملاحظات کے ضمن میں دوبارہ دوچار ہوں گے۔ ترکی ناموں اوزبوی (özboy) یعنی اوغوز بوی (ögüz boyu) (نقشوں میں Uzboy) اور قاغان اوغوزو (Qagan Ögüzü) کو دیکھ کر وہ زمانہ یاد آتا ہے جب ترک آمو دریا کو (Ögüz) کہتے تھے۔ مارکار (Marquar)، *Wehrot und Arang*، لائپزگ ۱۹۳۹ء،

ص ۳) لفظ اوکسوس (oksos) کو وَخشُو (vaḫṣu) سے مشتق سمجھتا ہے، جو اس کے خیال میں قدیم ایرانی زبانوں میں ''بڑھنے والے'' اور ''لبریز، طغیان کنندہ'' کے معنی میں آتا تھا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ وَخش، جو ''سُرخ آب'' کے زیریں حِصّوں کا نام ہے (سرخ آب آمو دریا کے عمود کے بالائی دائیں بازو کو کہتے ہیں جو بالائی حِصّوں میں ''قِزِیل صُو'' کہلاتا ہے) اور وخش اور وآخشُو کا لفظ جو قدیم خوارزمیوں اور افتالیوں [ہَیاطِلَہ] کے ہاں ''پانی کے دیوتا'' اور خصوصاً آمو دریا کی روح کے لیے استعمال ہوتے تھے (دیکھیے مارکار (Marquart)، کتابِ مذکور، ص ۳۳)، اسی لفظ ögüz=oxos کی حلقی شکلیں ہیں (دریاے وَخش کے کنارے رہنے والے ترک اس لفظ کا تلفّظ اوغوش (ögüş) کرتے ہیں) یا کسی قدیم ایرانی لفظ سے ماخوذ ہیں۔ بہرحال پانی کا وہ مذہبی عقیدہ جس کا تعلّق آمو دریا سے ہے ان ترکوں میں بھی موجود تھا جو آمو دریا اور سیر دریا کے طاسوں میں رہتے تھے (دیکھیے زکی ولیدی طوغان: *Ibn Fadlan's Reisebericht*، ص ۲۶۵)۔ یہ معلوم ہے کہ ساسانیوں کے زمانے میں ایرانی اس دریا کو ''وِہ رُود'' یا ''بِہ رُود'' کہتے تھے (دیکھیے مارکار: کتابِ مذکور، ص ۱۶، ۳۵)۔ اسلامی عہد میں آمو دریا اور سِیر دریا کے نام اناطولی کے جیحان [=Pyramus] اور سَیحان [=Sarus] کے ناموں پر جیجون اور سیحون ہی رکھ دیے گئے، لیکن یہ نام کبھی عوام کی زبان پر رواں نہ ہوے اور صرف کتابوں میں باقی رہ گئے (یاقوت [۱: ۱۷۱] کے ترجمۂ ''جیحون'' میں ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ نام وادی خراسان کے ایک شہر ''جَیہان'' کے نام سے لیا گیا تھا لیکن یہ محض قیاس ہے)۔

جہاں تک آمو دریا کے نام کا تعلّق ہے یہ ''آبِ آمُویہَ''، ''دِریای آمُویہَ'' اور ترکی میں ''آمُل دِریاسی'' یا ''آمو دِریاسی'' کے الفاظ سے ماخوذ ہے، جن کا تعلّق آمُل اور آمُویہَ سے ہے، یہ اُس قصبے کے پرانے نام ہیں جو آج کل ''چارجوی'' کہلاتا ہے۔ عرب اس دریا کو ''نہرِ بلخ'' بھی کہتے تھے۔ چینی ماٰخذ میں اس دریا کا نام ''کُوئی شُوئی'' ہے (یعنی دریاے کُوئی، دیکھیے مارکار: کتابِ مذکور، ص ۳)، جس کے معنی لازماً دریاے اوکُوز (Öküz) ہی ہو سکتے ہیں۔ عربوں کی کتبِ جغرافیہ میں آق صُو (Aksu) (= ''پنج نہری''، کو، جو آج کل آمو دریا کی بالائی گزرگاہ سمجھا جاتا ہے، وَخاب لکھا گیا ہے، جو پامیر میں بسنے والی ایک قوم وَخ (یا وَخان) کے نام سے موسوم ہے۔ تیموری مؤرّخین (ظفر نامہ، کلکتہ ۱: ۱۷۹ ببعد) پنج دریا کو آمو دریا کا منبع خیال کرتے ہیں، لیکن آمو دریا کے مقامی باشندے اس کا منبع دریاے وَخش (قِزِیل صُو، سُرخ آب) کو سمجھتے ہیں، جو [آلای Alay = پامیر۔ بارٹولڈ: ترکستان، ص ۷۰، س ۷] کے پہاڑوں سے آتا ہے۔ کتابوں میں اصل دریا کو جیجون (آمو دریا) کا نام اس مقام سے دیا جاتا ہے جہاں اس کی پانچ شاخیں پہاڑوں سے میدان میں آ کر یکجا ہو جاتی ہیں۔ ان پانچ شاخوں کے نام اِصطخری (ص ۲۹۶) میں یوں درج ہیں: (۱) اَخشُو (یخ صُو)، (۲) بُربان (= گُولاب دریا)، (۳) فازغَر (= بلجُوان قِزِیل صُویُو)، (۴) اَنڈیجاراغ (= تایر صُو) اور وَخاب (پنج) اور ان کا سنگم آرھَن سے ذرا اوپر دکھایا گیا ہے (جواب ''حضرتِ امام صاحب'' کے نام سے دریا کے بائیں کنارے پر واقع ہے)۔ بیرونی اس مقام کو ''خُوبُسارِے'' (یا ''خُوسارِے'') کہتا ہے (احمد زکی ولیدی طوغان: *Beruni's Picture of the world*، نئی دہلی ۱۹۳۹ء، ص ۴۳)۔ دوسروں کے بیان کے مطابق وَخش اور کافرنہان ان پانچ دریاؤں میں سے آخری دو دریا ہیں اور جس مقام پر یہ پانچوں دریا ملتے ہیں وہ ''پنج آب'' کہلاتا ہے۔ اس مقام کے بعد ہی اس دریا کا نام جیجون ہوتا ہے (دیکھیے امینِ احمدِ رازی: ہفت اِقلیم [ہفت اقلیم کی عبارت یہ ہے: وجیحون درمیان مغرب وشمال واقع شده بعد از مسافت بسیار آب وخش بدو ضم گشته بولایت قبادیان آید و در آنجا پنج آب دیگر بدان داخل شده جیحون بحصول پیوندد۔ نسخۂ شفیعیہ، ورق ۵۹۲ ب]؛ Ch. Schefer: *Description topographique de Bukhara*، ضمیمہ، ص ۲۴۴۔ اس ''پنج آب'' کا محلِّ وقوع وہی ہے جسے آج کل ایوَاج (Ayvaj) کہتے ہیں (مُقدّسی، ص ۲۹۲: ''اوزج''؛ بارٹولڈ (Barthold): *Turkistan*، ص ۷۲).

اب جو دریا کافرنہان کہلاتا ہے اُسے عرب رامِیذ کہتے تھے۔ آج کل یہ نام اس دریا کے ایک بالائی معاون کے لیے مستعمل ہے۔ اسلامی ماٰخذ میں سُرخان دریا کا ذکر بھی ''چِغان رُوذ'' کے نام سے کیا گیا ہے۔

اب ہم مختصر طور پر اُن ولایتوں کا ذکر کریں گے جو آمو دریا کے بائیں بازو کے دریاؤں کے آس پاس یا درمیان میں واقع ہیں۔ دریاے وَخاب (پنج) کے علاقے کو چھوڑنے کے بعد بدخشان، شُغنان اور کرّان [غالبًا = روشن و دَرواز۔ بارٹولڈ: ترکستان، ص ۶۵] کے صوبوں کی سرزمین میں سے گزرتا ہے۔ پنج اور وَخش کا درمیانی علاقہ، یعنی وہ صوبے جواب بلجُوان اور قورغان تپہ کہلاتے ہیں، کسی زمانے میں خُتّل یا خُتّلان کہلاتا تھا۔ [آلای] کے پہاڑ، جن کے درمیان قِزِیل صُو بہتا ہے، محمود کاشغری کی کتاب میں [۱: ۷۷ پر] اسی نام سے مذکور ہیں (''آلاٗ'' کی شکل میں)۔ اس علاقے کا عمومی نام، پامیر [بامر یا فامر] عرب جغرافیہ نویسوں (یعقوبی [ص ۲۹۰] و دمشقی) کے ہاں مستعمل ہے۔ بہاؤ کی طرف ذرا آگے جا کر جس مقام کو آج کل ''قرہ تگین'' کہتے ہیں تیموری مؤرّخین کی کتابوں میں اسے قایر تگین = قادِر تگین کی شکل میں لکھا گیا ہے [دیکھیے بارٹولڈ: کتاب مذکور، ص ۷۰ ح ۴]۔ اس کے بالمقابل جاشُت کے صوبے اور قلعے کا ذکر بھی کیا گیا ہے (جاشت کی مکتوبہ شکلوں کے لیے دیکھیے مارکار: کتابِ مذکور، ص ۵۴۔ بارٹولڈ اپنی تمام تحریروں میں اس لفظ کو ''راشُت'' پڑھتا ہے۔ شکلِ جاشت کے لیے دیکھیے بیرونی: قانون = *Biruni's Picture of the World*، ص ۴۹؛ حدود العالم طبع منورسکی (Minorsky)، ص ۳۶۱)، اور ذرا آگے چل کر صوبہ اَلکُمیذ (Kumid) (بطلمیوس میں κωμῆδαί یوانگ چوانگ۔ Hiuen Tsang میں Kiu-mi-tho۔ بارٹولڈ، کتاب مذکور، ص ۷۰]

دیکھیے مارکار : کتابِ مذکور، ۵۵ بعد ؛ منورسکی (Minorsky): کتابِ مذکور، ص ۳۶۳)۔ دریاے وَخش اور دریاے رامیذ (کافرنہان) کے درمیانی صوبے کو، جو آج کل کے فیض آباد کے بجاے تھا، واشگرد اور واشجرد لکھا گیا ہے۔ رامیذ اور سُرخ آب (درمیانی وَخش) کی دائیں شاخوں کے درمیان کُمیجی (Kumichī) قبیلہ (مقدسی، ص ۲۸۳؛ حدود العالم، ص ۳۶۲) آباد تھا۔ کُمیذ اور کُمیج ایک ہی ترک قبیلے کے دو نام ہیں۔ شہر آخرون (یوانگ چوانگ Hiuen-Tsang کی Ho- Iu- mo اور اب حصار) اور شہر شُومان (یوانگ چوانگ کا Shu-man[Su-man]، جو اب قصبۂ کافرنہان ہے) اور انھیں ناموں کے اضلاع دریاے کافرنہان کے کنارے واقع تھے اور شہر آبان کیُسوان (جو بعد میں دُوشنبہ کہلایا اور سوویتی دور میں سٹالین آباد کے نام سے موسوم ہوا) رُوذِ کیُسوان پر واقع تھا (جو اب دریاے دُوشنبہ کہلاتا ہے)، اور صوبۂ دیہ نو (Dinev)، جو سُرخ آب (چغان روذ) کے طاس میں واقع ہے، صوبۂ چغانیان کے نام سے موسوم کیا گیا۔ دریای کورکچہ (Kökche Suyu) (یہ نام سب سے پہلے بابُر نامہ میں آتا ہے، ورق ۲۰۲) آمو دریا کے بائیں معاونوں میں سے ہے۔ اس کا طاس بالائی طُخارستان (Toḵẖaristān) کی اور قُندُز (دَرغَم Darğām = بطلمیوس کے Δαογαυάνηζ) کا طاس طخارستان کے مرکزی علاقے کے ایک حصے کی تشکیل کرتا تھا۔ اس بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ تاریخی عہد میں دریاے خُلم، جو آج بھی اپنے پرانے نام ہی سے موسوم ہے (تیموری تاریخوں میں اسے ''کاہم رُوذ'' لکھا ہے)، آمو دریا میں گرتا تھا یا نہیں، تاہم بعض اوقات اس دریا کے طاس کو طُخارستان کا ایک حصہ سمجھا گیا ہے۔ دریاے ''بلخ آب'' کے متعلّق طبقات الارض کی تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ کبھی کبھی یہ دریا اُس ضلع میں گزر کر جسے اب آقچہ (Akhcha) کہتے ہیں کالف اورزبوئی (Kalif Özboyu) سے جاملا ہے۔

بلخ کے شمال میں آمو دریا کا آخری بڑا اور دایاں معاون دریا سُرخان بھی پاتہ۔کیسر (Pātte Keser) (عربوں کے نزدیک مالہ یا [مِیلَہ]) اور ترمِذ کے نواح میں اس میں آملتا ہے۔ البیرونی اس مقام کو ''سات دریاؤں کا سنگم'' کہتا ہے (''مجمع الانہار السبعة''، الآثار الباقية، ص ۱۳۰)۔ اُس چھوٹے سے جزیرے کو جو اس جگہ دریا کے وسط میں واقع ہے بعد کے اوزبک ماخذ میں ''اُوْرتہ آرال'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس جزیرے کو جس کا ذکر تیمور کے دور میں آتا ہے (ظفر نامہ، ۱: ۸۱) عثمان بن مسعود کے نام پر، جس نے اسے ۷۰۴ء میں فتح کیا، عرب 'جزیرۂ عثمان' کہتے تھے (بلاذری، ۴۱۹؛ طبری، ۲: ۱۱۶۴)۔ اس کے بعد آمو دریا کلِف (عربی ماخذ میں کالِف) تک پہنچتا ہے اور یہاں سے سیدھا خوارزم کی ولایت کی طرف بہنے لگتا ہے۔ جس زمانے میں عربوں نے کلِف کا ذکر کیا ہے اُس میں یہ شہر دریا کے دونوں کناروں پر آباد تھا، لیکن شہر کا بڑا حصہ بائیں کنارے ہی پر واقع تھا۔ آج کل یہ شہر دریا کے صرف دائیں کنارے پر آباد ہے، اس کے بعد کرکی آتا ہے (جو پہلے زَمّ کہلاتا تھا اور) جو عربوں کے زمانے میں آمو دریا کے بائیں کنارے پر واقع تھا۔ چونکہ زَمّ آمو دریا کے بڑے معابر (fords) میں سے تھا اس لیے اس کی نسبت سے بعض اوقات یہاں یہ دریا نہر زَمّ کہلاتا تھا۔ آبادی اور زراعت کے جو مقامات زَمّ اور آمُل کے درمیان واقع تھے وہ سب دریا کے بائیں تنگ کنارے تک محدود تھے۔ دائیں کنارے کے بوردالیق کا ذکر، جو ترکمانوں کا قصبہ تھا، عہدِ تیموری میں بھی آتا ہے [مثلاً دیکھیے بوردالیغ در یزدی، ۱: ۱۲۶، ۱۳۰، ۱۴۸]۔ آمُل کے بالمقابل فاراب [فربَر] کے قریب جو تنگ زراعتی علاقہ ہے وہاں ترکمان عرصے سے آباد چلے آتے تھے اور وہ آج کل بھی وہاں آباد ہیں۔ اس کے بعد دائیں کنارے پر ضلع گاوخوارہ تک آبادی کا کوئی نشان نہ تھا۔ دریا کے بائیں کنارے پر ہزاراسپ (Hezaresb) تک صرف ایک تنگ سی پٹی پر کھیتی باڑی کی جاتی تھی۔ قریۂ طاہریہ، جو آمُل سے پانچ دن کی مسافت پر واقع (اور زمانۂ حاضر کے کبکلی کے نواح میں آباد) تھا، خوارِزم سے متعلّق شمار ہوتا تھا۔ وہاں سے سولہ فرسخ نیچے کو دَرغان تھا، جس کا محلِّ وقوع وہی تھا جہاں آج کل دَرغان آتا (Darganata) واقع ہے۔ اس کے بعد وہ تنگنائے آتی ہے جسے ''دُلدُل اتلغان'' کہتے ہیں (یہ نام اس مشہورِ عوام روایت پر مبنی ہے کہ حضرتِ علیؓ کا گھوڑا دُلدُل یہاں سے کود کر دوسرے کنارے پر پہنچ گیا تھا)، جہاں آمو دریا کا پاٹ تنگ ہو کر صرف ۳۶۰ میٹر رہ جاتا ہے۔ اس کا پرانا نام، جس کے متعلّق آگے چل کر بحث کی جائے گی، ''دہانِ شیر'' [''آرسلانِ آغزی''] ہے۔ دائیں کنارے پر چار فرسخ نیچے نہر گاوخوارہ شروع ہوتی تھی اور اس نہر کے پانچ فرسخ نیچے بائیں کنارے پر [غَراب خُشنہ یا غارام خُشنہ] (Garbḥashne) کے قصبے سے اور دائیں کنارے پِٹنِک (Pitnek) سے آگے شروع ہو کر خوارزم کا سرسبز و شاداب اور آباد میدان پھیلا ہوا تھا۔ یہاں سے آمو دریا نہروں کے ذریعے خوارزم کے زراعتی علاقوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

دسویں ۔ بارھویں صدی عیسوی میں عمودِ دریا کا مجری خوارزم کے قدیم پائے تخت کاث (آج کل شاہ عبّاس ولی) کے مغرب سے اور کُردر کے مجری سے جھیل آرال (بُحیرہ جُرجانیہ) تک جاتا تھا، لیکن ان دو صدیوں سے پہلے اور بعد دریا اپنا راستہ بدلتا رہا ہے؛ کبھی یہ راستہ کلِف اور کرکی کے درمیانی علاقے سے گزرتا تھا، کبھی یہ جھیل آرال میں، کبھی ہزاردگز [بحیرۂ خزر] میں جا گرتا تھا اور کبھی سیدھا قزِیل قُوم کے ریگ زاروں کی طرف بہ نکلتا تھا، جو خوارزم کے مشرق میں ہیں۔ آمو دریا کی پرانی گزرگاہیں یہ بتائی جاتی ہیں: (۱) ایک گزرگاہ خوارزم سے چل کر جھیل [ساری قمیش Sary-Ḳamīsh] کی راہ سے بالا ایشم (Bala-ishim) تک جاتی ہے، جو آج کل کے ''قِزِیل صُو'' کے مشرق میں واقع ہے اور وہاں سے بحیرۂ خزر میں پہنچ جاتی تھی؛ (۲) ایک گزرگاہ کلِف اور کرکی کے درمیان سے مروُ کے مشرق میں اُوچ حاجی کے ریلوے سٹیشن تک جاتی

تھی؛ (۳) چارجُوی کے مغرب میں اُنگُز کی گزرگاہ؛ (۴) اُقچہ دریا کی گزرگاہ، جو ''دائیں [صاغ] خوارزم'' کے مشرق تک چلی جاتی تھی۔ یہ آرال کی سمت میں آمو دریا کی گزرگاہ کے مشرق میں ہے۔ لیکن مؤرّخین اور ماہرین طبقات الارض کے درمیان مدّتِ دراز سے یہ مسئلہ زیر بحث رہا ہے کہ آیا یہ حقیقت میں دریا کی گزرگاہیں ہی ہیں یا ان میں سے بعض مواضع میں پہلے سمندر تھا اور پھر زمین بن گئی، یا اگر یہ حقیقت میں دریاؤں کی گزرگاہیں ہی ہیں تو آمو دریا کس زمانے میں ان گزرگاہوں میں بہتا تھا۔ مثال کے طور پر جن ماہرینِ طبیعیات نے ان مقامات کی تحقیق و تفتیش میں خود حصّہ لیا ہے ان میں سے بعض نے اس بات کے ثبوت میں کہ اُنگُز اور خوارزم اور کَلِف کے اوزبوئی آمو دریا کی قدیم گزرگاہیں ہیں اور بعض (مثلاً Konshin) نے اس کے ردّ میں بڑی بڑی کتابیں شائع کی ہیں۔ یہاں تک کہ مستشرقین میں سے ڈخویہ (De Goeje) نے ۱۸۷۳ء میں اس مسئلے پر ایک علٰیحدہ کتاب خاص طور پر لکھی اور آمو دریا کے بحیرۂ خزر میں گرنے کے متعلّق اسلامی مآخذ کے بیانات کی تاویل کرکے یہ نظریہ پیش کیا کہ ان مآخذ کے صرف وہی بیانات قابلِ اعتماد ہیں جن میں آمو دریا کا جھیل آرال میں گرنا دکھایا گیا ہے؛ تاہم موجودہ صدی کے شروع میں روسی ماہرینِ ارضیّات Voiekov اور Berg وغیرہ نے آمو دریا کی قدیم گزرگاہوں کے مسئلے پر ازسرِ نو بحث شروع کی ہے۔ بارتولڈ (Barthold) کو بعض ایسے وثائق ملے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ۱۲۲۱ اور ۱۵۷۵ء کے درمیان یہ دریا یقیناً خوارزمی اوزبوی (Özboy) کے اوپر سے بحیرۂ خزر میں گرتا تھا اور چونکہ مذکورۂ بالا ماہرینِ ارضیّات کی تحقیقات سے بھی اس کی تائید ہوتی تھی لہٰذا علمی دنیا نے یہ مان لیا ہے کہ تیرھویں سے سولھویں صدی تک آمو دریا بحیرۂ خزر میں گرتا تھا۔

بہت سی ایسی یادداشتیں موجود ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اِن صدیوں میں یہ دریا بحیرۂ خزر میں گرتا تھا، مثلاً ہسپانی کُلاوِیخو (Clavijo)، جو تیمور کے دربار میں سفارت لے کر آیا تھا، اس کا ذکر کرتا ہے۔ وہ بڑے بڑے وثائق جن پر بارتولڈ کا دعوٰی مبنی ہے مندرجۂ ذیل ہیں: (۱) حمد اللہ قزوینی: نُزهة القلوب، ۱۳۳۹ھ (طبع وقفیۂ گب، متن، ص ۲۱۳، ترجمہ ص ۲۰۶، بارتولڈ: Svedenya ob aral' skom more=Aral، ص ۵۰) میں یہ درج ہے کہ اگرچہ آمو دریا جزءًا بحیرۂ خوارزم (آرال) میں گرتا ہے لیکن اصل دریا [''عمودِ آبِ جیحون''] خوارزم سے چل کر عقبۂ حَلَم اور وہاں سے خلجان ہوتا ہوا (مطبوعہ نسخے میں خلخال، شاید فلکخان یعنی بلخان ہو) بحیرۂ خزر میں جا گرتا ہے، نیز یہ کہ عقبۂ حَلَم کا ترکی نام گُورلادِی (Gürledi) ہے اور یہ ایک شَلّال (آبشار) تھا جہاں دریا کی پرشور آواز [ایک، بلکہ] تین فرسخ کے فاصلے سے سنائی دیتی تھی۔ اسی کتاب میں ایک اَور جگہ (متن، ص ۱۷۷، ترجمہ، ص ۱۷۰؛ بارتولڈ: Aral، ص ۵۳) اُس کاروانی سڑک کی منزلیں اور ان منزلوں کے درمیانی فاصلے بھی فرسخوں کے حساب سے لکھے گئے ہیں جو جرجان کے قرب میں واقع دِھستان (آج کل مشہدِ مِصریان) سے [چل کر گُورلادِی (=حَلَم)] اور خوارزمی اوزبوی کی راہ سے سیدھی خوارزم کے پائے تخت اور گُرگَنج کو نکل جاتی ہے؛ (۲) تیموری مؤرخ حافظ ابُرُو کہتا ہے کہ اس زمانے میں آمو دریا جھیل آرال میں نہیں بلکہ خوارزم میں سے گزرنے کے بعد گُورلادی آکر [آغرچہ] [(اوغورچہ)] سے بحیرۂ خزر میں جا گرتا تھا (*al-Muzaffarîya Sbronik uchen bar. V. Rosen*، ص ۷؛ بارتولڈ: *Aral*، ص ۱۷)۔ اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حمد اللہ کا خَلجان اور [آغرچہ] (Agircha) ایک ہی مقام ہے۔ یہ جگہ آج بھی آغرچہ (اوغورچہ) کے نام سے معروف ہے؛ (۳) ظہیر الدین المرعَشی (تاریخ طبرستان، طبع ڈارن (Dorn)، [پیٹرزبرگ ۱۲۶۶ھ] متن، ۴۳۶؛ بارتولڈ: *Aral*، ص ۱۷)، لکھتا ہے کہ ۱۳۹۲ء میں تیمور نے مازندران کے حکمران سیّدوں کو قیدی بنا کر کشتیوں پر سوار کیا اور انھیں دریا کے راستے آغرچہ بھیجا، وہاں سے ان سیّدوں کو پھر کشتیوں ہی کے ذریعے آمو دریا میں اوپر کی طرف ایک خاص مقام تک پہنچایا اور بعد میں انھیں ماوراء النہر کی مختلف [ولایات] میں بھیج دیا گیا۔ ظہیر الدین کا باپ بھی تیمور کی اس مہم میں شریک تھا۔ تیموری تاریخوں میں بھی آیا ہے کہ مازندران کے سیّدوں کو خوارزمی اُوزبوی (Özboy) کے راستے بھیجا گیا تھا، دیکھیے [مثلاً یزدی، ۱: ۵۷۷ و *Zap.vost.otdel. russk.archeol. obshch.* XIV.025]؛ (۴) صاحب مطلع سعدین (طبع لاہور)، ۲: ۱۲۱۹، ۱۲۵۱ بعد اور] خواندامیر [۳/۳: ۲۰۹، ۳۱۱] اُن مہمّوں کا حال بیان کرتے ہیں جن میں تیموری سلطان حسین بایقرا ۱۴۶۰ء میں اور [اُس کے بعد] ان علاقوں سے گزرا تھا جہاں آمو دریا بحیرۂ خزر میں گرتا ہے۔ ۱۴۶۰ء کی مہمّ میں یہ سلطان استرآباد سے چل کر قصبۂ آغرچہ میں اور وہاں سے شہر آداق میں پہنچا اور کشتی میں آمو دریا کو عبور کیا اور بعد میں [شہر] وزِیر پہنچا۔ آداق خوارزمی اوزبوی (Özboy) کے بائیں کنارے پر ساری قَمیش (قرہ تنگیز) کے جنوب میں ایک قلعہ تھا (دیکھیے بارتولڈ (Barthold): *Istoriya oroshenya Türkestana*، پیٹرزبرگ ۱۹۱۴ء، ص ۹۱ بعد)۔ ۱۴۶۴ء میں سلطان حسین اَستَرآباد سے روانہ ہو کر پھر آغرچہ کی راہ سے آداق پہنچا۔ وہاں آمو دریا کو عبور کرکے اپنی فوج کے ساتھ آصف اور گُزو (Asaf Ögüzü) کے ساحل پر خیمہ زن ہوا اور شہر وزِیر پر قابض ہو گیا جو خوارزم کے مغرب میں واقع ہے۔ ابوالغازی خان کے بیان کے مطابق یہ شہر وزِیر اُورگنج (Ürgench) سے چھے فرسخ کی مسافت پر تھا؛ انگریز سیّاح جِنکِنسَن (Anthony Jenkinson) کا بیان ہے کہ یہ شہر ایک پہاڑ کے ڈھال پر واقع تھا، جس کا نام اوست یورت چِنِنگ Üst-Yurt Ching (= پہاڑ کی ڈھلان) ہے (بارتولڈ: *Aral*، ص ۷۷)؛ ایک سوویتی محقق ٹولسٹوف (S. Tolstov)، جس نے ۱۹۳۷ اور ۱۹۴۷ء کے درمیان خوارزم اور اس کے نواح میں آثارِ قدیمہ کی وسیع تحقیقات کی تھی، اس بات کو قطعی طور پر غلط بتاتا ہے کہ یہ اوزبوی (Özboy) تاریخی ازمنہ میں کبھی

آمو دریا کی وہ گزرگاہ رہا ہے جس سے یہ دریا بحیرۂ خَزر میں گرتا تھا۔ اپنے اس بیان میں اس محقق نے ان تاریخی مسوّدات کو قطعًا نظر انداز کر دیا ہے جو سلطان حسین اور شَیبَک خان کی مہمّات سے متعلّق تھے۔ تاہم جس طرح کہ یہ یقینی ہے کہ آمو دریا چودھویں اور پندرھویں صدیوں میں خوارزمی اوزبوی میں بہتا تھا، اسی طرح یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ دریا نے اپنے اس مجری میں کب سے بہنا شروع کیا اور کب آخری دفعہ اس مجری کو تبدیل کر لیا۔ جہان نامہ سے، جو محمد بن نَجیب بَکْران نے محمد خوارزم شاہ کے نام پر لکھی تھی، یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس زمانے میں خوارزم اور خراسان کا درمیانی علاقہ ابھی صحرا ہی تھا (بارٹولڈ (Barthold): *Turkestan v epoḫu mongol-noshetviya*، ۱:۸۱)۔ چودھویں صدی میں نظام نیشاپوری، جو رشید الدّین کے عملے کا ایک فرد تھا، لکھتا ہے کہ سیحون اس کے زمانے میں جیحون میں اور جیحون بحیرۂ خَزَر میں گرتا تھا (تاریخ دِژ گیتی، ۱، ۱۹۴۹ء: ۷۵)۔ حمد اللہ قزوینی (متن، ص ۲۳۹، ترجمہ، ص ۲۳۱ = بارٹولڈ، ص ۵۱) نے بالتّصریح لکھا ہے کہ آمو دریا کا آرال کو چھوڑ کر بحیرۂ خَزَر میں بہہ کر جانا اُس زمانے [کے نزدیک] واقع ہوا جس میں مغلوں نے [خروج کیا اور] خوارزم پر اپنا تسلّط جما لیا۔ درحقیقت اسلامی زمانے میں آمو دریا میں ہمیشہ ساری قَمیش کی طرف بہنے کا رجحان پایا جاتا تھا۔ ابن رُستہ (ص ۹۲) کا بیان ہے کہ جیحون جُرجانیہ سے گزرنے کے بعد سیاہ کوہ (''چینگ'') اور خَلجان (یہاں ساری قَمیش) کی طرف بڑی قوّت سے بہتا چلا جاتا تھا (متن کی تصریح کے لیے دیکھیے بارٹولڈ: *Istoriya aroshenya...*، ص ۸۴)۔ ۱۲۲۰ء میں جب مغول اورگنج کا محاصرہ کر رہے تھے تو انھوں نے دیکھا کہ آمو دریا کی روک تھام بندوں کے ذریعے کی گئی ہے تاکہ اُس کا پانی شہر کو غرقاب نہ کر دے؛ چنانچہ شہر پر قبضہ کرنے کے لیے مغلوں نے یہ بند توڑ دیے اور شہر غرقاب کر دیا (ابن الاثیر نے اس کے متعلّق جو کچھ لکھا ہے اس کے لیے دیکھیے لی سٹرینج (Le Strange): *Lands of the Eastern Caliphate*، ص ۴۵۶)۔ ابوالغازی خان نے خوارزمی اوزبوی (Özboy) میں دریا کے بہاؤ کے منقطع ہو جانے کے متعلّق لکھا ہے کہ یہ واقعہ اس کی ولادت (۱۶۰۳ء) سے تیس سال پہلے پیش آیا تھا، اس حساب سے یہ واقعہ ۱۵۷۳ء میں ہوا ہوگا۔ ایک اور خوارزمی مصنّف آگہی لکھتا ہے کہ یہ واقعہ ۹۸۱ھ/[۱۵۷۳-۱۵۷۴ء] میں پیش آیا تھا۔ عثمانی سیّاح سیفی چلبی، جس نے اپنی کتاب ۱۵۸۲ء میں لکھی تھی، لکھتا ہے کہ یہ واقعہ اس کی زندگی میں پیش آیا تھا (دیکھیے مخطوطۂ پیرس *Suppl. turc*، شمارہ ۱۱۳۶، ورق ۲۳ب؛ بارٹولڈ: *Istoriya oroshenya..*، ص ۳)۔ انگریز سیّاح جِنکنسن، جو ۱۵۵۸ء میں اَستراخان اور مَنقِشلاق کے راستے خوارزم گیا تھا، اوزبوی (Özboy) کے کنارے کنارے جھیل توپ یاتان (Topyatan) تک پہنچا، جس سے ظاہر ہے کہ آمو دریا کا پانی اس وقت وہاں تک آتا تھا (جدید تفصیلات کے لیے دیکھیے *Vestnik Geograficheskago Obshchestva*، *xxii*، ۱۹۴۰ء: ۸۱۹-۸۲۳)۔ بہرحال دریا کے بہاؤ کے بند ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اورگنج اور وزیر کے سے شہر پانی سے محروم ہو کر ویران ہو گئے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کم و بیش ساڑھے تین صدیوں تک آمو دریا خوارزم اوزبوی کی راہ سے برابر بہتا رہا.

اس مسئلے میں بھی اختلاف ہے کہ ۱۲۲۰ء سے پہلے آمو دریا بحیرۂ خَزر میں گرتا تھا یا نہیں۔ بارٹولڈ (*ZVO*، xii: ۳۶) نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا ہے، لیکن ہرمان (Albert Herrmann): *Alte Geographie des unteren Oxusgebiets*، برلن ۱۹۱۴ء) اور لی سٹرینج (کتابِ مذکور، ص ۴۵۵) اس کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔ مارکار (Marquart) بھی اس مسئلے سے متعلّق یونانی اور اسلامی مآخذ میں مندرجہ معلومات کی توضیح میں مشغول رہا (*Wehrot und Arang*، ص ۳۱-۱۱۴)۔ (۱) ان اطّلاعات پر صرف اُس کتاب کے دیباچے (ص ۲۵ بعد) سے روشنی پڑتی ہے جس کا نام تحدید نہایات الاماکن ہے اور جسے بیرونی نے ۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء میں غزنہ میں اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ اب اس کتاب کا واحد نسخہ فاتح لائبریری میں موجود ہے (شمارہ ۳۳۸۶) (دیکھیے زکی ولیدی طوغان: *Biruni's Picture of the World*، ص ۵۶-۵۷)۔ اس میں مصنّف سطح ارضی کے تغیّرات، دریاؤں کی گزرگاہوں کی تبدیلی، ان کے بہاؤ کے نشانات اور قدیم گزرگاہوں میں پائے جانے والے میٹھے پانی کے اُن سیپیوں اور گھونگے والے نرم تن جانوروں (*Corbicula fluminalis, Carbicula trigonoidis, C.unio* اور *C.valvata*) سے بحث کرتے ہوئے جنھیں وہ مچھلیوں کے کان (''اُذُن السّمک'') کہتا ہے مندرجۂ ذیل معلومات مہیّا کی ہیں:-

(۱) آمو کے اندر جو ''مچھلیوں کے کانوں'' والے پتّھر ملتے ہیں وہ ان ریگستانوں میں نظر آتے ہیں جو جُرجان اور خوارزم کے درمیان واقع ہیں۔ قدیم زمانے میں یہ علاقہ ایک بہت بڑی جھیل رہا ہوگا۔ بطلمیوس نے لکھا ہے کہ جیحون یعنی دریائے بلخ بحیرۂ جُرجان (γεχάνιά ؟) میں گرتا تھا، دیکھیے ۱۰۶ جاوغرافیا Ωξον ποταμοῦ ἐκβολαί۔ بطلمیوس کے زمانے سے اب تک [یعنی زمانۂ بیرونی تک] تقریبًا آٹھ سو سال کی مدّت گزر چکی ہے۔ دریائے جیحون، جو اس زمانے میں اُس علاقے کے وسط سے گزرتا تھا جو زَمّ اور آمُویہ (Amuya) کے درمیان واقع ہے اور جو آج محض ریگستان ہے، شہر بلخان کی حدود تک بہتا تھا اور آس پاس کے قصبات اور دیہات کو سیراب کرتا ہوا جُرجان اور خزَروں کے علاقے کے درمیان سمندر میں جا گرتا تھا.

(۲) بعد میں ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ جیحون نے اس گزرگاہ پر بہنا چھوڑ دیا اور سیدھا قبیلۂ اوغوز (Öguz) کے علاقے (ارض الغُزّیّۃ) کے میدانوں کی طرف بہنا شروع کر دیا۔ ایک پہاڑ اس کے راستے میں حائل ہو گیا جسے اب فم الاسد (دہانِ شیر) کہتے ہیں اور جس کا نام خوارزم کے باشندوں کی زبان میں

''شیطان کا پل'' (سکُر الشیطان) ہے، یعنی تنگنائی ڈُلڈُل آتْلَغان' کی چٹانیں)۔ یہاں اس دریا کا پانی جمع ہو کر چڑھا اور کناروں سے اُچھل کر بہنے لگا۔ اس زمانے کی طغیانیوں [تلاطمِ امواج] کے آثار آج بھی چٹانوں کی بلندیوں پر نظر آتے ہیں۔ اتنا بے اندازہ پانی جمع ہو گیا تھا کہ چٹانیں بھی اس کے زور کا مقابلہ نہ کر سکیں اور دریا نے پہاڑ کو کاٹ کر ایسا راستہ بنا لیا جس کا طول ایک دن کی مسافت تھا۔ اس کے بعد دریا نے دائیں ہاتھ کو اپنی اُس گزرگاہ سے جواب [بزمانِ البیرونی] فُخِّی کے نام سے معروف ہے فاراب [فرَبر] کی سمت بہنا شروع کر دیا۔

(۳) کچھ زمانہ گزرنے پر پہلی گزرگاہ کی طرح اس گزرگاہ میں بھی بعض ایسی رکاوٹیں پیدا ہو گئیں جنھوں نے دریا کی روانی روک دی، نتیجہ یہ ہوا کہ پانی نے بائیں ہاتھ کو Pechenekler کے علاقے (''ارض البَجْناکِیّہ [معروف ''بوادی مزْدَبستی'']'' کی طرف مُڑ کر اپنی گزرگاہ خوارزم اور جُرجان کے درمیان کے ریگستان میں بنا لی اور بہت عرصے تک یہاں کے متعدّد مقامات کو سیراب کر کے خوشحال بناتا رہا، لیکن آگے چل کر یہ گزرگاہ بھی باقی نہ رہی اور ان علاقوں کے باشندے ترکِ وطن کر کے بحیرۂ خزر کے ساحل پر چلے گئے۔ یہ لوگ آس (As) اور اللّان (Alan) کے قبیلوں سے تعلّق رکھتے تھے اور ان کی بولی آج بھی پچناکی اور خوارزمی زبانوں سے مرکّب ہے۔

(۴) دریا کی بعض دھاریں [''مُشَبّابات''] جہاں خوارزم کی سرحد شروع ہوتی ہے اُس علاقے کی پہاڑیوں کے درمیان سے (یعنی آج کل کے ٹُو یہ مویون (Tüey-Moyun) سے گزرتی ہوئی خوارزم کی طرف بہتی تھیں۔ اب (یعنی مزْدَبستی گزرگاہ کے خشک ہو جانے کے بعد) دریا کا پورا پانی خوارزم کی طرف بہنے لگا اور سارے علاقے کو تہ آب کر دیا، یہاں تک کہ اس نقطے سے (یعنی ٹُو یہ مویون Tüey-Moyun) سے لے کر پورا ملک ایک بہت بڑی جھیل بن گیا۔ پانی کی مقدار کے بڑھنے سے اور اس کی روانی کی تیزی و تندی سے جو بے اندازہ کیچڑ ساتھ آ جاتی تھی اس سے یہاں دریا کا پانی گدلا ہو جاتا تھا۔ پانی کو گدلا کرنے والی یہ کیچڑ جب اس جگہ پہنچتی تھی جہاں پانی کے بہاؤ کی شدّت کم ہو جاتی تھی تو وہ دریا کی تہ میں بیٹھ جاتی اور اس طرح دریا کے پیندے میں جو مٹی کی تہیں تھیں وہ رفتہ رفتہ اونچی ہوتی گئیں۔ اس طریقے سے، یعنی مٹی کے نیچے بیٹھتے رہنے سے، ٹُو یہ مویون سے شروع کر کے جہاں دریا (جھیل سے) باہر نکلتا ہے کیچڑ کی تہیں آہستہ آہستہ پانی کی سطح کے اوپر نکل آئیں اور مٹی کا میدان بن گیا؛ جھیل بھی بتدریج ان میدانوں سے پرے ہٹ گئی۔ خوارزم کا پورا ملک اسی طریقے سے وجود میں آیا۔ جھیل برابر پیچھے ہٹتی گئی یہاں تک کہ پہاڑ (''چینگ'') تک پہنچ گئی، جو اس کے راستے میں آ گیا تھا۔ جھیل کا پانی پہاڑ کو توڑ کر راستہ نہ بنا سکا، بالآخر اس نے شمال کا رُخ کیا اور ان علاقوں تک پھیل گیا جن میں آج کل ترکمان آباد ہیں۔ اب اِس جھیل (آج کل کی جھیل آرال) اور اُس جھیل کے درمیان جو مزْدَبستی کی گزرگاہ (یعنی ساری قَمیش کی جھیل) پر واقع ہے کچھ زیادہ فاصلہ نہیں۔ اب یہ جھیل (ساری قَمیش) ایک نمکین دلدل میں تبدیل ہو گئی ہے اور نا قابلِ عبور ہے۔ ترکی میں اسے ''خیز تنگزی'' یعنی ''کنواری جھیل'' کہتے ہیں۔

ان بیانات میں جو بہت سے دشوار اور اہم تاریخی، جغرافیائی اور نسلیاتی مسائل کی تحقیق کے لیے بنیاد کا کام دیں گے، مندرجۂ ذیل نکات قابلِ توجّہ ہیں:-

(۱) بیرونی ان روایات سے آگاہ ہے کہ بہت زیادہ قدیم زمانوں میں آمو دریا کرْکی اور کلِف کے درمیان قرہ قوم کے ریگ زاروں میں بہتا تھا اور بلْخان کے پہاڑوں کے نزدیک بحیرۂ خزر میں جا گرتا تھا۔ اس کی یہ بھی رائے تھی کہ جس آکسس (Oxus) کا ذکر بطلمیوس کی کتاب میں ہے وہ وہی دریا ہے جو اس جنوبی گزرگاہ میں بہتا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ قدیم یونانی مصنّفین نے آمو دریا کی اس جنوبی گزرگاہ کو اور بلخ آب اور مُرغاب کے دریاؤں کو، جو اس کے بازو تھے، اوخوس (Oxos') کا نام دیا تھا۔ سٹرابو (Strabo) نے جس دریائے اوخوس کا ذکر کیا ہے کہ اس کے ذریعے ہندوستان کا مال جہازوں میں بحیرۂ خزر اور اَرَس (Arax) تک آتا تھا، اور نِسا (سٹرابو، ۱۱: ۵۰) جو آج کل کے عشق آباد کے مغرب میں واقع تھا اور ''پٹرول کے کنوؤں'' (سٹرابو، xi: ۵۱۸، یعنی ''نفط داغ''؟) کے قریب سے بہتے ہوئے اوکسس (غالباً خوارزم اور زبوی کی طرف سے آنے والی ایک اَور شاخ) سے مل کر بحرِ کسپی (xi: ۵۱۰) یا جرجان (xi: ۵۱۸، γοχάνιά') کے سمندر میں گرتا تھا ضرور ہمارے زمانے کا جنوبی مجْرٰی ہوگا جو کلِف اور زبوی اور اُنگُز کے نام سے معروف ہے۔ یہ نظریہ کہ کلِف اور زبوی آمو دریا کی ایک پرانی گزرگاہ ہے سب سے پہلے Obruchev نے پیش کیا تھا (*Zap. russk. geograf. obshch.*، ۱۸۹۰ء، xx، شمارہ ۳: ص ۹ بعد)۔ یہ کہا جاتا تھا کہ یہ گزرگاہ اوُچ حاجی (Üch-haji) -و- رِپِتیک (Repetek) کے سٹیشنوں کے درمیان ''مرو -و- چارجوی'' ریلوے لائن کو قطع کرتی تھی (دیکھیے Machatschek: *Landskunde von Russisch-Turkestan*، شٹٹ گارٹ (Stuttgart)، ۱۹۲۲ء، ص ۳۰۵ ببعد)۔ درحقیقت ۱۹۲۸ء میں آمو دریا کلِف اور کرْکی کے درمیان نہر بُوساغہ (Bosaaga) سے نکل کر اپنی پرانی گزرگاہ پر بہنے لگا (*Turkmenevedenye*، V، عشق آباد ۱۹۳۱ء، شمارہ ۱۰-۱۲: ۲۵)۔ اس نے اُوچ حاجی (Üch-haji) کی طرف اپنا راستہ بنایا اور گزشتہ بارہ سال کے دوران میں یہ گزرگاہ اتنی وسیع ہو گئی ہے کہ ۵۰ کیلومیٹر علاقے میں خوشحالی کا امکان پیدا ہو گیا ہے (*Pravada*، ۱۹ ستمبر ۱۹۴۰ء)۔ اب ان علاقوں میں ''نہرِ ترکمنستانِ جنوبی'' زیرِ تعمیر ہے۔

یہ خیال سب سے پہلے Kaulbars نے پیش کیا تھا کہ اُنگُز (Unguz) کی گزرگاہ، جس کے متعلّق سمجھا جاتا ہے کہ وہ چارجُوی کے نواح میں آمو دریا سے علیحدہ ہو گئی تھی، حقیقت میں اس دریا کی ایک قدیم گزرگاہ تھی (*Zap. Russ. Geog. Obshch*، ۱۸۸۱ء، ج ۹)، اگرچہ بعد کی تحقیقات سے اس دعوے کی تائید نہیں ہوئی، تاہم ۱۹۳۰ء میں روس کی مجلس علوم (Academy of Sciences) نے جو

قرہ قُوم کی تحقیقاتی مہم ّبھیجی اُس کے ارکان نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نسبۃً مؤخر زمانے میں بھی اُنگُز (Unguz) آمو دریا سے پانی حاصل کرتا رہا ہے اور ایک زمانے میں اس گزرگاہ کے شمالی کناروں ہی سے آمو دریا کے ڈیلٹا (delta) کی شمالی حد کی تشکیل ہوتی تھی (*Trudi Karakumskoy ekspeditsii*، پیٹرز برگ ۱۹۳۴ء، ۴: ۱۳۵)۔ یونانی مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ دریاے مُرغاب (Morgos) بہتا ہوا اوخوس میں گرتا تھا، لیکن ہری رُوذ = تجِان (Arios) ریت میں جذب ہو کر غائب ہو جاتا تھا اور اوخوس تک نہ پہنچنے پاتا تھا (سٹرابو Strabo، xi: ۵۱۸؛ بطلمیوس، vi: ۱۷)۔ موجودہ زمانے کی تحقیقات سے پتا چلا ہے کہ دریاے مُرغاب اُوچ حاجی (Üch-haji) کے قریب کِلف اور زبوی سے جاملتا تھا اور دوسری طرف زمین کے ارتفاع کی وجہ سے کسی دریا کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ ریپتک (Repetek) اور مرو کی سمت سے آ کر بلخان کے ضلع کی طرف بہتا (دیکھیے Machatschek، محلِّ مذکور)۔ مُقدّسی (ص ۲۸۵) اور یاقوت (۱: ۴۷۹، ۳: ۱۷۴) نے اس مضمون کی جن روایات کو نقل کیا ہے کہ شہر بلخان، جو اُن کے زمانے میں کھنڈر ہو چکا تھا، نِسا اور ابِیوَرد سے مربوط تھا ان سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ شہر یا اسی نام کے دوسرے شہر اور دریا (یعنی آمو دریا) کی جنوبی گزرگاہ، عشق آباد اور باؤرد اور آج کل کی ریلوے لائن سے تھوڑے فاصلے پر تھے؛ صرف اتنا ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کے باشندے بلخان والی پرانی گزرگاہ سے اچھی طرح واقف تھے، یعنی اُس کی یاد ابھی ذہنوں میں باقی تھی۔ بیرونی بیان کرتا ہے کہ آمو دریا بلخان کے پاس بحیرۂ خزر میں گرنے سے پہلے قرہ قُوم کے صحرا میں پانی کی ''جھیل سے مشابہ'' وسیع چادر بن جاتا تھا۔ یہ تصریح سٹرابو (Strabo) کے اس بیان سے مطابقت رکھتی ہے کہ آکسس یا اوخوس پانی کی ایک وسیع سطح تھی جو بہت سی شاخوں میں تقسیم ہو جاتی تھی (قب بطلمیوس (Ptolemy)، vi: ۶) جمع کی شکل (ἐκβολαί)۔ بہر حال اس جنوبی گزرگاہ کو، جو بلخان کے نام سے منسوب تھی، خوارزم اور زبوی کی طرح ایک ہموار مجرای ہونے سے زیادہ پانی کی ایک دالیہ [ڈیلٹا] نما وسیع سطح تصوّر کیا جا سکتا ہے۔ قانون المسعودی میں بیرونی نے ذکر کیا ہے کہ آمو دریا شہرِ بلخان کے کھنڈروں کے نواح میں بحیرۂ خزر میں گرتا تھا (دیکھیے *Biruni's Picture*، ص ۴۸)۔ یہ بیان تیمور کے ہم عصر شریف جُرجانی کی کتاب میں درج ہوا اور اُس سے ڈخویہ (De Goeje) نے بعض غلط نتائج اخذ کیے (دیکھیے بارٹولڈ: *Aral*، ص ۸۲، ۸۶).

(۲) بیرونی لکھتا ہے کہ آمو دریا کی تاریخ کے دوسرے دَور میں یہ دریا ایک وقت میں اس گزرگاہ پر بہتا رہا جو قزیل قوم کی سمت میں ڈلڈل آتلغان اور تُویہ مویون (Tüye-Moyun) کی تنگ گھاٹیوں میں بنائی تھی۔ اِصطَخری (ص ۳۰۴) نے ڈلڈل آتلغان کا ذکر اس کے خوارزمی نام سے کیا ہے (ص ۳۰۴)۔ حمداللہ قزوینی اور دوسرے مصنّفین اس کا ذکر ''فم الاَسَد'' اور ''دہانِ شیر'' کے نام سے کرتے ہیں۔ بیرونی نے خوارزمی زبان سے جس لفظ کا ترجمہ ''شیطان کا پُل'' کیا ہے اس کی اصل وہی لفظ ہو گا جسے ہم اِصطَخری کی تحریر ''دیوفتنہ'' (''شرّ الشیطان'') پڑھتے ہیں [شاید 'دیو یشتہ' صواب تر ہو]۔ بارٹولڈ نے محض اس بنا پر کہ یہ لفظ غلطی سے 'ابوقشہ' کی شکل میں لکھا گیا ہے اسے اَبُقشہ پڑھا ہے۔ [آرسلان اَغزی] ڈلڈل آتلغان اور تُویہ مویون (Tüye-Moyun) وہ تشکیلات ہیں جو ارضیاتی زمانوں میں وجود میں آئیں، نہ کہ تاریخی زمانے میں، جیسا کہ بیرونی نے خوارزمی روایتوں پر یقین کرتے ہوئے گمان کیا ہے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ تاریخی زمانوں میں آمو دریا یہیں سے گزر کر سیدھا قزِیل قوم کے اندرونی علاقے میں داخل ہوتا تھا اور یہاں شہر اور گاؤں آباد ہوے تھے۔ ڈلڈل آتلغان کی تنگ نای سے تین فرسخ نیچے، زمانۂ حال کے سَدوَر کے بالمقابل، آمو دریا کے پانی کا ایک حصّہ [گاوخوارہ نام] کی نہر سے اس پہاڑ کے جنوب کی طرف بہتا تھا جسے آج کل سلطان اُوَیس کہتے ہیں۔ پانچ فرسخ آگے چل کر ایک اَور نہر کٹ جاتی ہے جس کا نام کِرِیہ [Kirye] ہے (اِصطَخری، ص ۳۰۱)۔ جس زمانے میں سلجوقی ماوراء النہر سے خراسان منتقل ہو رہے تھے وہ اس نہر گاوخوارہ کے علاقے میں رہتے تھے۔ جس گزرگاہ کو بیرونی نے فُجی کا نام دیا ہے، اس کی جگہ عرب جغرافیہ نویسوں نے ایک نہر عاراَبخَشنہ (Arabḫashne) نامی کا ذکر کیا ہے جو آج کل کے دُورتِ کول (Dörtkül) کے اضلاع (مقامی بولی میں اس لفظ کے معنی مربّع کے ہیں، روسی نام Petro Alesksandrovsk ہے) اور قدیم کاث (یا 'کات'، جس کا نیا نام ''شاہ عبّاس ولی'' ہے) کے اطراف کو سیراب کرتی تھی۔ جس گزرگاہ کو بیرونی ''فُجی'' لکھتا ہے، وہ آج کل زیریں حصّوں میں آقچہ دریا کے نام سے موسوم ہے اور یقیناً اُسی جگہ ہے جہاں پرانی گزرگاہ کے آثار ہیں۔ آج کل بھی اس گزرگاہ میں گُلدُرسُن قلعہ (Gül-dürsün-Kala)، ایرس قلعہ (Eres-Kala)، ایاز قلعہ (Ayaz-Kala)، تمن قلعہ (Taman-Kala) اور قرق قیز اور دوسرے قدیم قلعوں اور شہروں کے آثار ملتے ہیں (دیکھیے Machatschek: وہی کتاب، ص ۲۸۷؛ A. Woeikef: *Le Turkestan Russe*، پیرس ۱۹۱۳ء، ص ۱۶۳)۔ سوویتی عہد میں یہ مقام تحقیق و تدقیق کی جولانیوں کے لیے وسیع میدان بن گیا ہے۔ پروفیسر ٹالسٹاف (S. Tolstov) کے زیرِ ہدایت ۱۹۳۷ء سے کام ہو رہا ہے اور اب ان قدیم تہذیبوں کا بھی محققانہ مطالعہ کیا جا رہا ہے جنھوں نے مذکورۂ بالا کھنڈروں کے علاوہ قورغشین قلعہ (Qurgashin qala)، جانباز قلعہ (Janbas qala) اور قوی قِرِلغان (Qoy-qirilgan) جیسے متعدّد ثقافتی مرکزوں کو بھی جنم دیا (دیکھیے ٹالسٹاف، *Drevniy Xorezm*، ۱۹۴۸ء، ص ۳۷-۵۶)؛ جس فاراب کا ذکر بیرونی نے کیا ہے وہ اس گزرگاہ کے مقامات میں سے فارابُسر کے محلِّ وقوع کے مطابق معلوم ہوتا ہے جس کا تذکرہ مقدّسی نے کیا ہے۔

(۳) بیرونی نے آمو دریا کی گزرگاہیں تبدیل ہونے کے سلسلے میں ایک تیسرے دَور کا ذکر کیا ہے جب کہ آمو دریا تُویہ مویون (Tüye-Moyun)

(تخمیناً نہر لَوْدان (Lavdan) کی گزرگاہ کے مطابق) میں سے ہوتا ہوا سیدھا ساری قَمِیش (قیز تنگیزی) کو جا کر مزْ دابَسْتی کی گزرگاہ میں، ''جو خوارزم اور جُرجان کے درمیانی صحرا میں واقع تھی''، (یعنی خوارزمی او رزبوی کی راہ سے) بہتا تھا لیکن اُس نے یہ نہیں لکھا کہ اس زمانے میں آمو دریا بہتا ہوا بحیرۂ خَزَر تک جا پہنچا تھا۔ بیرونی کے زمانے میں یہ گزرگاہ مدّت دراز سے خشک پڑی تھی؛ چنانچہ دسویں صدی کے عرب جغرافیہ دانوں مثلاً اِصْطَخْری اور ابن رُسْتہ کے زمانوں میں بھی آمو دریا جھیل آرال میں گرتا تھا، لیکن ساری قَمِیش البیرونی کے زمانے میں بھی ایک وسیع دلدل کی شکل میں موجود تھی۔ بارٹولڈ (Barthold) نے یہ دعویٰ کیا کہ آمو دریا مغلوں کے زمانے سے پہلے خوارزمی او رزبوی کے راستے پر نہیں بہتا تھا اور اپنے اس دعوے کی بنیاد یہ قرار دی ہے کہ ۱۲۸۷ء کے واقعات میں شہر کُرْدِر (کُرْدَر نہیں، دیکھیے تورکیّات مجموعہ سی، ۲: ۳۴۰) مذکور نہیں ہے (دیکھیے *Turkestan down to the Mongol Invasion*، ص ۱۵۰؛ *ZVO*، ۲۲: ۳۵۷)؛ حالانکہ دسویں صدی سے پہلے کے عرب مصنّفین نے یا اُن مصنّفین نے جن کی تصانیف دسویں صدی سے قبل کے مآخذ پر مبنی ہیں واضح طور پر لکھا ہے کہ آمو دریا خوارزمی او رزبوی (Özboy) کے راستے پر بہتا تھا اور بحیرۂ خَزَر میں گرتا تھا، [مثلاً] یعقوبی (جس نے ۸۹۱ء میں اپنی کتاب لکھی) کہتا ہے کہ آمو دریا بحیرۂ دَیلَم (یعنی بحیرۂ خَزَر) میں گرتا ہے (*BGA*، ۷ [یعقوبی] ۲۷۸)۔ اسی طرح ابن الفقیہ تخصیص سے بیان کرتا ہے کہ آمو دریا خوارزم کو عبور کرکے بحیرۂ خراسان میں داخل ہو جاتا ہے اور دوسری جگہ یہ بھی واضح کر دیتا ہے کہ اس سمندر سے مراد یہی بحیرۂ خَزَر (Caspian) ہے (نسخۂ مشہد، ورق ۱۶۳۔الف)۔ ابن خُرّداذبہ میں (ص ۱۷۳ پر) اس عبارت کے بعد کہ ''یہ دریا خوارزم کو عبور کرکے بحیرۂ جُرجان (یعنی خَزَر) میں داخل ہو جاتا ہے'' یہ چند مبہم الفاظ نظر آتے ہیں کہ ''یا کُرْدِر (آرال) کے سمندر میں'' (اوفی بحیرہ کزدر) [یعنی بحیرۂ آرال میں، مگر قبّ نسخۂ مطبوعہ]۔ ابوجعفر الکِسائی، جس نے اپنی کتاب عجائب الملکوت میں متعدّد پرانے مآخذ سے استفادہ کیا ہے، لکھتا ہے کہ دریاے بلخ (یعنی آمو دریا) ترمذ کے راستے خوارزم کو جاتا ہے، وہاں سے سیاہ کوہ (یعنی چینگ) پہنچتا ہے اور اُن مقامات میں جھیل کی سی دلدلیں بناتا جاتا ہے اور اس کے بعد بحیرۂ طبرستان (یعنی بحیرۂ خَزَر) میں جا گرتا ہے [آیا صوفیا، شمارہ ۳۳۰۸، ورق ۹ الف، جس میں 'خوازالسام' کی جگہ 'خوارزم' اور 'کالمرۃ' کی جگہ 'کالبُحَیرۃ' پڑھنا چاہیے۔ اس کتاب کے اَور نسخے بھی استانبول میں موجود ہیں]۔

ایران کی داستانوں میں بھی مذکور ہے کہ آمو دریا بحیرۂ خَزَر ہی میں گرتا ہے: ابن الفقیہ (نسخۂ مشہد، ورق ۱۵۵۔ب) گودَرْز (=Gotarzes، پارتھیا کا وہ بادشاہ جو سنہ ۴۱ تا ۵۱ عیسوی میں جُرجان کے نواح میں حکومت کرتا تھا) کی داستان میں بحیرۂ خَزَر کے دائیں اور بائیں دونوں کناروں کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ جہاں بِہْرُوذ (یعنی آمو دریا) خوارزم کے صحراؤں میں سے ہو کر سمندر (یعنی بحیرۂ خَزَر) میں گرتا ہے وہاں کچھ ترک قبیلے آباد تھے۔ فردوسی کی ایک بیان کردہ داستان (طبع Vullers، ۳: ۱۱۹۳) میں مذکور ہے کہ جب اُوزْ گنج کا مشہور تورانی پہلوان پشنگ اپنے باپ افراسیاب کی فوج کی طرف ہٹ رہا تھا تو افراسیاب نے ابھی آمو دریا کو عبور نہ کیا تھا، جس کا یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ اس وقت یہ دریا شہر اور گنج کے جنوب میں بہتا تھا۔ آرسلان آغزی [= دہانِ شیر]، جسے قدیم ایرانی داستانیں (ابن فقیہ، طبع ڈخویہ (De Goeje)، ص ۲۹۰؛ فردوسی، طبع وُلّرز (Vullers)، ۳: ۱۳۷۳) بحیرۂ خَزَر اور اطرافِ جُرجان سے مربوط قرار دیتی ہیں، اور آمو دریا کا وہ بند جس کے نیچے سے یونانی فوجیں واقعۃً گزر سکیں اور جس کا ذکر انھوں نے بطورِ آبشار کیا ہے (Strabo، xi:۵۰؛ Polybius، x: ۴۸) دونوں ضرور ایک ہی مقام ہوں گے۔ یہ بند یا آبشار یقیناً وہی گُورلادی (Gürledi) کا بند (سدّ) ہو گا جو مذکورۂ بالا آغز چہ کے اوپر واقع تھا؛ اس کا ڈُلڈُل آتلغان سے، جو بالائی خوارزم میں واقع ہے، کوئی تعلق نہ تھا.

(۴) یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ بیرونی جس زمانے کو آمو دریا کی تاریخ کا چوتھا دور شمار کرتا ہے اس کے خاتمے کی تعیین بطلمیوس کے عہد کے بعد کرتا ہے، یعنی اس دور کے خاتمے کا جب یہ دریا میدانِ خوارزم سے گزر کر جھیل آرال میں گرتا تھا، کیونکہ اس نے اپنی دوسری تصنیف (الآثار الباقیۃ، ص ۳۵) میں بیان کیا ہے کہ شہر کاث (یا کات) ۳۰۵ء میں تعمیر کیا گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی لکھا ہے کہ خوارزم میں تہذیب کا آغاز ۱۲۹۲ [؟] میں ہوا تھا۔ بیرونی قدیم خوارزم شاہی خاندان کے آخری شہزادے ابو منصور بن علی بن عراق کا شاگرد تھا (قبّ ابن فضلان، ص ۱۰)، اس لیے قدیم خوارزمی تقویم اور آمو دریا کی تاریخ دونوں کے متعلّق معلومات اُن قلمی آثار سے حاصل کر سکتا تھا جو خوارزم شاہیوں نے چھوڑے تھے۔ بہرحال جو معلومات اس نے قدیم خوارزم شاہی خاندان کے متعلّق مہیّا کی ہیں ان کا معتبر ہونا مصدَّق ہے، اس لیے کہ یہ بیانات ان بیانات سے مطابقت رکھتے ہیں جو چینیوں نے اس خاندان کے بارے میں لکھے ہیں [دیکھیے مادّۂ خوارزم، در [آ، ترکی]۔ بیرونی کا یہ بیان کہ سابقہ زمانے میں بھی آمو دریا کے پانی کا ایک قلیل حصّہ ڈلڈل آتلغان کی چٹانوں کے درمیان بہتا تھا ضرور اُن روایات کی صداے بازگشت ہے جن کی رو سے سنہ عیسوی سے صدیوں پہلے بھی اس دریا کا ایک حصّہ ان میدانوں کو سیراب کرتا تھا جن میں وہ ڈلڈل آتلغان کی پہاڑیوں میں سے گزر کر داخل ہوتا تھا۔ بیرونی کے قول کے مطابق خوارزمی لوگ پہلے کسی زمانے میں دریا کی قدیم گزرگاہ ''فُخّی'' کے آس پاس آباد تھے، یعنی اس علاقے میں جس میں خوارزم کا پرانا صدر مقام کاث واقع تھا۔ بیرونی نے آمو دریا کی پرانی گزرگاہوں کی جو تفصیل لکھی ہے اس میں بطلمیوس کے بیان سے بھی استشہاد کیا ہے۔ اس سے اُس کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ ایک یونانی مصنّف کے بیان سے اُن اطّلاعات کو معتبر اور مصدّق قرار دے جو قدیم خوارزم شاہیوں کے زمانے کی تصانیف میں موجود تھیں یا خوارزمیوں کے بیانات

سے فراہم کی گئی تھیں۔ اگر یہ صورت نہ بھی ہو تو اس نے بطلمیوس کے کسی بیان کی تائید و توثیق کے لیے تو یہ روایتیں نہ گھڑی ہوں گی، اس لیے کہ بالکل انھیں روایتوں کا پرتو (یعنی یہ کہ آمو دریا ایک جنوبی گزرگاہ پر بہتا ہوا بلخان کی طرف جاتا تھا اور آخر بحیرۂ خزر میں گرتا تھا) ان بیانات میں بھی نظر آتا ہے جو بلخان کے متعلق مُقدّسی (ص ۲۸۴)، یاقوت (۱: ۷۹، ۴۷، ۳، ۴۷۳) اور ابن الاثیر (۹: ۲۶۷) نے نقل کیے ہیں۔ لیکن بارٹولڈ کا یہ خیال تھا کہ خوارزمی اُورزبوی کے متعلق یہ بیانات محض موہوم افسانے ہیں۔ بیرونی کا خیال تھا کہ خوارزم کا میدان اور جھیل آرال دونوں ازمنۂ تاریخی کے اندر وجود میں آئے ہیں حالانکہ یہ جھیل ارضیّات کے پلیُوسین (Pilocene) دَور میں بھی موجود تھی (دیکھیے Machatschek: کتابِ مذکور، ص ۲۹۴).

(۵) بیرونی نے آمو دریا کے وسطی اور زیریں حصّوں میں رہنے والی اقوام کے متعلّق جو باتیں لکھی ہیں وہ ایسی ہیں کہ اُن سے بہت سے پیچیدہ مسئلے حل ہو جاتے ہیں؛ مثلاً اس نے ارض الغُزّیّہ کا جو ذکر کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ Ωζείαυοί جن کے متعلّق بطلمیوس نے لکھا ہے کہ وہ اس صوبے میں آباد تھے وہ اوغوز [الغزّیّہ] ہی تھے۔ بیرونی نے یہ نام بطلمیوس کے بیان سے نہیں لیا، کیونکہ اس کا ذکر ایرانی داستانوں میں بھی آیا ہے (قبّ فردوسی، طبع وُلّرز (Vullers)، ۳: ۱۱۹۳، بیت ۱۰۳۴) کہ غُزّ اور اَللّان (Alan) قبیلے ان علاقوں میں آباد تھے۔ آمو دریا کی خوارزمی اورزبوی والی گزرگاہ کا جو حصّہ تُویہ مویون (Tüye-Moyun) سے لے کر ساری قمیش تک پھیلا ہوا ہے اُسے "خیز تنغری" کا نام دیا گیا ہے جو خالص ترکی ہے۔ یہ نام پِچِنک بولی کا بقیہ ہے جس میں حرف قاف کا تلفظ غالباً حرف خاء سے ادا ہوتا تھا اور جس میں غالباً 'تنگز' کو حلقی شکل دے کر 'تنغز' بنا دیا گیا ہے، تاہم اصل اورزبوی (Özboy) کو اللّان کی ایرانی زبان میں (یا پھر خوارزمی میں) 'مزدا بستی' کہتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پچنک ساری قمیش کے علاقے میں اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ابن خُرّداذبہ کے زمانے میں (۸۴۰ء کے قریب) اُوسُت یورت (Üst-Yurt (Usturt) کی گرمائی خیمہ گاہوں میں بھی آباد تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ سٹرابو (۱۱: ۵۱۱) نے جن قوموں کا نام Aσίοί اور Πασιάνοι یا Πασιάχαί کی شکل میں لکھا ہے وہ یہی آس اور پچنک لوگ تھے، جن کے نام ذرا سے بدلے ہوئے ہیں اور جو ساری قمیش۔ خوارزم۔ اورزبوی کے میدانوں میں ہمسایوں کے طور پر رہتے تھے (دیکھیے ابن فضلان، ص ۲۶۵)۔ افراسیاب کے بیٹے پشنگ کے نام کو بھی، جس کا ذکر ایرانی داستانوں میں آیا ہے (فردوسی، طبع وُلّرز (Vullers)، ۳: ۱۱۴۴ببعد) اور جو والی خوارزم تھا، اُن پچنک لوگوں کے نام سے ضرور کچھ نہ کچھ مناسبت ہے جو اُورگنج کے قرب و جوار میں آباد تھے۔ فردوسی (۱: ۱۱۵) میں جو [اَلانان دِژ] (الان لوگوں کا قلعہ: آج کل کا قزیل الان) کا نام آتا ہے اُس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اَللّان قبیلے کے لوگ ساری قمیش سے لے کر جُرجان کی سرحدوں تک، یعنی زیریں خوارزمی اورزبوی کے پورے علاقے میں، آباد تھے۔ اَلان اور آس کے اِس علاقے کو ترک کر دینے، یعنی اورزبوی کے خشک ہو جانے، کا واقعہ ساتویں صدی کے دوران پیش آیا ہوگا [دیکھیے مادّۂ اَللان، در آ، ترکی]۔ مارکار (Marquart) شہر بلخان کی تباہی کی تاریخ اُس بوزنطی بیان سے ثابت کرنا چاہتا ہے جو ۴۶۷ء میں شہر Βαλaáμ پر ایرانیوں کے قبضے کے متعلّق ملتا ہے (Ungar. Jahrb.، ۹: ۹۷)۔ ایلبرٹ ہرمان (Albert Herrmann: Alte Geographie des unter. Oxusgebiets، ص ۵۱) کا خیال یہ ہے کہ یہ واقعہ پانچویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں رُونما ہوا۔ البکری نے جو بیان ابن خُرّداذبہ سے لیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پچنک ۸۴۰ء تک اُورگنج کے قریب رہتے تھے لیکن ۸۶۰ء سے اگلے عشرے تک وہ بحیرۂ خزر والے باقی شمالی اضلاع میں آباد نظر آتے تھے۔ اس قسم کے ملاحظات کا مطلب یہ ہے کہ ترکی قبائل، مثلاً اوغوز (Öguz) اور پچنک (Pechenek)، صرف چھٹی صدی میں، یعنی "گورک تُرکوں" کے زمانے کے بعد آمو دریا کے وسطی اور زیریں طاس میں آئے تھے، اس کے سوا کچھ نہیں کہ تاریخ کو بگاڑا جائے اور اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جن کا دعویٰ یہ ہے کہ ازمنۂ قدیمہ میں ان علاقوں میں صرف ہندی۔ یورپی قبائل آباد تھے۔ وسطی آمو دریا اوغوز کا قدیم وطن تھا اور اسی طرح زیریں آمو دریا کی گزرگاہیں خوارزمیوں، پچنک اور اَللان کا۔ اوغوز اور پچنک قبیلوں کا مشرقی ایرانی قبائل سے ان اضلاع میں گہرا رابطہ تھا۔ اگر اس امر کی توثیق ہوگئی کہ جو قبیلے اوغوز (Öghuz) کے نام سے موسوم تھے وہ بطلمیوس کے زمانے تک ان علاقوں میں آباد ہو چکے تھے تو ممکن ہے یہ تیسری اور دوسری صدی قبل مسیح میں مغرب کی طرف ہُنوں کے اقدام کا ایک نتیجہ ہو۔ اسی طرح یہ خیال ان ترکوں کے متعلّق بھی ظاہر کیا گیا ہے جو ہِفتالی [ہَیاطِلی] (Hephtalite) دور میں جُرجان میں نمودار ہوئے تھے (دیکھیے Marquart: Komanen، ص ۷۰).

آخر میں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ کاتب چلپی (جہان نُما، ص ۳۵۹ ببعد) اسلامی مآخذ کے ان بیانات کی کہ آمو دریا بحیرۂ خزر یا جھیل آرال میں گرتا تھا تطبیق کا خواہاں تھا؛ جہان نُما کے اُس نقشے میں جو ص ۳۴۸ پر درج ہے (اور جسے Galatali Migirdich نے کھینچا تھا) سیر دریا اور آمو دریا کے زیریں مجاری سے متعلّق جو معلومات موجود ہیں ان کے سمجھنے کے بعد کھینچا گیا تھا، یعنی آمو دریا اور سیر دریا دونوں اپنی مختلف شاخوں کے ذریعے بیک وقت بحیرۂ خزر اور جھیل آرال میں گرتے تھے، یا یہ کہ آمو دریا کے مختلف ناموں سے یہ سمجھ لیا گیا کہ یہ معلومات مختلف دریاؤں کے متعلّق ہیں۔ علی سُآوِی اِفندی نے ۱۸۷۳ء میں ایک چھوٹی سی کتاب پیرس سے شائع کی، جس کا نام "خِیوہ فی محرّم سنة ۱۲۹۰" ہے۔ اس کتاب میں جو نقشہ ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنّف کو آمو دریا کے کناروں کے متعلّق یونانی، اسلامی اور زمانۂ حاضر کے یورپی مآخذ سے جو معلومات حاصل ہوئیں انھیں ترتیب دینے کی کوشش کی ہے۔ (یہ نقشہ کتاب کی

اُس نئی طباعت میں موجود نہیں جو ۱۳۲۷ھ میں استانبول میں شائع ہوئی).

ماخذ: (۱) ڈخویہ (M.de Goeje): *Das alte Bett des Oxus*، لائڈن ۱۸۷۵ء؛ (۲) بارٹولڈ (Barthold): *Svedeniya ob aralskom mo-re i nizovyakh Amŭdaryi*، تاشقند ۱۹۰۲ء (جرمن ترجمہ: *Nachrichten über den Aralsee und den unteren Lauf des Amu-derya*، دیکھیے *Quellen und Forschungen zur Erd-und Kulturkunde*، ۲، لائپزگ ۱۹۱۰ء)؛ (۳) Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate*، لنڈن ۱۹۰۵ء، ص ۴۵۵ بعد؛ (۴) Albert Herrmann: *Alte Geographie des untern Oxusgebiets* (در Abh. G. W. Gott، قسم فلسفہ و تاریخ سلسلۂ جدید، جلد ۱۵: شمارہ ۴)؛ (۵) وہی مصنف: *Gibt es noch ein Oxusproblem* (در *Petermann's Mitteilungen*، ۱۹۳۰ء، ۱۱/۱۲: ۲۸۶ بعد)؛ (۶) بیرونی: تحدید نہایات الاماکن (آمو دریا کی تاریخ کے متعلّق عربی متن کے لیے دیکھیے زکی ولیدی طوغان (Z. V. Togan) کی کتاب *Biruni's Picture of the World* (در *Memoirs of the Archaeological Survey of India*، نئی دہلی ۱۹۴۰ء، ۵۳: ۵۷)؛ ان دستاویزوں کے تجزیے کے لیے دیکھیے زکی ولیدی توغان: *Beruni's Bericht über das untere Oxusgebiet* (زیرِ طباعت) [تحدید نہایۃ الاماکن کے نسخۂ مکتبۂ فاتح کی میکروفلم لاہور میں موجود ہے۔ اس سے بھی مراجعت کی گئی].

(احمد زکی ولیدی توغان)

✱ **آمو دریا** [۲]: دریاے جیحون (Oxus).

اس کے نام: عہد قدیم میں یہ دریا óξoς (نیز Ωεoς، لاطینی: Oxus) کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی لمبائی ۲۴۹۴-۲۵۴۰ کیلومیٹر ہے۔ موجودہ ایرانی نام (کی اصل) کا سراغ شہر آمُل [رکّ بآن] تک، جسے بعد میں آمو کہنے لگے، لگایا جا سکتا ہے؛ عہد اسلامی کے دَور اوّل کے قدیم زمانے میں خراسان سے ماوراء النہر جانے والی شاہراہ دریا کو یہاں سے عبور کرتی تھی۔ گائیگر (W. Geiger) اور مارُکوارٹ (J. Markwart) (*Wehrot* [= وِہ رُود]، ۸۹:۳) کی رُو سے یونانی نام ایرانی مادّۂ 'وَخشُ' سے نکلا ہے، جس کا مطلب ہے ''بڑھانا''۔ اس کے ایک اور ہم تلفّظ مادّے سے بھی اشتقاق ممکن ہے، جس کے معنِی ہیں ''چھڑکنا'' (قبّ آمو دریا کے ایک معاون وَخشاب کا نام)۔ دورِ ساسانی میں اس دریا کا نام وِہ۔رُوذ یا وِہ۔رُوذ تھا (مارکوارٹ: *Wehrot*، ص ۱۶، ۳۵)۔ عرب اور اسلام سے متاثر ایرانی ایک مدّت تک اسے، بالخصوص اپنی عالمانہ تصنیفات میں، جیحون لکھتے رہے (گیارھویں صدی میں گرِدیزی نے جیحون کو دریا کے عام معنوں میں بطورِ اسمِ نکرہ استعمال کیا ہے)۔ یہ نام بہشت کے ایک دریاے جیحون (Gihon) [التکوین، ۲: ۱۳] کے نام سے مشتق ہے جس کا ذکر بائبل میں آیا ہے۔ چینی میں یہ کوئی۔شوئی (Kui-shui)، وُوُ۔ہُوُ (Wu-hu) یا پُو۔تُسو (Po-tsu) کے نام سے مشہور ہے۔ آمو دریا کے شمال میں واقع علاقے کو مسلمان ماوراء النہر [رکّ بآن] (''دریا کے اس پار کی سرزمین Transoxania'') کہتے ہیں.

دریا کی بالائی گزرگاہ: آمو دریا متعدّد تیز رو سرچشموں (head-waters) سے نکلتا ہے۔ ان میں سب سے جنوبی پَنج کا (جو وَخّاب۔قرونِ وسطٰی میں جَرُیاب، قبّ مارکوارٹ: *Wehrot*، ص ۵۲؛ بارٹولڈ: *Turkestan*، ص ۶۵۔ اور پامیر دریا سے نکلتا ہے) منبع پامیر میں واقع ہے۔ شروع میں یہ دریا شرقاً غرباً بہتا ہوا اِشکاشِم کے قریب شمال کی جانب مڑ جاتا ہے اور دائیں (مشرقی) طرف سے غُونُد اور آق صُو [رکّ بآن] اس میں آ ملتے ہیں۔ یہاں سے وہ پھر مغرب کی جانب بہنے لگتا ہے۔ اس کے دائیں کنارے کی طرف سے اس کے معاون یازگُلام اور وَنچاب اور سب سے آخر میں کُولاب دریا اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ تمام دریا اور وہ جن کے نام بعد میں آئیں گے متعدّد سرچشموں اور معاونوں سے پانی کا سرمایہ حاصل کرتے ہیں.

پَنج کے دائیں کنارے پر ملنے والا سب سے اہمّ اور سب سے بالائی معاون وَخشاب (نیز معروف بہ قزیل صُو یا سُرخاب) ہے، جسے ظفر نامۂ علی یزدی (۱۴۲۴-۱۴۲۵ء، طبع محمد اِلٰہ داد، کلکتہ [۱۸۸۷ء]-۱۸۸۸ء، ۱: ۱۷۹ بعد) میں آمو دریا کی بالائی گزرگاہ قرار دیا گیا ہے۔ دوسری طرف وہاں کے موجودہ باشندے، نیز قرونِ وسطٰی کے جغرافیہ نویس پَنج ہی کو اصلی بالائی گزرگاہ سمجھتے ہیں۔ عصرِ حاضر کے جغرافیہ نگار آق صُو کو عمودِ دریا قرار دینے کے حق میں ہیں.

آمو دریا کے منبع کے علاقے کے بارے میں انیسویں صدی ہی سے معلومات حاصل ہونے لگی تھیں (قبّ نقشہ در A. Schultz: *Landeskundliche For schungen im pamir*، ہام بُورگ ۱۹۱۶ء، ص ۲۴-۲۵؛ جزئیات کے لیے مادّۂ پامیر در آآ، طبع دوم میں دیکھیے)۔ عرب جغرافیہ نویسوں نے صحیح صورتِ حال کو پورے طور پر نہیں سمجھا۔ علاوہ بریں انھوں نے سرچشموں کے ناموں کی جو تاویلات پیش کیں وہ بھی متنازعہ فیہ ہیں۔ الاصطخری (ص ۲۹۶ = ابن حوقل، طبع کرامرز، ص ۴۷۵) نے پانچ دریاؤں کے نام لیے ہیں جن کے نہر جرُیاب میں جمع ہونے سے دریاے جیحون بنتا ہے۔ ان ناموں کی موجودہ ناموں سے جو تطبیق بارٹولڈ نے دی ہے اور جس سے منورسکی نے بھی بالعموم اظہارِ اتّفاق کیا ہے بغایت قابلِ قبول نظر آتی ہے (دیکھیے بارٹولڈ: *Turkestan*، ص ۶۸ بعد؛ مِنوُرسکِی: حُدود، ص ۲۰۸، ۳۶۰؛ مارکار: *Ērānšahr*، ص ۲۳۳ بعد اور *Wehrot*، ص ۵۳ اور لی سٹرینج، ص ۴۳۵ نے مختلف طور کی تطبیق پیش کی تھی)۔ ان ندیوں کے سنگم کا علاقہ تیرھویں صدی میں آرُحَن [ابن حوقل: آرھن] (ظفر نامہ میں اَرھَنگ) کے نام سے مشہور تھا۔ البیرونی نے

حُسارَہ (حُ (بہ) سارَہ) لکھا ہے۔ المَقدِسی، ص ۲۲ نے دریاے القُواذیان کو جیحون کا چھٹا سرآب شمار کیا ہے۔ کُوکُچہ اور قُندُز دریا بائیں کنارے کے دوسرے معاون ہیں جن کا ذکر عربوں کے ہاں آیا ہے (الطّبری، ۲: ۱۵۹۰؛ ابن خُرّداذْبہ، ص ۳۳؛ ابن الفقیہ، ص ۳۲۴؛ ابن رُستہ، ص ۹۳؛ منورسکی: حدود، ص ۳۵۳ و بعد)۔ دائیں جانب سے اس میں کافِرنِہان (۲۶۰ کیلومیٹر؛ قرونِ وُسطٰی میں رَامِذ، ابن رُستہ، ص ۹۳ میں زامِل، جو آج کل اس [جیحون] کے ایک بالائی معاون کا نام ہے) اور سُرخان (۲۰۰ کیلومیٹر؛ قرونِ وُسطٰی اور چودھویں صدی میں موسوم بہ چَغان رُوذ) آملتے ہیں۔ بعض جغرافیہ نویسوں کا خیال ہے کہ اصل دریاے جیحون پنج آب (موجودہ ایُوَج۔ بارٹولڈ: Turkestan، ص ۷۲) کے مقام پر کافرنِہان کے دہانے ہی سے شروع ہوتا ہے۔ دہانے سے قبل (فاصلہ: ۱۱۷۵ کیلومیٹر) اس کا آخری (دایاں) معاون سُرخان دریا ہے، کیونکہ معمولی حالات میں دریاے شِیر آباد اور دریاے کالِف آمو دریا تک نہیں پہنچ پاتے اور دریاے زرافشان [رکّ بآن در آ، طبع دوم] کا پانی بھی خشک ہو جاتا ہے اور وہ بھی آمو دریا میں نہیں ملتا۔ اسی طرح بائیں کنارے کی طرف کے بے شمار دریا بھی آمو دریا تک پہنچتے پہنچتے ریت میں جذب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ دریاے مُرغاب (زیریں) عہدِ اسلامی میں جیحون تک نہیں پہنچتا تھا۔ یونانی مآخذ کے اس بیان کی صحت ابھی تک مشکوک ہے کہ اُن کے زمانے میں یہ دریا آمو دریا میں شامل ہو جاتا تھا (بطلمیوس (Ptolemy)، ۶: ۱۰؛ [قبّ مادّہ مُرغاب]، [در آ، طبع دوم]۔ ہری رُوذ [رکّ بآن] Arius قرہ قُوم کے صحرا میں خشک ہو جاتا تھا (سٹرابو Strabo، xi: ۵۸؛ بطلمیوس، ۶: ۱۷، قبّ پاؤلی وِسّووا- Pauly-Wissowa، ۲: ۶۲۳ بعد).

آمو دریا کے بالائی علاقے میں حسبِ ذیل اضلاع ہیں: وَخان (دریاے پَنج پر)، پھر بَدَخشان (دریا کے دونوں طرف) اور شُغنان، جس میں پنج اور بالائی مرغاب کے مقامِ اتّصال کے جنوب و جنوب مشرق میں غاران (غَرَان) واقع ہے اور مزید شمال میں دَرْوَاز۔ آمو دریا اور وَخش کے درمیان [خُتَّلان] واقع ہے۔ وَخش خطّۂ پامیر (یعقوبی: البُلدان، ص ۲۹۰ میں یہ نام [بامر] کی اور الدِّمَشْقی کے ہاں [؟] 'فامرٗ' کی صورت میں آچکا ہے) سے گزرتا ہوا رَشْت (گردیزی، طبع ناظم، ص ۳۵، میں یونہی لکھا ہے اور یہی صحیح ہے) اور کُمیذ [کماد، در یعقوبی] کے ساتھ ہو کر بہتا ہے۔ وَخش اور کافرنِہان کے درمیان ازمنۂ وُسطٰی میں واشْجِرد (موجودہ فیض آباد) اور قُواذیان (موجودہ قَبادِیاَن) واقع تھے۔ وادیِ سُرخان چَغانیان (عربی صَغانیان) کے صوبے پر مشتمل تھی۔ بائیں کنارے پر بدخشان کے مغرب میں طُخارِستان کا صوبہ تھا (تقریباً بلخ تک)۔ اس مقام پر آمو دریا اُس صحرائی منطقے میں داخل ہو جاتا ہے جو موجودہ قرہ قُوم (بائیں کنارے پر) اور قِزِل قُوم (دائیں کنارے پر) کے درمیان واقع ہے۔ یہاں عملِ تبخیر سے اس کا خاصا پانی اُڑ جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ قدیم صُغدیہ (Sogdia) کے قریب بہتا ہوا بالآخر خوارِزم جا پہنچتا ہے.

انیسویں اور بیسویں صدی میں یہاں بخارا اور خیوہ کی اِمارتیں تھیں۔ جنوبی جانب ۱۸۸۶-۱۸۹۳ء کی تعیینِ سرحد کے بعد سے آمو دریا پامیر دریا سے قلعۂ پنج ہوتے ہوئے کالِف کے جنوب میں بوساغہ (Bosaga) تک افغانستان کی ۱,۱۰۰ کیلومیٹر لمبی سرحد کا کام دیتا ہے۔ ۱۹۲۴ء سے آمو دریا سے تاجِکستان کی جنوبی سرحد کی تشکیل ہوتی ہے اور اتحادِ سوویتی میں صوبائی سرحدوں کی آخری ترمیم (۱۹۳۶ء) کے بعد سے یہ اپنی زیریں گزرگاہ میں تُرکمنستان سے اُزبکستان کو (بشمول قرہ قلپاقیہ، جس میں ڈیلٹا کا سارا علاقہ شامل ہے) قریب قریب جدا کر رہا ہے۔

ازمنۂ وُسطٰی کے بارے میں تاریخی نقشوں کے لیے دیکھیے منورسکی: حُدود، ص ۳۳۹؛ لی سٹرینج، نقشہ ۹ و ۱۰؛ *Atlas Istorii SSSR*، ج ۱، ماسکو ۱۹۴۹ء، ص ۶، ۱۲، ۲۶؛ A. Herrmann: *Atlas of China*، کیمبرج (میساچوسٹس)، ۱۹۳۵ء، ص ۲۴، ۳۲، ۴۹، ۶۰۔ ازمنۂ مابعد کے لیے قبّ *Atlas Istorii SSSR*، ج ۲، ماسکو ۱۹۴۹ء، ص ۱۵، ۱۷ دائیں طرف پایین، ۱۸؛ بُرہان الدین خان کُشکَکی: *Kattagan-i-Badakhshan*، فارسی سے روسی میں ترجمہ از سیمینوف (A. A. Semenov)، تاشقند ۱۹۲۶ء؛ (۳) A. Herrmann: *Atlas of China*، ص ۶۶ (قوموں کی تقسیم)؛ (۴) *Westermann Atlas zur Weltgeschichte*، ج ۳، بُرنزوِک ۱۹۵۳ء: ص ۱۳۴، ۱۳۵.

ازمنۂ وُسطٰی میں آمو دریا پر حسبِ ذیل مقامات خاص طور پر اہم تھے: تِرمِذ، کالِف، زَمّ (کَرخی؛ بائیں جانب) جس کے بالمقابل اَخسی کث واقع ہے، آمُل (چارجُوی؛ بائیں جانب) جس کے بالمقابل فِرَبر ہے اور بالآخر خوارزم کے مختلف شہر [قبّ مادّہ ہاے کالِف، زَمّ، کرخی، اخسی کث در آ، طبع دوم اور باقی در طبع اوّل و دوم].

آمو دریا کا پانی وسطی گزرگاہ میں پہنچ کر چڑھ جاتا ہے۔ اپریل-مئی میں اس کا پاٹ ۳,۵۷۰-۵,۷۰۰ میٹر ہو جاتا ہے اور گہرائی ½۱ سے ۸ میٹر تک۔ جولائی میں دریا پھر اتر جاتا ہے۔ اس کے کناروں کے علاقوں، بالخصوص دائیں کنارے پر واقع علاقوں میں، اکثر سیلاب آتا رہتا ہے، لہٰذا یہاں وقتاً فوقتاً بہت گھنی نباتات اور جھاڑیاں اُگ آتی ہیں۔ اس علاقے میں آب پاشی کے لیے دریا سے براہِ راست پانی حاصل نہیں کیا جاتا، تاہم ازمنۂ وسطٰی میں ایک پتلی سی [نہر] اس کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ چلتی تھی، جسے زرعی مقاصد کے لیے کام میں لایا جاتا تھا۔ ظاہر ہوتا ہے کہ چودھویں صدی سے یہ علاقہ بے درخت میدان کی صورت اختیار کرنے لگا (بارٹولڈ: *Turkestan*، ص ۸۱ بعد).

زیریں گزرگاہ اور اس کی تبدیلیاں: زمانۂ قبل از تاریخ بلکہ تاریخی زمانے میں بھی آمو دریا اپنی وسطی گزرگاہ سے آگے، کالِف سے کچھ پرے جا کر، مختلف

سمتوں میں اپنی راہ بدلتا رہا ہے۔ بقول بطلمیوس کالِف اور زَمّ (کَرخی) کے درمیان کے علاقے میں آمو دریا قریب قریب مغرب کی جانب مڑ کر (موجودہ دَور کے برعکس جس میں اس کا بہاؤ شمال مغرب کی طرف ہے) صحراے قرہ قُوم کے علاقے میں داخل ہو جاتا تھا۔ البیرونی نے بھی ایک پرانے دور میں دریا کا یہی بہاؤ قیاسًا تصوّر کیا تھا (قبّ احمد زکی ولیدی طوغان: *Biruni's Picture*)۔ حقیقت میں اس کی ایک قدیم گزرگاہ کا سراغ لگانا ممکن ہے۔ یہ دریا کَرخی کے مقام سے متفرّع ہو کر ریپتیک (Repetek) اور اُوچ حاجی کے بیچ میں سے گزر کر (سابقہ) دریاے اُنگُز کی گزرگاہ اختیار کرکے مسلسل بہنے لگتا تھا؛ مثلاً ۱۹۲۸ اور ۱۹۴۰ء کے مابین اس علاقے میں آمو دریا کے بہاؤ کا میلان جنوب کی طرف ہونے لگا تھا، لہٰذا علمِ ارضیات کی رُو سے اس کی گزرگاہ میں ایسی تبدیلی خارج از امکان قرار نہیں دی جا سکتی۔ قدیم جغرافیہ نویسوں کے انتہائی غیر یقینی بیانات سے کچھ اور نتائج اخذ کرنے سے پہلے (اُن گھونگھوں کے باوصف جو البیرونی کے بیان کی رُو سے وہاں پائے گئے تھے) یہ ضروری ہے کہ دریاے اُنگُز کی گزرگاہ کے بارے میں اس نظریے کی مزید ارضیاتی تحقیق کی جائے۔ البیرونی کا بیان یہ ہے کہ آمو دریا اُنگُز ایک بہت بڑی صحرائی جھیل میں جا گرتا تھا اور بحیرۂ خزر تک نہیں پہنچ پاتا تھا۔ دوسری طرف سٹرابو (Strabo) (xi: ۵۰) اس کے بحیرۂ خزر میں گرنے کا ذکر کرتا ہے۔ بہر حال خوارزم کی ثقافت، جس کے پیچھے دس صدی کی تاریخ ہے اور جس کا ارتقا ناممکن ہوتا اگر آمو دریا کے ذریعے آب پاشی نہ ہوتی، اس امر کی بیّن شہادت ہے کہ اس زمانے میں اُنگُز ہی آمو دریا کی واحد زیریں گزرگاہ نہیں ہو سکتا تھا.

البیرونی نے فرض کر لیا ہے کہ آمو دریا اپنی گزرگاہ میں بعض رکاوٹوں کی وجہ سے زمانۂ مابعد میں دریاے اُنگُز میں شامل ہونے کی بجاے ڈلڈل آتلغان اور تُویہ مویُون (یعنی موجودہ پِٹنیاک (Pitnyak)، دریا کے دہانے سے ۳۸۴ کیلومیٹر دور) کے درمیان ایک تنگ سی دریائی گھاٹی (۳۶۰ میٹر چوڑی) میں سمٹ کر بہنے لگا جو دہانِ شیر (=فَم الاَسَد) کے نام سے مشہور ہے؛ لیکن یہاں بھی ارضیاتی تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سدِّ راہ کو توڑ کر دریا کے بہ نکلنے کا واقعہ لازمًا زمانۂ قبل از تاریخ ہی میں پیش آ چکا ہوگا۔ اس دریا کے جنوب میں دریا بڑی بڑی بغلی نہروں میں بٹ جاتا ہے۔ خوارزم کی نخلستانی ثقافت کا ظہور انھیں کی بدولت ممکن ہوا ہے۔ دسویں صدی کے عرب جغرافیہ نویس طاہر یہ کو، جو دریائی گھاٹی کے جنوب میں واقع ہے، آب پاش علاقے کی جنوبی حدّ قرار دیتے ہیں مگر گیارھویں صدی میں دَرغان کو، جو مزید شمال مغرب میں (دریائی گھاٹی کے شمال میں) واقع ہے، یہ حدّ قرار دیتے تھے (بیہقی، طبع مورلے (Morley)، ص ۸۵۹)، [قبّ بیہقی، طبع غنی و فیاض، تہران ۱۳۲۴ ش، ص ۶۸۴]۔ خانِ خیوہ کی مملکت کی سرحد پہلی بار فتحِ روس (۱۸۷۳ء) کے بعد مزید جنوب (پِٹنیاک کے جنوب) میں متعیّن کی گئی.

موجودہ سَدوَر [سَدوَر = لی سٹرینج] کے بالمقابل (گھاٹی کے دوسری جانب تین فرسخ کے فاصلے پر) دریا کے دائیں کنارے سے نہر گاوخوارہ نکلتی ہے اور یہاں سے مزید پانچ فرسخ آگے نہر کَرِیَہ [کَرِیَہ = لی سٹرینج]۔ یہ نہریں بالترتیب شمال میں سلسلۂ سلطان اُوَیس طاغی اور اس کے مشرق میں اسی عرض بلد تک چلی گئی تھیں اور موجودہ زمانے کے ڈورتکول (Dörtkül) کے شمال میں، جو صوبۂ قرہ قلپاقیہ کا صدر مقام ہے، آمو دریا کے زیریں دائیں کنارے پر عہدِ اسلامی اور دور ماقبل میں اعلٰی درجے کی ثقافتی ترقّی کا باعث بنیں (قبّ تولستوو (Tolstov)، در مآخذ اور مادۂ Khwārizm).

یہاں سے مزید شمال مغرب اور شمال میں آمو دریا کی اصل گزرگاہ تاریخی زمانے میں بار بار بدلتی رہی ہے اور آج بھی اس کا یہی حال ہے۔ اس سوال پر سیر حاصل بحث ہو چکی ہے کہ کیا قدیم زمانے میں آمو دریا کی زیریں گزرگاہ کوئی اور تھی۔ ڈخویہ (De Goeje) نے یہ ثابت کرنے کے لیے تاریخی مآخذ کے حوالے دیے ہیں کہ آمو دریا تاریخی زمانے میں ہمیشہ بحیرۂ آرال ہی میں گرتا رہا، گو وہ بڑی بڑی شاخوں میں منقسم ہو کر گرتا رہا۔ بارتولڈ (W. Barthold) اس نظریے کا مخالف ہے۔ اس کا مفروضہ یہ ہے کہ مغول نے ۱۲۲۱ء میں (قدیم اُور گنج [رکّ بآن در آ، طبع دوم] کا شہر فتح کرنے کی خاطر ایک مرکزی پشتے میں رخنہ ڈال کر دریا کا رُخ مغرب کی طرف پھیر دیا تھا؛ چنانچہ وہ نشیبی علاقے میں اتر کر، ساری قَمیش کے بحری قطعات اور دَلدَلوں سے گزرتا چِنگ (Čiñ = چِنک Čink) کے پشتۂ کوہ کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ اور اس کے آگے اُوزبوی (روسی Uzboy) میں سے بہتا، سولھویں صدی کے آخر تک بحیرۂ خزر میں گرتا رہا۔ اپنے اس نظریے کی تائید میں بارتولڈ حمد اللہ مُستَوفی (ص ۲۱۳، ترجمہ، ص ۲۰۶؛ ۱۱۷، ترجمہ، ۱۷۰)، حافظ ابرُو (دیکھیے بارتولڈ: *Aral*، ص ۴۸ بعد) اور ظہیر الدین مَرعَشی کے بیانات پیش کرتا ہے۔ مَرعَشی (طبع ڈورن (B. Dorn): *Muhammed. Sources* etc، ج ۱، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۵۰ء: ص ۴۳۶) نے ایک بیڑے کا ذکر کیا ہے جس نے بحیرۂ خزر میں اوزبوی کے دہانے سے لے کر جیحون تک سفر طے کیا تھا۔ خواندامیر نے (۳: ۲۴۴ - ۲۴۶ [طباعت بمبئی میں یہ حوالہ نہیں ملا]) لکھا ہے کہ سلطان حسین بایقرا نے اَغرِچہ (کوہ بَلخان) سے اَذاق (موجودہ آق قلعہ) تک سفر کیا اور آمو دریا کو 'سات روز بعد' عبور کیا؛ لیکن اس شہادت کا بیشتر حصّہ مشکوک ہے کیونکہ خود خواندامیر نے اپنے جغرافیائی ضمیمے میں واضح طور پر آمو دریا کا بحیرۂ آرال میں گرنا بیان کیا ہے۔ ان تمام امور کو سامنے رکھتے ہوئے ڈخویہ جس نتیجے پر پہنچا ہے وہ بارتولڈ کے نظریے سے زیادہ وزنی معلوم ہوتا ہے.

اس کے باوجود مؤرّخین نے بالعموم بارتولڈ کے نظریات کی حمایت کی ہے، چنانچہ لیسٹرینج، ہرمان (A. Herrmann) اور زکی ولیدی طوغان (*Biruni's Picture*، جس کا اعادہ اختصار کے ساتھ آ، ترکی، ۱: ۴۲۳ - ۴۲۶ میں پیش کیا گیا ہے) کی راے یہی ہے کہ قدیم تر زمانے میں بھی آمو دریا بحیرۂ خزر ہی میں

گرتا رہا ہے۔[احمد زکی ولیدی طوغان کے جدید ترین بیانات اس مسئلے کے متعلّق (دیکھیے سطورِ بالا) آمو دریا(۱) میں درج ہوے ہیں].

بارتولڈ اور اس کی تقلید میں طوغان کا خیال ہے کہ سولھویں صدی وہ زمانہ تھا جب آمو دریا کا دہانہ ایک بار پھر بحیرۂ آرال کی طرف منتقل ہوگیا۔ اس سلسلے میں دونوں نے ۱۵۵۸ء میں یہاں آنے والے ایک انگریز سیّاح جنکنسن (Anthony Jenkinson) در R.Hakluyt: *The Principal Navigations* etc.، ج۱، لنڈن ۱۹۲۷ء، ص۴۴۹) اور ۹۹۰ھ/ ۱۵۸۲ء میں آنے والے ایک عثمانی سیّاح سَیفی (بارتولڈ: *Aral*، ص۱۷؛ وہی مصنف: *Oroshenie*، ص ۹۳) کے بیانات کے حوالے دیے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے ابوالغازی (ولادت ۱۶۰۳ء) کا بھی حوالہ دیا ہے، جس کے بیان کے مطابق آمو دریا کا رخ (ابوالغازی) کی پیدائش سے ۳۰ برس پیشتر (اس اعتبار سے ۱۵۷۳ء کے لگ بھگ) تبدیل ہوا تھا۔ خوارزمی مصنّف آگہی اور مُؤنس کے وقائع نامۂ خِیوہ (انیسویں صدی) کی رُو سے یہ واقعہ ۱۵۷۸ء میں پیش آیا تھا (بارتولڈ: *Aral*، ص۶۹-۷۴)۔ اس طرح سولھویں صدی کے بعد کے زمانے سے آمو دریا کا بحیرۂ آرال میں گرنا بغیر کسی شک وشبہہ کے ثابت ہو جاتا ہے.

اگرچہ اس نظریے کی رُو سے کہ سولھویں صدی تک اُوزبوی آمو دریا کی زیریں گزرگاہ کا کام دیتا رہا اس کی زیریں گزرگاہ کا مسئلہ مؤرّخین کے نقطۂ نظر سے تشفّی بخش طور پر طے ہو جاتا ہے (قبّ A. Herrmann: *Gibt es noch ein Oxus-Probleme?*، در *Petermanns Mitteilungen*، ۱۹۳۰ء، ص۲۸۶ ببعد)، تاہم جغرافیہ دان اور ماہرینِ طبقات الارض ہمیشہ اس خیال کو مسترد کرتے رہے ہیں (دیکھیے A. S. Kés، I. P. Gerasimov و K. K. Markov اور S. P. Tolstov در مآخذ)۔ ارضیّاتی تحقیق کی موجودہ صورت میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آمو دریا کا عارضی طور اپنا رخ بدل کر ساری قمیش میں گرنا تو ثابت ہے لیکن تاریخی زمانے میں بحیرۂ خزر کی طرف جاتے ہوے آمو دریا کی گزرگاہ اوزبوی ہرگز نہ تھا.

ڈیلٹا کے علاقے میں آمو دریا کی مختلف شاخوں کے رخ کی تبدیلی ایسا مسئلہ نہیں جو تاریخی زمانے یا موجودہ دَور میں مشکوک سمجھا جاتا ہو۔ خوارزم کا قدیم اسلامی دارالحکومت کاث [رکّ بآن] دریا کی گزرگاہ تبدیل ہو جانے کے باعث بتدریج ویران ہوگیا تھا۔ بہرحال اس بارے میں دسویں صدی کے جغرافیہ نگاروں کے بیانات کی تفسیر غیر یقینی ہے۔ وہ جھیلوں کے ایک سلسلے (خَلیجان) کا ذکر کرتے ہیں۔ بقول ابن رُستہ، ص ۹۲، یہ جھیلیں سیاہ کوہ [چِنگ] کے دامن میں واقع تھیں مگر الاِصطَخری، ص ۳۰۳ اور ابن حوقل (طبع کرامرز)، ص ۴۸۰، کی رُو سے بحیرۂ آرال کے کنارے پر تھیں؛ المَقدِسی، ص ۲۸۸، ۳۴۳ ببعد، اس کی کوئی تفصیل نہیں دیتا (قبّ نیز بارتولڈ: *Turkestan*، ص ۱۵۲؛ وہی مصنّف: *Oroshenie*، ص ۸۴؛ وہی مصنف: *Aral*، ص ۲۲)۔ شہرِ (کہنہ) اُورگنج مغول کی فتح کے بعد ''دریا کے دائیں کنارے'' (یعنی دریالق) پر واقع تھا۔ سولھویں صدی میں ساری قمیش سے اس کے انقطاع کو ایک حقیقت تسلیم کر لینا چاہیے۔ ممکن ہے آب پاشی کے دوبارہ زور شور سے شروع ہونے کے باعث اس کا پانی ضرورت کے مطابق صرف کر لیا گیا ہو۔ بہرطور (کہنہ) اُورگنج پانی سے محروم ہوگیا اور اس کی جگہ دوسرے شہروں یعنی وَزِیر (نواح ۱۴۵۰ء سے؛ سترھویں صدی میں برباد ہوگیا، اس کے کھنڈر موجودہ دیوقلعہ کے قریب واقع ہیں) اور (جدید) اُورگنج نے لے لی۔ آخرالامر خیوہ کا اس صوبے کا صدر مقام بننا بھی انھیں تبدیلیوں کا مرہونِ منّت ہے۔ اب ڈیلٹا کے ''جزیرے'' (آرال) کو اہمیّت حاصل ہوگئی۔ یہاں سے بائیں جانب نہروں کا ایک نیا سلسلہ انیسویں صدی میں جاری کیا گیا اور (کہنہ) اُورگنج کا وجود کسی حد تک دوبارہ برقرار ہوگیا.

آمو دریا کے دہانے کے علاقے کی بستیوں اور آبادی کے لیے قبّ مادّہ ہاے ''خوارزم''، ''خیوہ''، ''الان''، ''پچنگ'' (Pečeneg)، ''اوغوز''، ''تُرکمان''، ''اُزبک''، ''قرہ قلپاق''، ''سارت'' [در آ، طبع دوم].

آمو دریا کے ڈیلٹا اور اس کے زیریں حصّے منجمد ہو جاتے ہیں اور برف کی یہ تہ مجموعی طور پر آخر دسمبر سے آخر مارچ تک جمی رہتی ہے۔ یہ امر عرب جغرافیہ نگاروں اور سیّاحوں کے لیے حیرت کا موجب ہوا تھا (ابن بطُّوطہ، ۲: ۴۵۰ ببعد؛ ۳: ۱ ببعد)۔ اسی برف کی بدولت یاقوت [بلدان، ۱: ۱۹۲، دسمبر] ۱۲۱۹ء میں اپنی جان ہی گنوانے لگا تھا۔ شدید سرما کے موسم میں برف کی تہ ۱۲ انچ تک موٹی ہوتی ہے۔ دریا کے بالائی حصّے پہاڑوں میں اکثر منجمد ہو جاتے ہیں.

زمانۂ حال میں آمو دریا کا رخ بدل کر اسے بحیرۂ خزر میں گرانے کے کئی منصوبے سامنے آئے ہیں۔ ۱۷۱۶ء میں پطرسِ اعظم نے شہزادۂ الیگزانڈر بِکووِچ چِرکسکی (حقیقۃً دِوْلِت کِرْدِن میرزا، قبّ Brockhaus-Efron: *Entiskl. Slovař*، ۳: ۳۵۶ ببعد؛ *Bol'shaya Sovetskaya Entiskl.*، طبع دوم، ۴: ۴۰۶، مع حوالہ جات) کو تقریباً ہندوستان کی سرحدوں تک جہاز رانی کے قابل دریائی گزرگاہ تیار کرنے کے امکانات کا جائزہ لینے کا فرض تفویض کیا۔ ۱۸۷۳ء میں اس منصوبے کا دوبارہ جائزہ لیا گیا اور اسے بنیادی طور پر قابلِ عمل قرار دیا گیا۔ معلوم یہ ہوا کہ چارجوی سے اُنگُز میں سے ہوتی ہوئی گزرگاہ موزوں ترین ہے، کیونکہ اس طرح ساری قمیش کے نشیب کو پُر کرنے کے صبر آزما کام کی تکمیل کا انتظار کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی (قبّ A. I. Glučovskiy: *Propusk vod r. Amu-Dar'i po staromu yeya ruslu v Kaspiyskoe More*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۹۳ء)۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۵۲ء میں وسیع پیمانے پر سیلاب آنے کے بعد حکومتِ شوروی نے ۱۹۵۳ء میں اس تُند اور ناقابلِ تخمین دریا کا رخ بدل کر اسے اوزبوی کے ایک حصّے سے گزارنے کے منصوبے کو ایک بار پھر ہاتھ میں لیا ہے۔ تجویز یہ ہے کہ تاشِز (Tashiz) اور طاش (Ṭash) کے مقامات پر، جو دریا کی قدیم گزرگاہ پر واقع

ہیں، بجلی گھر (پاور سٹیشن) بنائے جائیں۔ عمو دریا کو گیارہ سو کیلو میٹر لمبی نہر کے ذریعے زیریں اُوزبوی میں گرایا جائے گا اور وہ قزیل صُوْ (Kïzïl Suw =Krasnovodsk) کے مقام پر بحیرۂ خزر میں جا گرے گا۔ دو بند تعمیر کیے جائیں گے، جن کے ساتھ بہت بڑی بڑی جھیلیں ہوں گی، تاکہ مزید بجلی پیدا کی جا سکے۔ مزید براں روئی پیدا کرنے والے ۱۳ لاکھ ہیکٹار (hectare) [ہیکٹار= ۲ء۴۷۱ ہیکٹر] رقبۂ اراضی کی آب پاشی کا بندوبست ہو جائے گا۔ اس طرح جو نئی بستیاں وجود میں آئیں گی ان کے لیے تازہ پانی کی دو نہریں تعمیر کی جائیں گی۔ یقین کے ساتھ یہ بتانا ممکن نہیں کہ اس منصوبے کو واقعۃً کس حد تک عملی جامہ پہنایا جا چکا ہے یا اس کی تکمیل کی توقع کب تک کی جا سکتی ہے۔

مآخذ: (الف) عمومی: دورِ ماقبل اسلام کے لیے قب (۱) ہرمان (A. Herrmann)، دریاؤلی وِسّووا (PaulyWissowa)، ۱۸/۲ (۱۹۴۲ء): ۲۰۰۶-۲۰۰۷؛ (۲) بارتولڈ (Barthold)، در آ آ، طبع اوّل، بذیل مادّہ؛ (۳) احمد زکی ولیدی طوغان، در آ آ، ترکی، بذیلِ مادّہ (ان دونوں محققین کی دی ہوئی معلومات سے متن میں استفادہ کیا گیا ہے) [احمد زکی طوغان کا جدید ترین مقالہ آمو دریا (۱) میں درج ہے]؛ (۴) Brockhaus-Efron: *Entsiklop. Slovaŕ*، ۱ (۱۸۹۰ء): ۶۷۶ ببعد؛ xxxiv (۱۹۰۲ء): ۶۱۰، ۷۴۲ (اُوزبوی Uzboy، Unguz)؛ (۵) *Bol'shaya Sovetskaya Entsiklopediya*، طبع دوم، ۲ (۱۹۵۰ء): ۳۰۴-۳۰۶ (مع نقشہ جس میں دریا کا علاقہ دکھایا گیا ہے)؛ — (ب) جغرافیائی: (۶) F. Machatschek: *Landeskunde von Russisch Turkestan*، شٹُٹ گارٹ (Stuttgart)، ۱۹۲۲ء؛ (۷) *Trudy karakumskoy ekspeditsii*، لینن گراڈ ۱۹۳۴ء، ج ۴؛ (۸) W. Leimbach: *Die Sowjetunion*، شٹٹ گارٹ ۱۹۵۰ء، ص ۱۱۰ ببعد؛ (۹) Th. Shabad: *Geography of the USSR*، نیویارک ۱۹۵۱ء، ص ۳۶۴-۴۰۸ (قب اشاریہ)؛ — (ج) بسترِ دریا وغیرہ کا جغرافیائی و ارضیاتی جائزہ: (۱۰) *Zap. Imp. Russk. Geogr. Ob.-va po obshčey geogr.*، ج ۴ (R. E. Lenz)، ۹، ۱۷ (A. V. von Kaulbars)، ۱۴ (Zubov)، ۲۰ (V. A. Obruchev: *Zakaspiyskayas nizmennost*)، ۳۳ (A. Konshin: *Raz'yasnenie voprosa o drevnem tečenii Amu-Dar'i*)؛ (۱۱) *Trudy Amu-Dar'inskoy ekspeditsii*، ج ۲-۴، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۷-۱۸۸۱ء؛ (۱۲) A. I. Tkhorževskiy: *Amu-Dar'ya meždu g. Kerki i Aral'skim Morem*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۶ء؛ (۱۳) L. A. Molčanov: *Proiskhoždenie presnovodnykh ozer Uzboya, Izv. Gos. Gidrolog. Instituta*، ۱۹۲۹ء، ص ۴۳-۵۷؛ (۱۴) A. S. Keś: *Ruslo Uzboy i ego genezis, Trudy instituta geografii Ak. Nauk SSSR*، ۱۹۳۹ء؛ (۱۵) K. K. Marcov و I. P. Gerasimov: *Četvertičnava geologiya*، ماسکو ۱۹۳۹ء؛ (۱۶) وہی مصنّف: *Lednikovyy period na territorii SSSR*، ماسکو-لینن گراڈ ۱۹۳۹ء؛ — (د) عام تاریخی جغرافیے کے مآخذ: (۱۷) W. Geiger: *Ostiranische Kultur im Altertum*، ایرلانگن (Erlangen) ۱۸۸۲ء، بالخصوص ص ۱۰-۳۰؛ (۱۸) W. Barthold: *Turkestan* (بالخصوص ص ۶۴-۸۲، ۱۴۲-۱۵۵)؛ (۱۹) وہی مصنّف: *Istoriya Orosheniya Turkestana*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۹۱۴ء؛ (۲۰) J. Marquart: *Ērānšahr*، برلن ۱۹۰۱ء؛ (۲۱) حدود العالم، اشاریہ (نیز نقشے)؛ (۲۲) احمد زکی ولیدی طوغان: *Biruni's Picture of the World*، نئی دہلی ۱۹۴۰ء؛ (۲۳) S. P. Tolstov: *Drevniy Khoresm*، ماسکو ۱۹۴۸ء؛ (۲۴) وہی مصنف: *Po sledam drevnekhorezmiyskoy tsivilizatsii*، ماسکو-لینن گراڈ ۱۹۴۸ء (جرمن ترجمہ از O. Mehlitz: *Auf den spuren der alt-chorezmischen Kultur*، برلن ۱۹۵۳ء)؛ آخری دو کتابوں کے لیے قب (۲۵) S. P. Tolstov: *Die Arbeitsergebnisse ders owjetischen Expedition zur Erforschung des alten Choresm, Sowjetwissenschaft*، Geisteswiss. Abt. ۱۹۵۰ء، ص ۱۰۵-۱۳۰ اور (۲۶) شپولر (B. Spular): *Chwārizms (Chorasmiens) Kultur nach S. P. Tolstovs Forschungen, Historia*، ۱۹۵۰ء، ص ۶۰۱-۶۱۵؛ (۲۷) S. P. Tolstov: *Die archäol. Forschungen der Choresm- Expedition vom Jahre 1952, Sowjetwissenschaft*، Geisteswiss. Abt. ۱۹۵۴ء، ص ۲۶۷-۲۸۰؛ — (ھ) آمو دریا کی بالائی گزرگاہ: (۲۸) J. Wood: *A Journey to the source of the River Oxus*، طبع دوم، لنڈن ۱۸۷۲ء (مع تاریخی و جغرافیائی دیباچہ از یُول H. Yule)؛ (۲۹) مارکوارٹ (J. Markwart): *Wehrot und Arang*، لائڈن ۱۹۳۸ء (بالخصوص ص ۵۲ ببعد، قب نیز اشاریہ)؛ — (و) مسئلۂ آمو دریا و اوزبوی: (۳۰) ڈخویہ (M. J. de Goeje): *Das alte Bett des Oxus*، لائڈن ۱۸۷۵ء؛ (۳۱) بارتولڈ (Barthold): *Svěděniya ob aral'skom more i nizovyakh Amudar'i*، تاشکنت ۱۹۰۲ء (جرمن میں: *Nachrichten über den Aralsee und den unteren Lauf des Amudarja*، لائپزگ ۱۹۱۰ء)؛ (۳۲) V. Lokhtin: *Rěka Amu-Dar'ya i eya drevnee soyedinenie s Kaspiyskim Morem*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۹ء؛ (۳۳) لی سٹرینج، ص ۴۳۳-۴۴۵، ۴۵۵-۴۵۸ و اشاریہ؛ (۳۴) D. D. Bukinič: *Starye rusla Oksa i amu-dar'inskaya problema*، ماسکو ۱۹۰۶ء؛ (۳۵) ہرمان (A. Herrmann): *Alte Geographie des unteren Oxus-gebietes* (*Abh. G. W. Gött.*, N. F. xv/4)، برلن ۱۹۱۴ء؛ (۳۶) F. Koláček: *Etait l'Ouz-*

boi pendant les temps historiques un ancien lit de l'A-mou-Daria? Spisy vydávané Přirodovědeskou fakultetou Masarykovy University، ۱۹۲۷ء (مع نقشہ)؛ (۳۷) W. W. Tarn: *The Greeks in Bactria and India*، ۱۹۳۸ء، ص ۴۹۱ - ۴۹۳.

(شپولر B. SPULLER، [از آ، طبع دوم کے] ادارے نے مختصر کیا)

⊗ **آمین**، عبرانی؛ بقول شیخ رضی یہ ایک سریانی کلمہ ہے اور آمِن، اَمین، آمِین وغیرہ مختلف شکلوں میں لکھا جاتا ہے اور اس کے معنی کی تعیین کے بارے میں بھی مختلف روایتیں ہیں۔ بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو اسے اللہ کے ناموں میں سے ایک نام بتاتے ہیں۔ ابوعلی الفَسَوِی اس کی یوں وضاحت کرتا ہے کہ یہ ایک ایسی ضمیر پر محتوی ہے جو اللہ کی طرف عائد ہوتی ہے کیونکہ کلمۂ آمین میں ''دعا کو قبول کر!'' کے مفہوم کے باعث اللہ کی طرف عائد ایک ضمیر مخاطب موجود ہے۔ ایک اسم فعل ہونے کی حیثیت سے ''دعاؤں کو سن! قبول کر! ایسا ہی ہو! ایسا ہی کر!'' کے معنوں کے علاوہ یہ بھی روایت ہے کہ یہ کلمہ ''بجا، بجا'' (صحیح صحیح) کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔

اگرچہ یہ کلمہ قرآن کی پہلی سورۃ الفاتحہ کے آخر میں لکھا جاتا ہے، تاہم اس پر اتفاق ہے کہ یہ قرآن کا کلمہ نہیں ہے۔ خلیفہ عثمانؓ نے جو نسخہ قرآن کا جمع کیا تھا، اس میں یہ لفظ نہیں تھا اور نہ کسی صحابیؓ یا تابعیؒ ہی سے یہ مروی ہے کہ کلمۂ آمین قرآن میں تھا۔ سورۂ فاتحہ پڑھنے والے کے لیے قراءت کے آخر میں آمین کہنا سنّت ہے۔ ایک حدیث میں یہ حکم ہے کہ نمازوں میں امام جب سورۂ فاتحہ پڑھے تو اس کے آخر میں جماعت کے لوگ آہستہ سے آمین کہیں؛ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ امام خود بھی آمین کہے یا نہ کہے۔ حنفیوں کے نزدیک مقبول یہ ہے کہ امام پوشیدہ طور پر آمین کہے۔ شافعیوں کے ہاں امام اس کلمے کو زور سے ادا کرتا ہے۔ شیعیوں میں فاتحہ کے آخر میں آمین نہیں کہی جاتی بلکہ ان کے نزدیک اگر آمین کہیں تو نماز باطل ہو جاتی ہے۔ ترکوں میں پرانے زمانے میں بچے کو مکتب میں داخل کرتے وقت کی رسموں کا نام بھی آمین پڑ گیا تھا۔ [پاک و ہند میں ایک دعا اور اُن اشعار کے لیے بھی آمین کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو بچّے کے قرآن ختم کرنے کے موقع پر پڑھے جاتے ہیں۔ دیکھیے فرہنگ آصفیہ، ۱: ۲۲۸].

[**مآخذ**: (۱) الراغب: مفردات، قاہرہ ۱۳۲۴ھ، ص ۲۵؛ (۲) محمد عبدہ: تفسیر، ۱: ۹۸-۱۰۰؛ (۳) لین (Lane): مدّالقاموس، ۱: ۱۰۲؛ (۴) Murray: *English Dictionary*، اوکسفرڈ ۱۸۸۸ء، ۱: ۲۷۶] [از آ، ترکی].

(محمد شرف الدین یالتقایا)

----

* **آناپہ**: (Anapa) گزشتہ زمانے میں بحر اسود کے ساحل پر ایک چھوٹا سا قلعہ، جو دریاے بُوگور (Bugur) کے کنارے خَورِ قُوبان (Kuban estuary) سے ۴۰ کیلومیٹر جنوب مغرب میں واقع تھا۔ یہ قلعہ فرانسیسی انجینیروں نے سلطان عبدالحمید اوّل کے لیے ۱۷۸۱ء میں بنایا تھا۔ روسیوں نے ۱۷۸۷ اور ۱۷۹۰ء میں اس پر ناکام حملے کیے لیکن جنرل گُوڈووِچ (Gen. Gudovich) نے ۱۷۹۱ء میں اسے سر کر لیا؛ گو ۱۷۹۱ء میں یاش (Yassy) کے معاہدے کی رُو سے اسے ترکوں کو واپس دے دیا گیا۔ ۱۸۰۸ء میں رُوس نے اس پر پھر قبضہ کر لیا؛ ۱۸۱۲ء میں اسے دوبارہ ترکوں کو واپس دے دیا گیا مگر ۱۸۲۸ء میں امیرالبحر گریگ (Greig) اور شاہزادہ مِنْشِی کوف (Menshikov) نے اسے محاصرے میں لے لیا اور ۱۸۲۹ء کے عہدنامۂ اِدرنہ (ایڈریانوپل، دفعہ ۴) کی رُو سے اسے روس کے حوالے کر دیا گیا۔ ۱۸۴۶ء میں آناپہ کے مقام پر ایک قصبہ آباد کیا گیا۔ جنگ کریمیا کے دوران میں رُوسیوں نے پہلے تو اسے بارود سے اُڑا دیا مگر ۱۸۵۶ء میں اس پر پھر سے قابض ہو گئے۔ ۱۸۶۰ء میں آناپہ کے باشندوں کو طِمرُوق (Temruk) میں منتقل کر دیا گیا۔ اب سے قریب کے چند عشروں میں آناپہ ساحلی تفرّج گاہ اور بچّوں کی آرام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ۱۹۴۲-۱۹۴۳ء میں دشمنوں نے اسے برباد کر دیا لیکن اب اسے ازسرِ نو تعمیر کر دیا گیا ہے.

مآخذ: (۱) نووِتسکی (Novitsky): *Anapa, Zap. Kavk. Otd. Imp. Geogr. Obs.*، ۱۸۵۳ء، ۲: ۱۴-۴۳؛ (۲) سیمینوف (P. P. Semenov): *Geogr. Slovar Ross. imperii*، ۱: ۹۶؛ (۳) روسی اور سوویتی دوائر المعارف (Encyclopaedias)؛ [(۴) سامی، ۱: ۳۸۷].

(مِنورسکی V. MINORSKY)

----

* **آنادولو**: [اَنادولو] رک بہ آناطولی (۱) و (۲).

----

* **[آناطولی]** (۱): [اَناطولی] کلمے کی عربی صورت، آنادولو، آناطولیا، ایشیاے کوچک [اس مقالے میں درج ذیل عنوانات پر گفتگو ہوگی]:

(۱) - نام.

(۲) - جغرافیۂ طبیعی.

(۳) - ترکی آناطولی کا تاریخی جغرافیہ.

(الف) ترکوں کی فتح آناطولی - پہلا دَور اور سلاجقۂ روم کی سلطنت.

(ب) آناطولی کی فتح کا دوسرا دَور اور سلطنتِ عثمانیہ کا آغاز.

(ج) آناطولی کی سیاسی تقسیمات.

(د) آبادی.

(ہ) رسل و رسائل.

(و) اقتصادی حالات.

(۱) نام:

[ترکی میں] آنادولو (عربی املا آناطولی یعنی بوزنطی تلفظ میں یونانی Ἀνατολή)، آناطولیا یا ایشیاے کوچک، وہ کوہستانی جزیرہ نما، جو بشمول اپنی کرسی یا بنیاد (base) کے بَرِّ اعظم ایشیا کے مغربی حصّے سے شروع ہو کر یورپ (جزیرہ نماے بلقان) کی طرف پھیلا ہوا ہے اور عہدِ قدیم میں ایشیاے کوچک (Μικρά' Ασία) کے نام سے معروف تھا، ۳۶ اور ۴۲ درجہ عرض بلد شمالی اور ۲۶ اور ۴۵ درجہ طول بلد مشرقی کے درمیان واقع ہے۔ جزیرہ نماے بلقان کے ساتھ مل کر یہ جزیرہ نما اپنی تاریخ کے جملہ ادوار میں وسطی یورپ اور مغربی ایشیا کے درمیان پل کا کام دیتا رہا ہے۔ زمانۂ وُسطٰی کے عرب جغرافیہ نویس اور عثمانی دَور میں ترک بھی طویل عرصے تک اس جزیرہ نما کو 'بلادُ الرُوم' (یعنی رومیوں (Rhomaeans) کا ملک) کے نام سے پکارتے رہے.

Ἀνατολή، (''طلوعِ'' آفتاب) کا نام سب سے مقدّم طور پر جغرافیائی اصطلاح کی حیثیت سے بمعنی شرق (Orient) یا لوانْٹ (Levant) استعمال کیا جاتا تھا اور اس سے وہ تمام ممالک، جو قسطنطینیہ کے مشرق میں واقع ہیں، خاص طور پر ایشیاے کوچک اور مصر، مراد ہوتے تھے۔ قیصر دوقلطیانوس (Diocletian) اور قیصر قُسطَنطِین (Constantine) نے جب ادارۂ سلطنت کو ازسرِ نو منظّم کیا تو سلطنت کی چار بڑی تقسیمات میں سے ایک کا نام ولایتِ شرقیہ (ἔπαρχος τῆς 'Ανατολῆς) ''per Orientem''، a pre fecture رکھا گیا۔ یہ وسیع ولایت پانچ اُسقُفی حلقوں (diocese) پر مشتمل تھی، یعنی مِصر، مشرق (Ἀνατολή' آناطولیا، تنگ تر معنی میں)، بُنطُس، آسیانا اور تھریس (تراکیا)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں مشرقِ وسطٰی، تراکیا (تھریس)، مصر اور لیبیا کے ملک شامل تھے۔ جب (ساتویں صدی عیسوی کے نصف اوّل کے آغاز میں) سلطنت کو صوبوں اور ولایتوں (themes) میں تقسیم کر دیا گیا تو آناطولی کی اداری اصطلاح غائب ہوگئی اور اس کے بعد 'Ανατολιχόν or θέμα' τῶν 'Ανατολιχῶν، کا نام اُس اداری علاقے کو دیا گیا جو عَمّوریّہ (Amorium) اور قونیہ (Iconium) کو محیط ہے۔ اس نسبۃً بہت چھوٹی اداری وحدت کو ابن خُرّداذبہ نے النّاطُلوس یا اُس سے ملتے جلتے کسی نام سے موسوم کیا ہے اور اس کے معنے ''المشرق'' بتائے ہیں (ص ۱۰۷؛ ترجمہ، ص ۷۹)؛ قُدامہ (طبع ڈخویہ (De Goeje)، ص ۲۵۸، ترجمہ، ص ۱۹۸) نے اسے النّاطُلِیق (بہ معنی ''المشرقی'') لکھا ہے؛ دیکھیے H. Gelzer: *Die Genesis der byzantinischen Themen-Verfassung*، لائپزگ ۱۸۹۹ء، ص ۸۳؛ F. W. Brooks: *Arabic Lists of Byzantine Themes*، در *Journal of Hellenic Studies*، ۱۹۰۱ء، ص ۶۷-۷۷۔ ولایت (theme) النّاطُلِیق (Anatolikon) کا نام ترکی فتوحات کے بعد پھر غائب ہو جاتا ہے، لیکن عمومی جغرافیائی اصطلاح آناطولی دوبارہ نمودار ہوجاتی ہے اور ترکوں میں بتدریج آنادولو کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ابتدا میں اس سے مراد صرف مغربی آناطولیا تھا۔ اس نام کے بڑے عثمانی صوبے ('اِیالت' یا 'وِلایت') میں مغربی آناطولی کی سابق ترکی امارتوں کا علاقہ شامل تھا (دیکھیے متصل بعد کا مادّہ)۔ 'تنظیمات' کے دوران (انیسویں صدی کے وسط) میں صوبوں اور ولایتوں کی ازسرِ نو تنظیم کی گئی تو آنادولو کی اصطلاح صوبہ یا ولایت کے نام کی حیثیت سے غائب ہوگئی؛ اُس وقت سے جغرافیائی اصطلاح ''آناطولی'' سارے جزیرہ نما (طرَبزُون - ارزنجان - برجِک - اسکندرونہ کے خط تک) پر مشتمل ہے۔ یہی جزیرہ نما موجودہ جمہوریہ ترکیّہ کا حصّہ غالب ہے۔ چنانچہ ترکی زبان میں اب ''آنادولو' کا اطلاق ترکیّہ جدید کے سارے ایشیائی حصّے پر کیا جاتا ہے اور اس میں وہ علاقے بھی شامل ہیں جو جغرافیائی اعتبار سے دراصل یا تو شالی الجزیرہ کے حصّے ہیں، مثلاً الجزیرہ (دیارِ بکر)، کُردِستان (وان اور بِتلیس) اور یا ارْمِنیہ کے (قارص)۔ اس مقالے میں یہ اصطلاح اسی مفہوم میں استعمال کی گئی ہے (بحیرۂ ایگہ (Aegean Sea) کے جزائر زیرِ بحث نہیں لائے گئے)۔ ۱۹۵۰ء میں ترکیّہ کا کل رقبہ ۷۶۷،۱۱۹ مربع کیلومیٹر بتایا گیا تھا۔ اس میں تراکیا (تھریس) کا رقبہ ۲۳،۴۸۵ مربع کیلومیٹر اور آناطولی کا رقبہ ۷۴۳،۶۳۴ مربع کیلومیٹر تھا۔ ۱۹۵۰ء میں ترکیّہ کی ساری آبادی ۲۰،۹۳۴،۶۷۰ تھی۔ اس میں ۱۶،۲۶۰،۲۲۹ نفوس یورپی ترکیّہ میں اور ۱۴۴۱،۰۸۰،۹۳ آناطولی میں آباد تھے.

[ترکی عہد سے پہلے کے آناطولی کے لیے دیکھیے مادّہ ''روم'']

(F. TAESCHNER تیشنر)

(۲) طبیعی جغرافیہ

ملک کی طبیعی ہیئت کا عام جائزہ: آناطولی ایک طویل و عریض بلند میدان ہے جس کے کناروں پر طولاً پہاڑی سلسلے پھیلے ہوے ہیں جو شمال اور جنوب کی طرف اور زیادہ بلند ہو گئے ہیں۔ وسطی سطحِ مرتفع ''وسطی آناطولی'' پر مشتمل ہے۔ اس کوہستانی حلقے کے شمالی حصّے کو مجموعی طور پر آناطولی کا شمالی سرحدی کوہستان کہا جا سکتا ہے اور کوہستان طاوروس [Taurus، ترکی: بوغا طاغی؛ (غلط طور پر) یلغار طاغی] جنوبی سرحد پر واقع ہے۔ وسطی آناطولی مشرق اور مغرب میں بھی پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے جہاں شمالی اور جنوبی سلسلے آ کر مل جاتے ہیں۔ اس طرح مغربی آناطولی کا وہ کوہستانی پشتہ بن گیا ہے جس کے پار بحیرۂ ایگہ کے ساحلی علاقے واقع ہیں۔ مشرق میں بالائی دریاے فرات کے پہاڑی سلسلے اور آخر میں کوہ اَرارات کی بلند سطحِ مرتفع واقع ہے جسے آناطولی کی ایک قسم کی سرحدی چوکی کہنا چاہیے.

جغرافیائی محلِّ وقوع کی بنا پر حسبِ توقّع آناطولی کے ساحل کے ساتھ ساتھ سرمائی درجۂ حرارت معتدل رہتا ہے، یعنی ماہِ جنوری میں ساحلِ بحیرۂ اسود میں اوسطاً ۵ سینٹی گریڈ سے کچھ اوپر اور جنوبی ساحل پر ۸ سینٹی گریڈ سے ذرا زیادہ۔ اس ملک کا ایک بڑا حصّہ ہلکے ہوائی دباؤ کے اس نظام کی پہنچ کے اندر ہے جو مغرب سے مشرق کی طرف حرکت کرتا ہے اور مغربی اور وسطی یورپ کے موسم پر سال بھر اثر انداز ہوتا رہتا ہے؛ اس لیے آناطولی میں جب سردیوں کا موسم آتا ہے تو ہوا

میں نمی نسبۃً زیادہ ہوجاتی ہے۔گرمیوں میں ساحلی علاقے تکلیف دہ حد تک گرم ہو جاتے ہیں۔ جولائی اور اگست میں اوسط درجۂ حرارت شمال میں ۲۲ درجے سینٹی گریڈ ہو جاتا ہے اور جنوب میں ۲۷ درجے سینٹی گریڈ سے اوپر۔ یہاں شمالی ہواؤں کا غلبہ رہتا ہے اور وہ گرمی کے موسم میں مغربی اور جنوبی ساحل پر ایسی خشکی پیدا کر دیتی ہیں جو بین الارضینی (mediterranean) آب و ہوا کی خصوصیّت ہے،لیکن سمندر کی جانب سے آنے والی یہی ہوائیں شمالی ساحل پر موسمِ گرما میں بھی مینہ برساتی ہیں۔جنوبی اور مغربی ساحل پر جو قدرتی نباتات ہے وہ ایسی سدا بہار قسم کی ہے جیسی بحیرۂ روم کے ساحلی ملکوں میں عمومًا پائی جاتی ہے۔ بہت سے مقامات پر اراضی کو قابلِ کاشت بنا لیا گیا ہے لیکن باقی زمینیں ویران ہو کر جھاڑ جھنکاڑ اُگانے لگی ہیں اور چھدری چراگاہیں بن گئیں ہیں۔شمالی ساحل کے ساتھ ساتھ چونکہ گرمیوں میں رطوبت زیادہ ہوتی ہے اس لیے وہاں نباتات زیادہ افراط سے اُگتی ہے اور ایسے پودے، جنھیں پانی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، بنوں، جھاڑیوں اور کاشت کردہ فصلوں کی شکل میں خوب پھلتے پھولتے ہیں.

سرحد کے پہاڑ سردی کے موسم میں قدرۃً زیادہ سرد—بلکہ بعض حصّوں میں انتہائی طور پر سرد—ہوتے ہیں۔ گرمی کے موسم میں وہاں کم گرمی پڑتی ہے اور ہوا میں رطوبت ساحلی علاقے کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے، لہٰذا پہاڑوں کے اطراف قدرتی طور پر جنگلی درختوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔مغربی جنوبی اور مشرقی کناروں کے پہاڑوں پر یہ درخت زیادہ تر ''خشک جنگل'' (Dry forest) بالخصوص شاہ بلوط اور صنوبری یا جوزدار (coniferous) درختوں پر مشتمل ہیں۔ان میں بہت سے جنگل قابلِ کاشت اراضی حاصل کرنے یا چراگاہیں بنانے کی مہمّ میں کاٹ دینا پڑے۔ شمال کے کوہستانی سلسلوں میں ساحل کے زیادہ قریب ''مرطوب جنگل'' (Damp forest) بکثرت ہیں اور یہاں کے بلند تر مقامات میں آلش (beech، سفیدے کی قسم کا درخت)،صنوبر اور چیڑ کی فراوانی ہے۔شمالی آناطولی کے پہاڑوں کے اندرونی سلسلوں پر بھی رطوبت کم ہونے کے باعث ''مرطوب جنگلوں'' کے بجائے ''خشک جنگل'' پائے جاتے ہیں۔''مرطوب جنگل'' کٹ جانے کے بعد پھر دوبارہ اگنے کی زبردست صلاحیت رکھتے ہیں، اس لیے انسان کی سرگرمیوں سے انھیں فنا ہو جانے کا کم خطرہ ہے.

وسطی آناطولی کی سطحِ مرتفع، جو چار طرف سے پہاڑوں میں گھری ہوئی ہے، سردیوں میں بہت سرد رہتی ہے۔ ماہ جنوری کا اوسط درجۂ حرارت درجۂ انجماد سے بھی نیچے ہوتا ہے، لیکن گرمیوں میں یہاں شدّت کی گرمی پڑتی ہے۔ چنانچہ جولائی اور اگست میں اوسط درجۂ حرارت ۲۴ سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے؛ چونکہ اس سطح مرتفع پر آناطولی کے ساحلی علاقوں اور وہاں کے پہاڑوں کی بہ نسبت بارشیں خاصی کم ہوتی ہیں، اس لیے یہ علاقہ بے درخت میدان (steppes) بن گیا ہے۔ اگرچہ بعض نقشوں میں غلط اطّلاعات درج ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وسطی آناطولی میں کوئی بیابانی خطّہ نہیں ہے۔خشک ترین علاقوں میں بھی یہ ممکن ہے کہ مصنوعی آبپاشی کی مدد کے بغیر، محض قدرتی بارش کے بھروسے پر، جَو اور گندم کی فصلیں خاصی کامیابی کے ساتھ کاشت کی جا سکیں.

مشرقی طاوروس [طورُوس] کے جنوبی کنارے پر، جہاں آناطولی اور عراق عرب کی سرحدیں ملتی ہیں، کچھ بے درخت میدان (steppes) موجود ہیں، یہ اگرچہ سطحِ سمندر سے زیادہ اونچے نہیں، تاہم سمندر سے بہت دور واقع ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں کی سردیاں بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں کی بہ نسبت کم معتدل اور کم مرطوب اور گرمیاں بہت گرم اور خشک ہوتی ہیں.

شمالی آناطولی کا سرحدی کوہستان: شمالی آناطولی کے سرحدی پہاڑوں کا سلسلہ (جو یورپ میں بالعموم Pontic Mountains [یعنی کُہسار وابستہ بہ بحرِبُنطس] کے نام سے معروف ہے) نسبۃً راست اور متوازی پہاڑوں پر مشتمل ہے جن کی بلندی ۱۲۰۰ میٹر سے ۱۵۰۰ میٹر تک پہنچ جاتی ہے اور کئی چوٹیاں دو ہزار میٹر سے بھی زیادہ اونچی ہیں۔ یہ کوہستان خاصے عریض ہیں اور بعض میں مرتفع میدان بھی ہیں۔مشرق میں نام نہاد زیغانہ کا کوہستان ہے (جو درّۂ زیغانہ کے نام سے منسوب اور طرِبزُون سے جنوب کی طرف واقع ہے)۔ یہ کوہستان دور تک تین ہزار میٹر بلند چلا گیا ہے۔ یہاں پہاڑوں کی ساخت بہت بلند کوہستانوں کی سی ہے۔ یہ پہاڑ زیادہ تر سلیٹ [سنگِ لوح]، ریتلے پتھر، بجری، سنگ برکانی اور بلّوری مواد سے بنے ہوئے ہیں۔مغرب میں—بحیرۂ مرمرہ کے جنوبی پہاڑوں کی وساطت سے — اس کوہستان کا تعلّق جزیرہ نمائے بلقان کے اندرونی دِناری (Dinari) کوہستانی سلسلوں سے قائم کیا جا سکتا ہے۔مشرق میں جنوبی قفقاز کے پہاڑ شمالی ایران کے کوہستانی سلسلوں کے ساتھ متّصل ہیں.

شمالی آناطولی کے کوہستانی سلسلوں کی مرتفع سطوح پر، جہاں خودرَو جنگل ہیں، خصوصًا کوہستان کے وسطی حصّے میں، پندرہ سو میٹر کی بلندی تک جنگل کاٹ کر قابلِ کاشت زمینیں نکال لی گئی ہیں۔ اس علاقے کی معاش کا انحصار اناج پیدا کرنے اور بھیڑ بکریاں (مشرقی اقطاع میں مویشی بھی) پالنے پر ہے۔ زیادہ تر آبادی کے علاقے وہ ہیں جہاں پہاڑی سلسلوں کے درمیان فراخ لمبی وادیاں ہیں اور پانی بہ افراط ہوتا ہے اور گرمیوں میں گرمی زیادہ اور اس لیے ان میں زراعت ہوسکتی ہے۔ان میں اہمّ ترین علاقہ بُولی گیرِدہ [گرِدہ - سامی] - چرکیش - الغازیا الغاز—طُوسِیَہ کے طاسوں کا سلسلہ ہے، جو قدیم بیتینیہ (یا بیثونِیَہ Bithynia) کے مشرقی حصّے میں واقع ہیں، نیز زعفرانبولی - قسطمونی - بویں آباد کے طاس کے رقبے، جو قدیم پافلاغونیہ (Paphlagonia) کے وسط میں ہیں، اور قدیم بُنطس (Pontus) کے علاقے میں بالائی یشیل ایرِماق (ایریس Iris) کے طاس، جو اَماسیہ اور زیلِہ اور توقاد کے ارد گرد ہیں، پھر مشرق میں کِلکِیت - چوروس (Kelkit-Čoruh) کی گہری وادی، جس کا طول پانچ سو کیلو میٹر سے زیادہ ہے.

شمالی ساحل کے پہاڑ بحیرۂ اسود سے سیدھے اوپر اٹھتے ہیں اور ساحل میں بہت کم خلیجیں ہیں۔ساحلی علاقہ بہت تنگ ہے اور جا بجا وادیوں نے اُسے قطع کیا

ہے۔ یہ بہت گنجان آباد ہے، خاص کر اس کا مشرقی حِصّہ ۔ گِرِسون [رکّ بہ GIRESUN] (Cerasus)، طرَبزُون [رکّ بآن] (Trapezus، Trebizond موجودہ Trabzon) اور رِیزِہ [رکّ بہ RIZE] کے گرد و نواح میں مکئی، لوبیا اور بالخصوص فُندُق [پہاڑی بادام] بافراط کاشت کیے جاتے ہیں۔ بڑے سپاٹ علاقے صرف یشیل ایرماق [رکّ بآن] (ایرِیس Iris) اور قزِل اِیرماق [رکّ بآن] (ہالِیس Halys) کے دالٹوں (deltas) پر ہیں، لیکن ان کا کچھ حِصّہ دلدل ہے۔ زیادہ زرخیز مٹی میں اعلٰی درجے کا تمبا کو پیدا ہوتا ہے۔ جزیرہ نمائے قوجہ ایلی [رکّ بہ KODJA-ELI] اور جزیرہ نمائے ترا کیا (تھریس) سپاٹ میدان ہیں اور اَطہ پازاری [رکّ بآن] کے میدان، جو دریائے سَقارِیہ (Sangarius) کے زیریں حصّے پر واقع ہیں، بہت زرخیز ہیں.

باسفورس کے علاوہ صرف ایک بندرگاہ ایسی ہے جو بحیرۂ اسود کی شمالی مغربی تُند ہواؤں سے محفوظ ہے۔ یہ سینُوب (Sinob) [رکّ بہ SINOH] کی بندرگاہ ہے، لیکن چونکہ اس کا عقبی علاقہ کارآمد نہیں، اس لیے آج کل یہ بندرگاہ چنداں اہمیّت نہیں رکھتی۔ صامُسُون [رکّ بہ SAMSUN] (Amisus)) کی بندرگاہ کا ریل اور سڑک دونوں کے ذریعے وسطی آناطولی کے ساتھ بہترین سلسلۂ رسل و رسائل قائم ہے۔ زونگلداق [رکّ بآن در آ، طبع دوم] اور ارِگلی [رکّ بہ EREGLI] (ہراقلیا پونٹیکا Heraclea Ponteca) کے کوئلے کی کان کنی والے اور صنعتی رقبوں کو آج کل بہت ترقّی دی جا رہی ہے۔ گزشتہ زمانے میں کوہستانِ زیغانۂ کی چاندی، سیسے اور تانبے کی کانیں (گمُوش خانہ [رکّ بآن])، بور چکہ کے قریب مُرغُل وغیرہ) خاصی اہمیّت رکھتی تھیں.

زمین کے بیٹھ جانے سے جہاں اَناطولی اور جزیرہ نمائے بلقان کے درمیان بحیرۂ ایگہ پیدا ہو گیا وہاں بحیرۂ مرمرہ کے علاقے میں شمالی آناطولی کے کوہستانی سلسلوں پر بھی اثر پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بحیرۂ مرمرہ کے (جس کا حوضہ صرف بعض حصوں ہی میں گہرا ہے) گرد و نواح میں میدان اور پہاڑیوں کے خطّے بن گئے۔ ان کی آب و ہوا بین الارضین (mediterranean) قسم کے اَور علاقوں کی طرح اچھی ہے۔ (بُرُوسَہ [رکّ بآن]) کے قریب ریشم کے کیڑے پالے جاتے ہیں اور تکیر [تکفور] طاغ [رکّ بہ TEKIR DAGH] (رودوسٹو Rodosto) کے گرد و نواح میں انگوری شراب بنائی جاتی ہے۔ شہر بوزنطیوم (Byzantium)، قسطنطنیہ یا استانبول [رکّ بآن] اپنے بے نظیر جغرافیائی موقعے کے باعث ترقّی کرتا رہا اور اس نے ہزارہا سال تک اپنی اہمیّت قائم رکھی۔ یہ شہر آناطولی اور جزیرہ نمائے بلقان کے درمیان پل پر واقع ہے، لہٰذا اُس کی تاریخ کے اہم ترین اَدوار وہ ہیں جن میں وہ ایک ایسی سلطنت کا طبعی پایۂ تخت تھا جو دونوں طرف کے علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی؛ تاہم آج بھی یہ شہر حکومتِ ترکیہ کا عالمی دروازہ اور اس کی سب سے بڑی درآمد کی بندرگاہ ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہاں کی آبنائے دو برّاعظموں یا دو مختلف تمدّنوں کو جدا نہیں کرتی بلکہ ایسی حدِّ فاصل شاید زیادہ صحیح طور پر مشرقی ترا کیا (تھریس) کے کم آباد چٹیل میدانوں اور خلنگ زاروں (جھاڑ جھنکاڑ کے علاقے) میں پائی جاتی ہے.

طاوروس (Toros Taurus) کا کوہستانی نظام: بحیثیت مجموعی جنوبی آناطولی کا سلسلۂ طاوروس شمالی آناطولی کے سرحدی سلسلوں سے خاصا زیادہ اونچا ہے۔ یہ کوہستانی سلسلے اور پہاڑوں کی عریض موج نما بلندیاں بہت دور دور تک دو دو ہزار میٹر بلکہ بعض مقامات پر تین ہزار میٹر تک اونچی چلی گئی ہیں۔ بحیرۂ وان کے جنوب مشرق میں جلَوْ داغ نامی برف پوش پہاڑ میں تو بعض چوٹیوں کی بلندی ۴٬۱۶۸ میٹر تک پہنچ گئی ہے۔ ان پہاڑوں کی ترکیب میں زیادہ تر چونے کا پتھر پایا جاتا ہے۔ پہاڑوں کے سلسلے اکثر نمایاں طور پر قوسی شکل کے ہیں اور اس طرح ان کے صاف الگ الگ حصّے بن جاتے ہیں۔ خلیج آنطالیہ (اَضالِیَہ Adalia، آطالیہ Attalia) کے مغرب میں مغربی طاوروس [طورُوس] کے چونے کے پتھر کے پُرعظمت پہاڑی سلسلے ہیں جن میں سے بلند ترین کو بعض اوقات لِیکِیائی طاوروس (Lycian Taurus) کا نام دیا جاتا ہے۔ ان پہاڑوں کا رخ جنوب اور جنوب مغرب کی سمت میں سمندر کی طرف اور جزیرۂ روڈس، اقریطش اور جزیرہ نمائے بلقان کے کوہستانِ دِینارِک کے بیرونی حاشیوں کی طرف ہے۔ خلیج آنطالیہ اور آطنہ کے میدان کے درمیان وسطی طاوروس کی عظیم قوس ممتد ہے۔ کِلِیکیائی طاوروس (Cilician Taurus) کا نام، جس کا ذکر اکثر آتا ہے، اسی قوس کے زیادہ معروف مشرقی بازو کا نام ہے۔ طاوروس کا کوہستانی نظام دو متوازی سلسلوں میں خلیج اسکندرونہ کے مشرق تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ ایک بیرونی سلسلہ ہے جو کوہ اَمانُوس [= اَلْما طاغ] سے شروع ہو کر مَلَطِیہ اور اُس کوہستانی سلسلے کی راہ سے، جو مُرادصو کے جنوب میں واقع ہے، جھیل وان کے جنوبی سلسلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ ایک اندرونی سلسلہ ہے جس کے مغربی حصّے کو بعض اوقات 'مقابلِ طاوروس (Anti-Taurus)' کہا جاتا ہے (حالانکہ اس نام کی کوئی معقول وجہِ جواز نہیں)۔ یہ آطنہ [= آذنہ] کے شمال میں دریائے سَیحان کے بالائی علاقے کے پہاڑی پشتوں سے شروع ہو کر بالائی فرات (قرہ صو) اور بالائی اَرَس (Araxes) کے جنوبی سلسلۂ کوہ کی راہ سے اُرمِیہ کے علاقے میں جا نکلتا ہے۔ ان دونوں کوہستانی سلسلوں کے درمیان دریاؤں کے کئی طاس ہیں، یعنی اِلبِستان، مَلَطِیَہ ۔ اِلازِغ (Elazig) ([معمورۃ] العزیز، خَرپُوت)، چَپاقچُور، مُوش اور وان کے طاس۔ پہاڑوں کے اس سارے نظام کا بہترین نام مشرقی طاوروس ہے (سابقہ تصانیف میں مقابلِ طاوروس (Anti-Taurus) کے علاوہ اس سلسلے کے مختلف حصّوں کو مختلف نام دیے گئے ہیں، مثلاً ارمنی طاوروس اور کُرد ی طاوروس، لیکن ان میں سے ہر نام کے صحیح استعمال کی تعیین نہیں کی گئی)۔ دریائی طاسوں کی مذکورۂ بالا قطار کوہستان طاوروس کے بیرونی اور اندرونی سلسلوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔ اگر اس کوہستانی نظام کو بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو مشرقی طاوروس کا کوہستانی نظام (جس میں یہ دونوں سلسلے شامل ہیں) شمال کی جانب ایک

قوس بناتا ہے اور اس کا جنوبی سرا ایران کی جنوبی سرحد کے پہاڑوں میں جاملتا ہے.
مغربی طاوروس اور وسطی طاوروس کے مغربی حصے کے سلسلوں کے درمیان خاصے بڑے دریائی طاس شمالاً جنوباً واقع ہوے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک میں جھیلیں بھی ہیں، یعنی پِسیدیا (Pisidia) اور اِیسَوریا [یا ایساوریا] (Isauria) کے قدیم خطّوں کی مشہور جھیلیں۔ یہی طاس آبادی کے اہم مرکز بھی ہیں۔ بعض مقامات مثلاً اسپارتہ (Isparta) [رکّ بآن] اور بُوردُور (Burdur) [رکّ بآن] کے نواحی علاقوں میں بیش قیمت مخصوص تمدّن بھی موجود ہیں۔ چونے کے پہاڑ پانی کی کمیابی کے باعث کم آباد ہیں۔ پرانے ''خشک جنگل'' کی جگہ اب زیادہ تر ادنٰی قسم کی چراگاہیں بن گئی ہیں جہاں موسم گرما میں بھیڑ بکریاں چرتی ہیں۔ وسطی طاوروس میں، جو حقیقت میں چٹانوں کا واحد بڑا تودہ ہے، انسانی آبادی صرف چند تنگ وادیوں ہی میں پائی جاتی ہے۔ یہاں بھی بلند تر خطّے گرمیوں میں عموماً بھیڑ بکریوں کی چراگاہوں (''یَیلا'') کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ مشرقی طاوروس، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، زیادہ عریض و وسیع ہے، لہٰذا اس میں طاسوں کا رقبہ نسبۃً زیادہ بڑا ہے جس میں انسانی آبادی کی خاصی گنجائش ہے، لیکن ان دنوں ان میں بہت چھدری آبادی ہے۔ جہاں تک بارش — جو کوہستان سے فاصلہ بڑھنے کے ساتھ کم ہوتی جاتی ہے — اجازت دیتی ہے، ایسی زراعت بھی یہاں پائی جاتی ہے جس کا انحصار کلّیۃً مینہ کے پانی پر ہوتا ہے۔ مشرقی طاوروس کے جنوبی دامن کی پہاڑیوں میں جواب تک کم ہی آباد ہیں مزید آبادی ہوسکتی ہے۔ اسی طرح دیار بکر (دیاربکر [رکّ بآن] دیار بکر، آمد) اُوْرفہ [رکّ بہ مادّہ الرُّہا] (Edessa)، گزِیان تپ، عین تاب [رکّ بآن] اور حَلَب [رکّ بآن] (Aleppo) کے قدیم مراکز کے قرب و جوار میں مزید آبادی کے امکانات موجود ہیں لیکن ان سے اور دور تک جنوب میں ایسے امکانات موجود نہیں۔ ان مشرقی دامن کی پہاڑیوں میں سب سے زیادہ سازگار رقبہ حاطای [رکّ بہ HATAY] کا علاقہ ہے جو مغرب میں اَنطاکیہ [رکّ بہ] (Antioch) کے اردگرد واقع ہے اور جہاں بحیرۂ روم کے قرب کی وجہ سے لیموِیی (یعنی مُرکّبات یا لیموں کی قسم کے) پھلوں اور بین الارضین (mediterranean) دوسری فصلوں کی کاشت ممکن ہو جاتی ہے.
بحیثیت مجموعی طاوروس کی ساحلی پٹی میں صرف ایک تنگ خطّہ رُسوبی (یعنی تہ نشین) مٹی کا اور چند پہاڑیاں ایسی ہیں جو آبادکاری کی دعوت دیتی ہیں۔ ان چند پہاڑیوں پر بین الارضین قسم کے پودے اور کہیں کہیں لیموِیی پھلوں یا مرکّبات کی کاشت ہوسکتی ہے، مگر یہاں ملیریا کا خطرہ موجود ہے۔ عام طور پر چونے کے پتھر کے پہاڑ (جن میں پانی کم یاب ہے) سمندر سے تھوڑے ہی فاصلے پر بلند ہو جاتے ہیں۔ حقیقی معنی میں قابلِ کاشت بڑا رقبہ محض آطَنَہ (آدَنہ) [رکّ بآن] کا میدان ہے، جس میں طَرسُوس [رکّ بآن] بھی واقع ہے، یعنی زمانۂ قدیم کا کِلِیکِیا (Cilicia) کا میدان جسے دریاے سَیحان [رکّ بآن] (ساروس Saros) اور جَیحان [رکّ بآن] (پیراموس Pyramos) کی تہ نشین مٹی نے بنایا ہے۔ گزشتہ چند سالوں کے اندر اس علاقے میں کپاس کی کاشت میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ آنطالیہ [رکّ بآن] کا بھربھرے چونے کے پتھر سے بنا ہوا میدان، جس میں سمندر کی طرف تیس تیس میٹر کی سیدھی ڈھلانیں پائی جاتی ہیں، کاشت کے لیے اتنا موزوں نہیں.
آناطولی کے جنوبی ساحل میں، جس حد تک کہ وہ شمالاً جنوباً واقع ہے، بڑے جہازوں کے لنگر انداز ہونے کے لیے محفوظ بندرگاہیں نہیں ہیں۔ اِسکَندَرُون [رکّ بآن] (Alexandretta) اور مَرسِینَہ [رکّ بآن در آ، طبع دوم] آدَنہ کے میدان اور حاطای (Hatay) کی بندرگاہیں ہونے کے لحاظ سے، نیز اس اعتبار سے کہ وہ مشرقی طاوروس کے خام کُرومیم کی برآمد کی بندرگاہیں ہیں، کسی قدر اہمیّت رکھتی ہیں۔ زیادہ مغرب کی طرف مغربی طاوروس کے لیے یہی کام فَتحِیّہ کی چھوٹی سی بندرگاہ سرانجام دیتی ہے.
اِیگی آناطولی (خطّۂ اِیگہ): دونوں سرحدی کوہستانی سلسلوں کی درمیانی زمین میں زیادہ نشیب و فراز نہیں۔ اس علاقے میں کئی ایسے منفرد رقبے ہیں جو ایک دوسرے سے متمیّز ہیں۔ مغرب میں ایگی آناطولی ہے جسے جدید ترکی میں ''خطّۂ اِیگہ'' کہتے ہیں۔ یہ علاقہ شمال میں بحیرۂ مرمرہ کے جنوبی کوہستان اور جنوب میں مغربی طاوروس کے درمیان واقع ہے اور قریب قریب وہی علاقہ ہے جہاں قدیم یونانیوں نے اپنے آئی اَونیائی (Ionian) مستعمرات بسائے تھے۔ اس علاقے میں باقر چایی (قایقُوس Caicus)، گِدیز (ہرمُوس Hermus)، بیوک مِندیرس کلان [بیوک مندیرس] اور مِندیرس خورد [کوچوک مندیرس] (قایِسْتَرہ Maeander, Kayster) کی عریض وادیاں واقع ہیں جو مغرب سے مشرق کی طرف پھیلے ہوے سلسلہ ہاے کوہ کی ایک ہزار میٹر سے لے کر دو ہزار میٹر تک اونچی چوٹیوں کے درمیان، بلّوری (crystalline) چٹانوں کے رقبے میں، جزیرہ نما کے اندر، دو سو کیلومیٹر تک گھستی چلی گئی ہیں۔ ان چٹانوں کو فلپ سَن (Philippson) نے لِیدِیائی - قاریائی (Lydian-Carian) نام دیا ہے.
انھیں وادیوں کی برکت سے آب و ہواے بین الارضین (mediterranean) ملک کے اندر دور تک اثر ڈال سکتی ہے۔ یہ رقبہ بہت گنجان آباد ہے۔ یہاں تمباکو، زیتون، انجیر اور انگور کی کاشت ہوتی ہے۔ انگور زیادہ تر کشمش بنانے کے لیے سکھائے جاتے ہیں۔ حال ہی میں کپاس کی کاشت نے بھی کچھ اہمیّت حاصل کرلی ہے.
اس علاقے کے ساحل میں، جو پہاڑی سلسلوں کے ساتھ زاویۂ قائمہ کی صورت میں ہے، بہت سی بڑی اور چھوٹی خلیجیں اور اچھی قدرتی بندرگاہیں ہیں، لیکن زیادہ بڑے دریا بڑی مقدار میں رسوبی مادّے اپنے ساتھ لاتے رہتے ہیں جو ان خلیجوں کو بتدریج پاٹ دیتے ہیں۔ عہدِ قدیم کی بندرگاہیں اِفِسُوس (Ephesus) [آیاسلوغ] اور مِلِیطُوس (Miletus) اب اندرونِ ملک میں

ساحل سے کئی کیلومیٹر دور ہیں اور اِزمیر (سمرنا) کی دیگر لحاظ سے عمدہ بندرگاہ پٹ جانے سے صرف اس لیے محفوظ رہ گئی کہ گدِیز چای کے بہاؤ کا رخ بدل گیا ہے۔ اِزمیر [رک بآن] ریلوے کے ذریعے مذکورۂ بالا تمام وادیوں کے ساتھ مربوط کر دیا گیا ہے اور اس لیے وہ اس علاقے کا اہمّ اقتصادی مرکز اور ترکیّہ کی زرعی پیداوار کی برآمد کے لیے سب سے بڑی بندرگاہ بن گیا ہے۔ برغمہ [رک بآن] (Pergamum)، مغنیسیہ (Magnesia) [رک بہ مَغنیسہ]، تیرِہ [رک بآن] [آآ] آیدین [رک بآن] (گوزِل حصار) اور دینِزلی [رک بآن] اس خطّے کے مقامی مرکز ہیں۔

مغربی آناطولیہ کا پشتۂ کوہ: جہاں مشرق میں ایگی آناطولی کی وادیاں ختم ہوتی ہیں وہاں مغربی آناطولی کا عظیم پشتہ بلند ہوتا ہے جو ایک طرف سے طاوروس کے کوہستانی نظام کے زاویۂ معکوس (re-entrant angle) اور دوسری جانب بحیرۂ مرمرہ کے جنوبی سرحدی سلسلوں کے درمیان اَفیُون قرہ حصار۔ کوتاہیہ۔ عُشّاق کے اردگرد کے علاقے میں واقع ہے۔ یہ پشتہ بہت بڑی بڑی سطوح مرتفعہ سے بنا ہے جن کی بلندی بعض مقامات پر بارہ سو میٹر سے پندرہ سو میٹر تک پہنچ جاتی ہے۔ ان سطوح مرتفعہ سے بڑے بڑے پہاڑوں کے سلسلے بلند ہوتے ہیں جن کی اونچائی اکثر دو ہزار میٹر سے بڑھ گئی ہے۔ ہاں، شمال مشرق کی سمت اور دریاے سَقاریَہ (Sangarius) کے بالائی علاقے میں یہ بلندی بتدریج کم ہو کر گیارہ سو میٹر رہ جاتی ہے۔ یہ بڑا مرتفع علاقہ مغربی آناطولی کا پشتہ ہے۔ یہاں کی سطوح مرتفعہ زیادہ تر تیسرے دورۂ طبقات ارضی کی مٹّی اور ریت کے سپاٹ طبقوں پر مشتمل ہیں جو ایک وقت میں اونچی ہوگئی تھیں لیکن بعد میں اُن وادیوں نے انھیں کاٹ کر اپنی راہ بنائی جنھیں آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ یہ سب بے درخت میدان ہیں۔ صرف زیادہ بلند پہاڑ اتنے اونچے ہیں کہ وہاں قدرتی طور پر درخت اُگ سکتے ہیں لیکن بیشتر جنگل کاٹ دیے گئے ہیں۔

یہاں کی قلیل آبادی کی گزران اناج کی کاشت اور بھیڑ بکریاں پالنے پر ہے۔ متعدّد ریل کی لائنیں اور سڑکیں ایک طرف تو اندرونِ ملک کی سطح مرتفع تک جاتی ہیں اور دوسری طرف افیون قرہ حصار [رک بآن] کے قریب شاخوں میں تقسیم ہو کر، مغربی طاوروس کے طاسوں تک، ایگیہ (Ege) کے نشیبی خطّوں تک اور بحیرۂ مرمرہ تک پہنچتی ہیں۔

وسطی آناطولی: وسطی آناطولی کی اندرونی سطح مرتفع سپاٹ زمین کے بڑے بڑے قطعات پر مشتمل ہے جن کی اونچائی آٹھ سو میٹر سے بارہ سو میٹر تک ہے۔ یہ قونیہ (Iconium) کے خشکی سے محصور طاسوں میں رسوبی مواد کی تہ نشینی سے بنی ہیں، مثلاً طوز گورلو (''نمکین جھیل'') کے طاس میں جو ایک بہت بڑا سپاٹ اور کڑھائی نما قطعۂ زمین اور ۹۰۰ میٹر بلند ہے، جسے اکثر غلطی سے ہمارے نقشوں میں طُوز چورلو (''نمکین صحرا'') کے نام سے دکھایا جاتا ہے۔ ایسے طاس دریاے سَقاریَہ کے بالائی علاقوں اور قِزِیل اِیرماق کے کنارے بھی بعض مقامات پر پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں تیسرے ارضیاتی دور کے نئے افقی تہ نشین موّاد سے بنی ہوئی دیگر عریض سطوح مرتفعہ بھی ہیں اور ایسے ہموار میدان بھی جن کے نیچے چپین دار مٹّی کی تہ ہے۔

لیکن وسطی آناطولی میں خاصے بلند پہاڑ بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ اردگرد کی سطح مرتفع سے پانچ سو میٹر سے لے کر پندرہ سو میٹر تک بلند ہیں۔ یہاں زمانۂ حال کے چند بہت بڑے آتش فشاں پہاڑ بھی ہیں جو ان دنوں روشن نہیں ہیں، مثلاً اِرجیاس طاغ [رک بآن] (۳,۹۱۶ میٹر)، جسے زمانۂ قدیم میں آرگائے اس (Argaeus) کہتے تھے اور جو قیصری [قیصریہ] کے قریب واقع ہے اور حسن طاغ (۳,۲۵۸ میٹر)، جو نِیگدہ (Nigde) کے قریب ہے.

انسانی بقا کے لیے پہاڑوں کا وجود نہایت اہمّ ہے۔ خشک وسطی آناطولی میں، جو چاروں طرف سے بلند پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے، پست ترین علاقے سب سے زیادہ خشک ہیں، مگر اونچے پہاڑ بارش کو کھینچ لیتے ہیں، لہٰذا آبادی کے لیے موزوں ترین علاقے ایک طرف تو وہ ہیں جو بلند ترین سطوح پر واقع ہیں، جیسے قِزِیل اِیرماق کے موڑ کے اندر کا وہ رقبہ جو قدیم زمانے کی ریاست قاپادوقیہ [قُبّاذق] (Cappadocia) میں ہے اور دوسری جانب وہ قطعات، جو اردگرد کے اُن پہاڑوں کے دامن میں واقع ہیں، جہاں سے تیز رو پہاڑی ندی نالے نکلتے ہیں۔ اہمّ شہروں میں سے بیشتر اس دوسری قسم کے علاقے میں ہیں، مثلاً اَنقرہ [رک بآن] (Ancyra، Angora)، اِسکی شہر [رک بآن]، قونیہ (Iconium)، نِیگدہ [رک بآن]، قیصری [رک بآن]، قیصریہ (Caesarea) اور سیواس (Sebastia)۔ ان سب میں ایسی زمینیں ہیں (یا تھیں) جن میں آسانی سے آب پاشی کی جا سکتی ہے۔ بے درخت میدانوں میں آبادی بہت کم ہے۔ یہاں حصولِ معاش کا ذریعہ گیہوں اور جَو کی کاشت اور بھیڑیں اور اَنقروی بکریاں [مَرغوز] پالنا ہے، اگرچہ عصرِ حاضر کے مکانیکی ذرائع کی مدد سے زیرِ کاشت رقبوں میں اضافہ اور اصلاح ہوگئی ہے۔ سب سے کم آبادی طُوز گورلُو اور قونیہ (زمانۂ قدیم کا Lycaonia) کے خاص طور پر خشک طاس میں ہے جو زیادہ تر ''آرطِمِزائی بے درخت میدان'' (Artemisian steppe) پر مشتمل ہے.

سرحدی کوہستانی علاقوں کی بہ نسبت وسطی سطح مرتفع میں آمد و رفت زیادہ آسان ہے۔ اسی وجہ سے اس سطح مرتفع کو، جو ہمیشہ آناطولی کا مرکز رہی ہے، اس وقت سے اَور زیادہ اہمیّت حاصل ہوگئی ہے جب سے اَنقرہ دارالحکومت بنا اور آناطولی میں ریلوں اور سڑکوں کا جال زیادہ وسیع ہوگیا.

بالائی فرات کا علاقہ اور کوہستانِ ارارات: جغرافیائی اعتبار سے آناطولی کی مشرقی حد بالائی فرات کے علاقے میں ہے جہاں آناطولی کی شمالی سرحد کے پہاڑی سلسلے اور مشرقی طاوروس کے سلسلے ـــ دونوں کے بیچ میں نئے پہاڑوں کے نمودار ہونے سے ـــ باہم مل گئے ہیں۔ بلند پہاڑوں کے اس زبردست سلسلے کے خطّے میں، جن کی چوٹیاں ۲,۵۰۰ میٹر (کئی جگہ ۳,۰۰۰ میٹر) تک بلند ہیں، جو

بھی تھوڑی بہت آبادی ہے وہ فقط وادیوں میں پائی جاتی ہے، بالخصوص اُن میں جو شمالاً جنوباً واقع ہیں۔ انھیں وادیوں کے ساتھ ساتھ آناطولی سے آذربیجان اور ایران کی طرف سڑکیں جاتی ہیں۔ اِرزِنجان [رکّ بآن] اور اِرضِ روم (Erzerum) [رکّ بآن] دونوں شہر ہمیشہ سے ان سڑکوں کی حفاظت کا کام انجام دیتے رہے ہیں.

ایک طرف مشرقی طاوروس اور دوسری جانب شمالی آناطولی کے سرحدی پہاڑ اِرضِ روم کے طول بلد کے مشرق میں ایک دفعہ پھر الگ الگ ہو جاتے ہیں اور اس طرح ان کے درمیان وہ سطح مرتفع بن جاتی ہے جس کی بلندی ۱۵۰۰ میٹر سے لے کر ۱۷۰۰ میٹر تک ہے اور یہ طاس وسطی آناطولی کے طاس سے بھی زیادہ اونچا ہے۔ یہاں کی چین دار تہ زمینی پر خاصی مقدار میں آتش فشانی مواد جمع ہے۔ زمانۂ حال کے بڑے بڑے آتش فشاں پہاڑ (جواب خاموش ہیں)، مثلاً کوہ اَراراط (آغْرِی طاغ [رکّ بآن] ۱۷۲،۵ میٹر)، آلا گورز طاغ (۴،۰۹۴ میٹر)، سُبحان طاغ (۴،۴۳۴ میٹر)، اس سطح مرتفع کے اوپر سر اُٹھائے کھڑے ہیں اور بعض مقامات پر، مثلاً جھیل وان کے قریب، ان پہاڑوں نے دریائی طاسوں کے پانی کا بہاؤ روک دیا ہے.

یہ درشت کوہستان، جہاں موسم سرما میں درجۂ حرارت بہت نیچا رہتا ہے، زیادہ تر چراگاہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے کیونکہ زراعت اور آبادی کے لیے زیادہ موافق حالات صرف نسبۃً چھوٹے طاسوں ہی میں پائے جاتے ہیں۔ یہ سرزمین عام طور پر اَرمنیہ کے نام سے معروف ہے مگر بعض تاریخی واقعات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک پشت سے وہاں کوئی بھی ارمنی آباد نہیں۔ اس سرزمین کی قلیل آبادی ترکی یا کُردی زبان بولتی ہے، لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ترکیّہ کے اس مشرقی سرحدی علاقے کو، جو درحقیقت جغرافیائی آناطولی سے باہر ہے، کوہستان اَراراط کا نام دیا جائے۔ یہ نام غیر معیّن ضرور ہے مگر جغرافیائی اعتبار سے امتیازی نوعیّت رکھتا ہے.

مآخذ: قریب تر زمانے کے عمومی جغرافیائی جائزے: (۱) E. Banse: *Die Türkei, eine moderne Geographie*، طبع ثانی، بُراؤنشوائگ (Braunschweig) ۱۹۱۶ء، اس میں اس موضوع پر پہلے کی تصنیفات کی ایک طویل فہرست بھی دی ہے؛ (۲) بلانْشار (R. Blanchard): *Asie occidentale*، پیرس ۱۹۲۹ء؛ (۳) U. Frey: *Türkei und Zypern (Handbuch der geograph. Wissenschaft*، جلد Vorder- und Südasien، پوٹسڈم ۱۹۳۷ء؛ (۴) لوئیس (H. Louis): *Anatolien*، در *Geograph. Zeitschr.*، ۱۹۳۹ء، ص ۳۵۳ - ۳۷۶؛ (۵) Hamit Sadi Selen: اقتصادی تورکیه، استانبول ۱۹۳۹ - ۱۹۴۰ء؛ (۶) Faik Sabri Duran: تورکیه جغرافیه سی، استانبول ۱۹۴۰ء؛ (۷) R. Steinmetz: *Anatolie*، در *Tijdschr. Ned-erl. Aardr. Genootsch.*، ۱۹۴۱ء؛ (۸) H. Louis: تورکیه جغرافیه سنگ انا خطلری، ا، تورک جغرافیه کونگریسی راپورلر، مذاکره‌لر، قرارلر، انقرہ ۱۹۴۱ء، ص ۱۷۱ - ۲۲۸؛ (۹) بَسیم دارکوت (Besim Darkot): تورکیه جغرافیه سی، استانبول ۱۹۴۲ء؛ (۱۰) H. Wenzel: *Die Türkei, ein landeskundlicher Überblick*، در *Zeitschr. f. Erdkunde*، ۱۹۴۲ء، ص ۴۰۸ - ۴۲۳؛ اعداد و شمار: (۱۱) کوچوک استاتستیک ییللغی، (*Statistical abstract.*) اِستاتِستِک گِنِل مُدوُرلغو، طبع آخر ۱۹۵۱ء، استانبول ۱۹۵۲ء؛ خاص طور پر اہم نقشہ جات: (۱۲) R. Kiepert: *Karte von Kleinasien*، ۲۴ ورق، پیمانہ ۱: ۴،۰۰،۰۰۰، برلن ۱۹۰۲ - ۱۹۰۶ء؛ (۱۳) A. Philippson: *Topographische Karte des Westlichen Kleinasien*، ۶ ورق، پیمانہ ۱: ۳،۰۰،۰۰۰، گوتھا ۱۹۱۰ - ۱۹۱۳ء؛ (۱۴) Faik Sabri Duran: بویوک اطلس، طبع اوّل، استانبول ۱۹۳۷ء؛ نسبۃً قریب تر زمانے کی طباعتوں میں ترکیّہ کا ایک اچھا نقشہ بھی درج ہے، پیمانہ ۱: ۴۵ لاکھ و ۱: ۲۰ لاکھ؛ (۱۵) تورکیه: پیمانہ ۱: ۸ لاکھ، خارطہ گِنِل دائرکتورلُغو (Harta Genel Direktörlüğü)، انقرہ از ۱۹۳۳ء، ۸ ورق استانبول - انقرہ - سیواس - اِرضِ روم - اِزمیر - قونیہ - مَلَطِیّہ - موصل؛ (۱۶) تورکیه جیالوجیک خارطه سی، پیمانہ ۱: ۸ لاکھ، معدن تدقیق و ارامہ اِنْستی توسُو (Maden Tetkik ve Arama Enstitüsü)، انقرہ ۱۹۴۲ء، ۸ ورق، مذکورۂ بالا نقشے کی آسان و مختصر کردہ موضع نگاری کی بنا پر، (ہر ورق کے بارے میں "تشریحی حواشی" فرانسیسی زبان میں شائع ہوئے ہیں)؛ (۱۷) تورکیه تکتونیک خارطه سی، پیمانہ ۱: ۸ لاکھ، معدن تدقیق و ارامہ اِنْستی توسُو، طبع (E. Lahn و Necdet Egeran) انقرہ ۱۹۴۵ء.

(لُوئیس H. LOUIS)

(۳) تُرکی آناطولی کا تاریخی جغرافیہ

(الف) ترکوں کی فتح آناطولی، پہلا دَور اور سلاجقۂ روم کی سلطنت:

آناطولی کا بیشتر حصّہ مسلمان عربوں کی فتوحات سے بچا رہا اور بوزنطی سلطنت کی حدود حسب ذیل رہیں: شمال مشرق میں اَرْمنیہ اور گُرجستان کی عیسائی ریاستیں؛ اُن کے جنوب میں خلافتِ اسلامیہ کی دُور ترین اور سب سے اگلی سرحدی چوکی، پہلے قالیقَلا (پہلے کا Theodosiopolis اور بعد کا اَرْزَن الرّوم، اِرضِ روم) تھی، پھر بعض وقتوں میں کَماخ بھی بنتی رہی؛ اس جگہ سے بحیرۂ روم تک طاوروس یا "دَرّوں کی سرزمین" ("بلاد الدُرُوب") سے سرحد بنتی تھی۔ اگرچہ عرب بوزنطی علاقوں پر اکثر یلغاریں کرتے رہے لیکن انھوں نے اس سرزمین پر کبھی اپنا قبضہ نہیں جمایا۔ یہ سرحدی علاقے، جو شمالی شام اور بالائی عراق کے سب سے بیرونی حصّوں پر مشتمل تھے، "حفاظتی قلعوں کی فوجی چھاؤنیاں" ('جُنْدُ العَواصِم' یا صرف 'العَواصِم' [رکّ بآن]) کہلاتے تھے۔ اس علاقے کا صدر مقام مَنْبِج یا اَنطاکیہ (Antioch) تھا اور شامی سرحدوں ("ثُغُور الشام") کے قلعے، جن میں اسلحہ موجود رہتا تھا اور جن کا مرکز طَرَسُوس تھا اور عراقی سرحدیں ("ثُغُور الجزیرۃ")، جن کا مرکز مَلَطِیّہ (Melitene) تھا، خلافت کی بیرونی

حدّ کی تشکیل کرتے تھے۔ عربوں اور بوزنطیوں کی باہمی جنگوں میں کبھی ایک فریق کے اور کبھی دوسرے فریق کے فتح حاصل کرنے کی وجہ سے ان سرحدی علاقوں کو بہت نقصان پہنچتا رہا؛ تاہم وہ عموماً عربوں ہی کے تسلّط میں رہے۔ مشہور بوزنطی قیصر نِیکفور ثانی فوقاس (Nicephorus II Phocas) (۹۶۳ - ۹۶۹ء)، جون چِمِسکِز (John Tzimiskes) (۹۶۹-۹۷۶ء) اور بازِل ثانی (Basil II) (۹۷۶-۱۰۲۵ء) کی فتوحات کے بعد ہی یہ علاقے پھر بوزنطیوں کے تسلّط میں آئے۔ ان تین میں سے آخری قیصر کی وفات کے وقت ترکیّہ کا سارا علاقہ، جیسا کہ اب ہے، ماسوا آمِد (دیار بکر) اور اس کے مضافات کے بوزنطی مملکت میں شامل تھا (قبّ E. Honigmann: *Die Ostgrenze des Byzantinischen Reiches von 363 bis 1017*، برسلز ۱۹۳۵ء)۔ اس کے بعد بوزنطیہ میں فوجی اور غیر فوجی امرا کے درمیان رقابتیں شروع ہوگئیں جن کی وجہ سے، بالخصوص غیر فوجی امرا کے زمانۂ اقتدار میں، سرحدوں کے متصل ضعف نمودار ہونے لگا.

خاندانِ سلجوق کے ترکی الاصل فاتحین بوزنطی سرحدوں پر ایسے ہی ایک کمزوری کے زمانے میں پہنچے اور انھوں نے سارے مشرق وسطٰی کو فتح کر لینے کے بعد اپنے ترک سپاہیوں کو بغرضِ جہاد بوزنطی سرحد پر بھیج دیا۔ وہ فی الواقع بوزنطی آناطولی میں جگہ جگہ داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے (۴۵۶ھ/ ۱۰۶۴ء میں بوزنطی - ارمنی سرحدی علاقے میں آنی کی فتح، کِلِیکیا (Cilicia) کی ویرانی اور قیصریّہ (Caesarea) کی تسخیر)۔ قیصر قسطنطین دہم دُوقاس (Ducas) کی وفات (مئی ۱۰۶۷ء) کے بعد، جو غیر فوجی امرا کا حامی کار تھا، فوجی امرا میں سے ایک شخص رومانُوس چہارم دِیوجِن [دیوجانس] (Romanus VIDiogenes) کو عین میدانِ جنگ میں تختِ شاہنشاہی پر بٹھا دیا گیا (یکم جنوری ۱۰۶۸ء) کیونکہ حالات بہت نازک ہو چکے تھے۔ ابتدا میں وہ ترکوں کے خلاف کامیابی کے ساتھ لڑا، حتّٰی کہ سلجوقی سلطان آلْپ آرْسلان کو بذاتِ خود اس کے مقابلے میں آنا پڑا۔ آلپ آرسلان نے بوزنطی فوج کو، جو تعداد میں اس کی فوج سے بہت زیادہ تھی، بحیرۂ وان کے مضافات میں مَلاذ گِرْدْ (Mantzikert) کے قریب شکست فاش دے کر بھگا دیا (۴۶۳ھ/ ۱۹ اگست ۱۰۷۱ء)۔ اس شکست کی وجہ یہ تھی کہ بوزنطی فوج کے مستأجر سپاہیوں میں نظم وضبط کا فقدان تھا اور قیصر کے مخالفوں نے غدّاری کی تھی۔ قیصر گرفتار ہو گیا لیکن آلپ آرسلان نے اس کے ساتھ نرم شرائط پر معاہدۂ صلح طے کرنے کے بعد اسے رہا کر دیا؛ تاہم اس شکست کی وجہ سے قسطنطینیہ میں ایک انقلاب رونما ہو گیا جس کی وجہ سے حزبِ مخالف برسرِ اقتدار آ گئی۔ رومانوس چہارم کو تخت و تاج سے ہاتھ دھونا پڑے اور اسے اندھا کر دیا گیا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد وہ مر گیا (موسم گرما ۱۰۷۲ء).

قیصر رُومانُوس کی معزولی کے ساتھ وہ معاہدات، جو اس نے سلطان آلْپ آرْسلان سے کیے تھے، کالعدم ہو گئے اور ترکوں نے پھر بوزنطیہ کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ اس جہاد میں سلاجقہ کی باقاعدہ افواج شریک نہیں تھیں بلکہ مختلف سردار انفرادی طور پر جنگ کرتے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ کامیابی ملک دانِشمند [رک بآن] احمد غازی نے حاصل کی جو شمال مشرقی آناطولی میں سرگرمِ عمل تھا۔ ترک مجاہدین کے دستے ملک میں گشت لگاتے پھرتے تھے اور شہروں کے درمیان مواصلات کو منقطع کر کے بوزنطی حکومت کے نظم ونسق کو معطّل کر رہے تھے۔ آخر کار آلْپ آرْسلان کے جانشین سلطان مَلِک شاہ (جلوس ۴۶۵ھ/ ۱۰۷۲ء) نے سلجوقی خاندان کے ایک رکن سُلیمان بن [قُتُلْمُش] کو بھیجا کہ وہ اس جنگ میں، جو اس وقت بوزنطیہ کے خلاف لڑی جا رہی تھی، آناطولی میں ترکی سوار فوج کی قیادت کرے۔ اس وقت بوزنطیہ میں وراثتِ تخت کے بارے میں جو گڑ بڑ ہو رہی تھی، اس نے سُلیمان کے کام کو اور آسان بنا دیا۔ پہلے قیصر میخائیل ہفتم دُوقاس (Michael VII Ducas) نے اور اُس کی دست برداری کے بعد قیصر نیکفور ثالث بُوتونیات (Nicephorus III Botanites) نے اپنی اپنی مقصد برآری کے لیے سُلیمان سے مدد حاصل کی۔ اس کے عوض میں انھیں ملک کے ان حصّوں پر، جہاں ترک قابض ہو چکے تھے، ان کے حقوق کو تسلیم کرنا پڑا؛ اس کے علاوہ کیزِیقُوس (Cyzicus) اور نِیکِیا [یا نِیقِیَہ] (Nicaea) کے شہر، جو اُسی زمانے میں فتح کیے گئے تھے، ان کے حوالے کر دیے گئے (۱۰۸۱ء)۔ سلیمان نے نِیقِیَہ (ترکی میں اِزنیق) کو اپنا صدر مقام بنا لیا۔ قیصر آلکسِیُس اوّل قومنیُوس (Alexius I Comnenus) نے بھی، جو ۱۰۸۱ء میں تخت نشین ہوا، اس کی تصدیق کر دی کہ سُلیمان کو مقبوضہ علاقوں میں اپنی فوجیں رکھنے کا حق حاصل ہے، اگرچہ ان علاقوں میں برائے نام بوزنطی سیادت بھی باقی رہی۔ امرِ واقع یہ ہے کہ سُلیمان اپنی فوجوں کی وساطت سے، جو ملک بھر میں گشت لگاتی رہتی تھیں، سارے آناطولی کا حکمران بن گیا تھا۔ بوزنطی حکومت حقیقت میں معطّل ہو چکی تھی.

آناطولی میں کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد سُلیمان مشرق کی طرف متوجّہ ہوا تاکہ اس طرف بھی اپنی حکمرانی کا دائرہ وسیع کرے۔ وہ آنطاکیہ (Antioch) کو فتح کرنے میں واقعۃً کامیاب ہو گیا، جو اس وقت تک بوزنطی شہر تھا، لیکن حلَب کی طرف پیش قدمی کرتے وقت اسے سلجوقی امرا، خصوصاً ملک شاہ کے بھائی تُتُش، کی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے شکست کھائی اور میدانِ جنگ میں مارا گیا (۱۰۸۶ء).

اس اثنا میں ترکوں کے اُن جتھوں نے، جو آذربیجان میں جہاد کر رہے تھے، اَرمنیہ کی مسیحی بَگْراتی (Bagratid) مملکت سر کر لی (۴۷۳ھ/ ۱۰۸۰ء)۔ اس کے بعد بَگْراتی امیر رُوبِن (Ruben) اور اس کے وفادار ساتھیوں نے کِلِیکیا میں نئی ریاست قائم کر لی جسے ''ارمنستانِ کوچک'' کا نام دیا گیا۔ یہ ریاست اس کے جانشینوں کے تحت چودھویں صدی عیسوی (۱۳۷۵ء) تک قائم رہی (دیکھیے مادّۂ سِیس).

سُلیمان کی وفات کے بعد آناطولی کو کچھ عرصے کے لیے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ دیگر ترک سردار اپنی فوجی جمعیّتوں کے ساتھ اس ملک میں آ بسے اور انھوں نے اپنی اپنی ریاستیں قائم کر لیں، مثلاً: مَلِک دانشمند احمد غازی نے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، شمال مشرق میں اپنی ریاست بنالی جس کا صدر مقام سِیواس (Sebastia) تھا؛ امیر مِنگوجِک (Mengüdjek) [رک بآن] غازی جو دِوْرِگی (Tephrike) اور اِرزنجان پر قابض ہو گیا؛ مغرب کی سمت ازمیر (سمرنا) میں ایک اور امیر نے، جسے بوزنطی Tzachas کہتے تھے، اپنے قدم جما لیے۔ سلطان ملک شاہ کی وفات کے بعد ہی اس کے جانشین بَرکیارُق نے سلیمان کے بیٹے قِلیج آرْسُلان کو آناطولی واپس آنے کی اجازت دی، لیکن اسے ملوکِ ترک کے درمیان اپنے قدم جمانے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ Tzachas کو، جو سمندر کی راہ سے قسطنطینیہ کی طرف بڑھ رہا تھا، بوزنطیوں کی مدد سے پسپا کر دیا گیا۔

پہلی صلیبی جنگ کے شروع میں بوزنطی اور صلیبی اتّحادیوں نے اِزْنِیق (نِیکِیہ Nicaea) کے قریب ان ترکوں پر فتح حاصل کی جو قِلیج آرسلان اور ملک دانشمند (یا اس کے بیٹے غازی گُومُوش تِگِین) کی زیر قیادت لڑ رہے تھے۔ ترکوں کا صدر مقام اِزْنِیق محاصرے کے بعد ۲۰ جون ۱۰۹۷ء کو سر کر لیا گیا۔ یکم جولائی ۱۰۹۷ء کو صلیبیوں نے موجودہ اِسْکی شہر کے قریب دَرَوْلِیَہ (دُورائیلیُوم: Dorylaeum) کے پاس دوسری فتح حاصل کی جس نے مغربی آناطولی کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور صلیبیوں کے لیے ترکوں کے باقی ماندہ علاقے میں گھسنے کی راہ کھول دی۔ وہ اَنطاکیہ تک جا پہنچے جسے انھوں نے طویل محاصرے کے بعد فتح کر لیا (۳ جون ۱۰۹۸ء)۔ یہاں امارتِ انطاکیہ، جو صلیبیوں کی پہلی ریاست تھی، بوزنطہ کے زیر سیادت قائم کی گئی۔ اسی سال الجزیرہ میں رُہا (Edessa موجودہ اُورْفَہ) کی کونٹی (سرکار) قائم ہوئی۔ صلیبیوں کی ان کامیابیوں کے بعد شہنشاہ آلِکْسِیَس (Alexius) کو مغربی آناطولی سے ترکوں کو نکالنے اور اس علاقے کو دوبارہ بوزنطی سلطنت میں شامل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اُس نے سرحد کے خط کو بھی، جو آناطولی کے عین بیچ میں سے گزرتا تھا، اس علاقے کے مقابلے میں، جو ابھی تک ترکوں کے قبضے میں تھا، مستحکم کیا۔ اس طرح وقتی طور پر ترکی فتوحات کا سلسلہ رُک گیا۔

اس مانع کے بعد ترکی فتوحات کا دائرہ ایک سو سال سے زائد عرصے تک وسطی آناطولی ہی میں محدود رہا۔ آناطولی کا پورا مغربی حصّہ (تقریباً دَرَوْلِیَہ سے شروع ہو کر) اور بحیرۂ اسود اور بحیرۂ روم کے ساحلی علاقے بوزنطہ ہی کے قبضے میں رہے۔ کِلِیکِیا میں ارمنستانِ کوچک کی مملکت بن گئی اور انطاکیہ اور اُورْفَہ کے علاقوں میں مذکورۂ بالا صلیبی ریاستیں بن گئیں۔ آمد (دیارِ بکر) خاندانِ اُرْتُقِیَہ [رک بآن] کے اتابکوں کا دارالحکومت تھا۔ اور آگے چل کر (۱۱۴۴ء) شہر رُہا (Edessa) کو موصل کے اتابک زنگی نے فتح کر لیا۔ اس کے اور بعد (۱۲۶۸ء میں) اَنطاکیہ کو مصر کے مملوک سلطان بایْبَرْس نے لے لیا۔ وسطی آناطولی میں، جس پر ترک قابض تھے، قِلیج آرْسُلان مجبور ہوا کہ ملک دانشمند (یا اس کے بیٹے) اور مِنگوجِک کو حصّہ دار بنائے۔ قِلیج آرْسُلان وسطی آناطولی کے بے درخت میدان پر قابض رہا جس کا پایۂ تخت قونیہ (زمانۂ قدیم کا Iconium) تھا اور ملک دانشمند وغیرہ نے شمال مشرق کے کوہستانی علاقے، سِیواس اور اِرْزنجان پر قبضہ کر رکھا تھا۔ بعض جگہوں، خصوصاً مَلَطِیَہ (Melitene)، کے بارے میں بہت سخت جھگڑا رہا لیکن قِلیج آرْسُلان نے بالآخر اس کا فیصلہ اپنے ہی حق میں کرا لیا (۱۱۰۴ یا ۱۱۰۶ء)، تاہم وہ مشرق کی طرف الجزیرہ (موصل) میں اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرنے میں ناکام رہا۔ سلجوقی امرا نے متّحد ہو کر اُسے دریاے خابُور کے کنارے شکست دی اور وہ اپنی پسپائی کے دوران میں فوت ہو گیا (۹ شوال ۵۰۰ھ/۳ جون ۱۱۰۷ء)۔ اس دَور کے واقعات کے لیے نیز دیکھیے Cl. Cahen: *La Première pénétration turque en Asie Mineure*, *Byzantion*، ۱۹۴۶ء، ص ۵-۶۷.

اس طرح دولتِ سلاجقۂ روم [دیکھیے سلجوق] یا سلطنتِ قونیہ، جیسا کہ صلیبی اسے کہا کرتے تھے، آناطولی کے سب سے کم حیثیت حصّے میں ایک محدود سے علاقے ہی پر مشتمل تھی۔ مسعود اوّل کے عہد میں روم کے سلجوقی اس علاقے پر قابض رہے اور انھوں نے دوسری صلیبی مہم کے صلیبیوں کو دَرَوْلِیَہ (دُورائیلیُوم: Dorylaeum) کے قریب دوسری لڑائی میں شکست دے کر (۲۶ اکتوبر ۱۱۴۷ء) مجبور کر دیا کہ وہ [فلسطین کی طرف] جاتے ہوئے ترکی علاقے کے بجائے بوزنطی سرزمین میں سے گزریں۔ قِلیج آرْسُلان ثانی آلِ دانشمند کی ریاست کا الحاق اپنی ریاست کے ساتھ کرنے میں کامیاب ہو گیا (۱۱۷۴ء) تو روم کے سلجوقیوں کی سلطنت خاصی وسیع ہو گئی اور جب قیصر مینوئل اوّل کومنِنُس نے اس ریاست پر اپنے دعاوی پیش کیے تو قِلیج آرْسُلان نے فِرِیجیا کے پہاڑی درّوں میں مِرْیُوسفالون (Myriocephalon) (درۂ چاڑدَق) کے قریب جنگ جیت کر، جس میں اس نے بوزنطی فوج کو گھیر کر برباد کر دیا (۱۷ ستمبر ۱۱۷۶ء)، اپنے قبضے کو مستحکم کر لیا۔ جب سلطان قِلیج آرسلان دوم نے اپنے مقبوضات اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیے تو ان میں جھگڑے پیدا ہوئے اور یہ معمّر سلطان بھی ان جھگڑوں میں الجھ گیا۔ ان جھگڑوں سے فائدہ اُٹھا کر جرمن شہنشاہ فریڈرک بارْبَرُوسَہ ترکی آناطولی میں سے گزرنے، بلکہ اس کے دارالحکومت قونیہ پر قبضہ جمانے (۱۸ مئی ۱۱۹۰ء) میں بھی کامیاب ہو گیا؛ لیکن ان اقدامات کے نتائج دیرپا ثابت نہ ہوئے، خصوصاً اس لیے کہ خود شہنشاہ تھوڑے ہی عرصے بعد دریاے سَلِف (Saleph) (عہدِ قدیم کے Calycadnus اور آج کے گوک صُو) میں ڈوب کر مر گیا (۱۰ جون ۱۱۹۰ء).

نام نہاد چوتھی صلیبی جنگ کے صلیبیوں نے قسطنطینیہ فتح کر لیا (۱۲۰۴ء) اور وینس کے رئیس جمہوریہ دَوْژ اِنرِیقُو دانْدُولُو (Doge Enrico Dandolo)

کی شہ سے وہاں ایک لاطینی سلطنت قائم کر دی۔ بوزنطیوں نے اس کے مقابلے میں تھیوڈور لاسقاریس (Theodore Lascaris) کی سرکردگی میں مغربی آناطولی میں ایک مقابل کی یونانی سلطنت قائم کر لی جس کا دارالحکومت اِزْنیق (نیکیا یا نِیقیہ Nicaea) مقرر کیا گیا۔ کومنینی (Comneni) کے شاہی خاندان کے دو بھائیوں ڈیوڈ (David) اور الکسیس (Alexius) نے گرجستان کی ملکہ تھمر (Thamar) کی مدد سے طرَبْزون میں ''کومنینی عظیم'' کے نام سے ایک سلطنت قائم کی۔ روم کے سلجوقی سلطان غیاث الدین کیخسرو اوّل نے، جو قلیج ارسلان ثانی کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا، آطالیہ (Attalia) (آدالیہ، انطالیہ) کو فتح کر لیا اور اس طرح بحیرۂ روم تک اپنی مملکت کا راستہ کھولنے میں کامیاب ہو گیا (۱۲۰۷ء)، لیکن وہ مغربی آناطولی میں زیادہ آگے بڑھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ تھیوڈور لاسقاریس نے ۱۲۱۰ء میں ہوناس (Honas) کے نواح میں اُسے شکست دی اور وہ میدانِ جنگ میں (شاید اپنے مدِّ مقابل سے تنہا لڑتا ہوا) مارا گیا۔ تھیوڈر لاسقاریس اور اُس کے جانشینوں نے سلطنتِ نیکیا (ازنیق) کی مدافعت کے لیے مشرقی سرحد پر قلعوں کا ایک مستحکم نظام تعمیر کرایا جس کی وجہ سے ترکوں کے لیے اُس وقت اس علاقے میں پیش قدمی کرنا ناممکن ہو گیا۔ ۱۲۱۴ء میں کیخسرو کے بیٹے اور جانشین عزّالدّین کیکاؤس اوّل نے طرَبْزون کے شہنشاہ کو مجبور کر دیا کہ سینوپ (سینوب) (Sinope) کی بندرگاہ اس کے حوالے کر دے؛ اس طرح روم کی سلجوقی سلطنت کی رسائی بحیرۂ اسود تک بھی ہو گئی۔ اس توسیع کا نتیجہ یہ ہوا کہ باہر کی دنیا سے آمد و رفت کا سلسلہ قائم ہو گیا؛ چنانچہ اٹلی کی تجارتی جمہوری ریاستوں کے ساتھ تعلّقات قائم کیے گئے؛ تجارت نے بہت فروغ پایا اور ملک میں خوشحالی کا وہ دور دورہ ہوا جو کبھی خواب میں بھی نہ آیا تھا۔ کیکاؤس کے بھائی اور جانشین کیقُباد نے، جو روم کے سلجوقی سلاطین میں سب سے بڑا حکمران گزرا ہے، بحیرۂ روم کے ساحل پر اپنی سلطنت کو مزید وسعت دی اور گلونوروس (Galonoros) (χαλὸνορος) کا قلعہ سر کر کے اسے وسیع کیا اور اچھا خاصا بندرگاہ والا شہر بنا لیا۔ اس کا نام اس نے علائیہ (موجودہ علایا یا علانیا) رکھا اور یہاں اس کا سرمائی مستقر تھا۔ مشرق کی طرف بھی بالائی عراق میں اس نے آمِد اور حِصْن کَیفا کے ارتقی حکمرانوں سے کچھ علاقہ چھین لیا اور انھیں اپنی سیادت تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔ ۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء میں اس نے منگو جِک والوں کی امارتِ اِرزِنجان کا الحاق کر لیا اور مشرق میں مزید فتوحات حاصل کیں (۱۲۳۰ء میں اِرضِ رُوم، ۱۲۳۱ء میں اَخلاط، ۱۲۳۴ء میں خَرپُوت)۔ اس سلطان کے عہد میں روم کے سلجوقیوں کی قوّت اور ثقافت اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گئی۔ اس کا بیٹا اور جانشین غیاث الدین کیخسرو ثانی (جلوس ۶۳۴ھ/۱۲۳۷ء) آمِد کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اُس وقت روم کی سلجوقی سلطنت کی مشرقی سرحد تقریباً وہی تھی جو اب ترکیہ کی ہے۔

(ب) آناطولی کی فتح، دوسرا دور اور سلطنتِ عثمانیہ کی ابتدا:

تیرھویں صدی عیسوی کے وسط میں دو باتوں نے حالات کو تبدیل کر دیا۔ ان میں سے پہلی مشرق وسطٰی میں مغلوں کی یلغار تھی جو آناطولی پر بھی اثر انداز ہوئی۔ اگرچہ مغلوں نے اپنے سپہ سالار بیجو نویان کے زیرِ قیادت مشرقی آناطولی میں کوسہ داغ کے مقام پر رومی سلجوقیوں کے لشکر کو شکست دی (۶ محرّم ۶۴۱ھ/ ۲۶ جون ۱۲۴۳ء)، تاہم سلجوقی مملکت فی الواقع مفتوح نہیں ہوئی، البتہ مغلوں نے قیصریہ تک پیش قدمی کی اور بہت لوٹ مار مچائی۔ سلجوقی سلطنت بتدریج مغلوں کی باجگزار ریاست بن کر رہ گئی۔ پہلے مشرقی یورپ کے فاتح باتو کی اور پھر ایران کے مغل حکمرانوں یعنی ایلخانوں کی۔ مغلوں کے ساتھ ترکمانوں کی ایک نئی رَو آناطولی میں داخل ہوئی۔ یہ ترکمان کچھ تو مغلوں کے تابعین کی حیثیت سے آئے اور کچھ ان میں وہ تھے جنھیں مغلوں نے اپنے اصلی اوطان سے نکال دیا تھا۔ ان کی وجہ سے ترکمانوں کی اس نیم خانہ بدوش آبادی میں اضافہ ہو گیا جو پہلے سے آناطولی میں موجود تھی اور انھوں نے اہم کام سرانجام دیا۔ ان میں سب سے زیادہ فوری اہمیّت قرہ مان [رتک بان] بن نُورا صوفی (صُوفی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی درویش خاندان کا رکن تھا) کے لشکروں کو حاصل ہوئی۔ اس نے کوہستان طاوروس کے دامن میں اِرْمِنِک (Ermenik) (قدیم زمانے کے جرمانیکوپولس Germanicopolis) کے گرد و نواح میں لی قاؤنیہ (Lycaonia) اور کلیکیا کی سرحد پر ایک ریاست کی بنا ڈالی۔ ۱۲۷۷ء میں قرہ مان کے بیٹے محمد بیگ نے روم کی سلجوقی مملکت کو تخت کے ایک مدّعی جمری کے وسیلے سے اپنے زیرِ اقتدار لانے کی کوشش کی اور اس نے اپنے اس پروردہ کے لیے قونیہ کا شہر سر کر لیا لیکن مغلوں کے ایک تادیبی لشکر نے شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور محمد بیگ پسپا ہونے اور اپنے ترکمانوں کو لے کر پہاڑوں میں گُھس جانے پر مجبور ہو گیا۔ جمری شمال مغرب کی طرف بچ نکلا لیکن سلاجقہ کے لشکر نے دریاے سَقاریہ پر اسے شکست دی (محرّم ۶۷۶ھ/جون ۱۲۷۷ء) اور وہ اسیر کر کے قتل کر دیا گیا۔

اس دَور کا دوسرا اہم واقعہ یہ تھا کہ بوزنطیوں نے قیصر میخائل ہفتم پالیولوغ (Michael VII Palaeologus) کی سرکردگی میں قسطنطینیہ کو دوبارہ فتح کر کے بوزنطی سلطنت کو ازسرِ نو بحال کر لیا مگر سلطنت کی طاقت قصۂ ماضی ہو چکی تھی۔ پالیولوغ خاندان کے قیاصرہ کو جزیرہ نماے بلقان میں روز افزوں مصروفیت رہی۔ اس کے علاوہ انھیں لاطینیوں کی ہوسِ ملک گیری کا مقابلہ کرنا پڑا۔ سلطنت کی باقی ماندہ طاقت اس میں صرف ہو جاتی تھی۔ بوزنطی شہنشاہ آناطولی کے حالات پر ضروری توجہ صَرف نہ کر سکتے تھے چنانچہ انھوں نے اس دفاعی نظام کو، جسے لاسقاری خاندان (Lascarid) نے تعمیر کیا تھا، تباہ و برباد ہو جانے دیا۔ اس سے ترکمانوں کے ان لشکروں کے لیے، جو آناطولی میں برابر چلے آ رہے تھے، جہادی سرگرمیوں کا جاری رکھنا اور مغربی اقطاع پر قبضہ جمانا زیادہ آسان ہو گیا۔ یہ اقطاع چونکہ اندرونی علاقے کے مقابلے میں زیادہ زرخیز تھے،

اس لیے اِن پر اُن کی نگاہیں پہلے ہی سے لگی ہوئی تھیں۔ اس طرح پالیولوغ حکمران اپنے آناطولوی علاقوں سے بتدریج دست بردار ہونے پر مجبور ہوگئے اور ترکوں کو خاص طور پر میدانی علاقوں میں کسی قسم کی مزاحمت سے سابقہ نہ پڑا۔ ١٣٠٠ء تک مغربی آناطولی کا بیشتر حصّہ ترکوں کے قبضے میں جا چکا تھا اور اب بہ مشکل کوئی ایسا ضلع باقی رہا تھا جس کی غیر ترکی آبادی میں ترک موجود نہ ہوں۔ بالآخر معدودے چند قلعے (مثلاً صوبۂ بیثینیا (Bithynia) میں پروسہ (Prusa)، نیکیا (Nicaea)، ازنیق)، نیقومیدیا (Nicomedia [ازمید] اور صوبۂ لیڈیا (Lydia) میں سارڈیس (Sardes)، فیلادلفیا (Philadelphia) اور مُغنیسہ (Magnesia) اور چند بندرگاہیں (مثلاً بحیرۂ ایگہ پر سمرنا [ازمیر] اور فوکیہ [آج کل: فوچہ] (Phocaea)، بحیرۂ اسود پر ہراقلیہ [آج کل: اَرگلی- Heraclia) ترکی مملکت کے اندر منفرد مقبوضات کی حیثیت سے بوزنطیوں کے قبضے میں رہ گئیں۔

ترکوں کے گروہ (hordes) عموماً اپنے اپنے سرداروں کی سرکردگی میں ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ معرکہ آرائی کرتے تھے اور یہ سردار مفتوحہ اضلاع میں اپنی اِمارتیں قائم کر لیتے تھے۔ ہم ان اِمارتوں کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، البتہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی نیم خانہ بدوش چھوٹی چھوٹی ریاستیں خاصی تعداد میں موجود تھیں، اگرچہ ان میں سے بعض کی اہمیّت فقط چند روزہ تھی۔ ١٣٠٠ء تک ان امارتوں کی تھوڑی سی تعداد ظہور پذیر ہو چکی تھی۔ ان میں اوّل تو سب سے زیادہ طاقتور اِمارت گِرمیان [رکّ بآن] کی تھی جو فُریجیہ میں قائم ہوئی اور جس کا صدر مقام کُوتاہیہ (قدیم Cotyaeum) تھا۔ العُمَری کے بیان کے مطابق مغربی آناطولی کے ترک امرا بعض ادوار میں گرمیان کو خراج ادا کرتے تھے اور ابن بطّوطہ کے بیان کے مطابق وہ اُن سے خائف رہتے تھے۔ گرمیان نے عارضی طور پر اپنے اقتدار کو وسطی آناطولی تک وسیع کر لیا اور ١٣٠٠ء میں (ایک کتبے کے مطابق آنقرہ تک پہنچ گئے۔ ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گرمیان دراصل ترکمان نہیں تھے بلکہ ممکن ہے وہ یزیدی کُرد ہوں (قب Cahen: *Notes sur l'histoire des Turcomans d'Asie Mineure au XIIIe siécle*، در *J.A.*، ١٩٥١ء، ص ٣٣٥-٣٥٤؛ گرمیان کے اصل کے بارے میں دیکھیے خصوصاً ص ٣٤٩ببعد)۔ گرمیان کی ریاست کے اردگرد امارتوں کا ایک پورا دائرہ بن گیا جن میں سے بعض کے بانی بظاہر گرمیان ہی میں سے تھے۔ مغربی آناطولی کی اِن اِمارتوں میں اُس زمانے کی دوسری سب سے بڑی اِمارت پافلاغونیا (Paphlagonia) کی امارت جاندار [رکّ بآن] تھی، جس کا صدر مقام قسطمونی (قاستر اکومنِنی Castra Comneni، موجودہ قسطمونو) تھا اور سینوب (Sinope، Sinop، Sinob) کی بندرگاہ بھی اس امارت کے قبضے میں تھی۔ اس کے جانب مغرب، شمالی فُریجیہ میں (اِسکی شہر دَرِوْلیَہ Dorylaeum کے گرد و نواح میں) عثمان کی امارت تھی جس کا مرکز سُگُود (Sögüd) تھا۔ چند مزید قلعوں کی فتح کے بعد یہ امارت بحیرۂ مرمرہ تک پھیل گئی۔ زیادہ دُور مغرب یعنی میسیا (Mysia) کے علاقے میں قرہ سی [رکّ بآن] کی ریاست تھی جس میں بالیکسری (Palaeocastro) اور برغمہ (Pergamum) کے مرکز شامل تھے اور درۂ دانیال (Hellespont) تک بحیرۂ مرمرہ کا ساحلی علاقہ بھی شامل تھا۔ اس سے آگے بحیرہ ایگہ کے ساحلی علاقے میں، یعنی شمالی لیڈیا (Lydia) میں، صارُوخان [رکّ بآن] کی ریاست تھی جس کا مرکز مَغنِیسہ (Magnesia، موجودہ مَنِیسہ) تھا اور جنوبی لیڈیا میں آیدین [رکّ بآن] اور سمرنا [ازمیر] کا عقبی علاقہ اور تیرہ (Tire) شامل تھا؛ نیز قاریہ (Caria) میں منتشا کی امارت تھی، جس میں مِیلاس (Mylasa) اور مُغلہ شامل تھے۔ آخر میں جنوب مغربی آناطولی کے دُور ترین حصّے میں تکّہ [رکّ بآن] تھا جو لیکیہ (Lycia) میں تھا؛ اور پامفیلیا (Pamphylia) کی اِمارت تھی جس کا مرکز انطالیہ (آدالیہ) تھا اور پیسیدیا (Pisidia) کے علاقے میں حَمِید [رکّ بآن] کی امارت، جس کا مرکز اسپارٹہ (Isparta) تھا.

تقریباً اسی زمانے میں روم کی سلجوقی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے ہی اس خاندان کے فرمانروا سلاطین کا اقتدار مغول والیوں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا جو سیِواس میں رہا کرتے تھے۔ سلاجقہ کے آخری ظلّی سلطان علاء الدین کیقباد ثالث کی وفات (٧٠٧ھ/ ١٣٠٧ء یا ٧٠٨ھ/ ١٣٠٨ء) کے بعد یہ سلطنت ایران کی ایلخانی مغل سلطنت کا محض ایک صوبہ بن کر رہ گئی۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر قرہ مانیوں [رکّ بہ قَرہ مان] نے اپنے اقتدار کو طاوروس کی دامنی پہاڑیوں سے آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ وہ شہر لارَندہ (Laranda) (موجودہ قرہ مان) فتح کرنے میں کامیاب ہوگئے جسے انھوں نے اپنا صدر مقام بنا لیا؛ لیکن وہ قونیہ سر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ یہ شہر ایلخانی والی چوپان اور اس کے بیٹے تمرتاش کے قبضے میں تھا، بلکہ موخّر الذکر نے فی الواقع مغرب میں اپنی فتوحات کی بدولت، جہاں اس کا مقابلہ چھوٹے چھوٹے ترک امرا سے ہوا، ایلخانی سلطنت کو مزید وسعت دے دی۔ ١٣٢٠ سے ١٣٣٩ء تک کے عرصے میں جو شورش و اضطراب ایلخانی سلطنت میں رونما ہوا اس کا اثر آناطولی تک پہنچ گیا (تمرتاش ٧٢٨ھ/ ١٣٢٨ء میں مصر بھاگ گیا)۔ مغلوں کے مفتوحہ علاقے ان کے ہاتھ سے نکل گئے اور قرہ مانی قونیہ کو فتح کرنے میں کامیاب ہوگئے، تاہم انھوں نے لارَندہ ہی کو اپنا صدر مقام بنائے رکھا۔ چودھویں صدی عیسوی کے دوران میں قرہ مانیوں نے اپنا اقتدار مغرب کی طرف بڑھایا اور جنوبی آناطولی میں اپنے مقبوضات کو وسعت دی۔ اس طرح ان کا اتصال ان ترک ریاستوں کے ساتھ ہو گیا جو مغربی آناطولی میں فروغ پا رہی تھیں.

ایلخانی سلطنت کے مسلسل انحطاط کی بنا پر مغول والیوں نے روم میں اپنے خودمختار امیر (یا سلطان) ہونے کا اعلان کر دیا اور وہ مصر کے مملوک سلاطین سے امداد کے طالب ہوئے۔ ١٣٧٥ء میں مملوک سلاطین نے کوچک ارمنستان (آرمنیہ)

کی مملکت کا خاتمہ کر دیا اور اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد رَمَضان [رک بآن] نامی ایک ترکمان خاندان نے اس مملکت کے علاقۂ کِلِیکِیا (Cilicia) میں مصر کے زیرِ سیادت ایک نئی ریاست قائم کر لی جس کا صدر مقام آدَنہ [آطنہ] تھا۔ ترکمانوں کا ایک اَور خاندان دُلغادِر (عربی شکل ذوالقدر [رک بآن]) بھی مصر ہی کے زیرِ سایہ مشرقی طاوروس کے علاقے میں متمکّن ہو گیا جس میں اِلبِستان بھی شامل تھا.

مغرب میں غازی عثمان اور اس کے جانشین یعنی عثمانی ترک [رک بہ مادّۂ عثمانلی=UTHMĀNLĪ] باقی ماندہ بوزنطی علاقوں پر قبضہ کر کے اپنی مملکت کو بیش از پیش وسیع بناتے گئے۔ جب شمالی فُرِیجیہ (Phrygia) اور بحیرۂ مرمرہ تک کا علاقہ عثمانیوں کے قبضے میں آ گیا تو عثمان کے بیٹے اور خان نے شہر ہاے پُروسہ (بُروصہ، بُروسہ، ۱۶ اپریل ۱۳۲۶ء)، نِیقِیا (Nicaea) (اِزنیق، ۲ مارچ ۱۳۳۱ء) اور نِیقومدِیہ (Nikomedia= اِزنِیقومِد، موجودہ اِزمِید، ۱۳۳۷ء) فتح کر لیے۔ بُروسہ اس کا دارالحکومت بنا۔ قرہ سی کی ہمسایہ اِمارت میں جانشینی کے جھگڑوں سے فائدہ اٹھا کر اورخان نے اس ریاست کو بھی اپنی مملکت میں شامل کر لیا (۷۳۶ھ/ ۱۳۳۶ء)۔ اس طرح بحیرۂ مرمرہ کا سارا جنوبی ساحل، درۂ دانیال کے مدخل سمیت، عثمانی مملکت میں آ گیا۔ مراد اوّل کے عہد میں ایک طرف تو جزیرہ نماے بلقان میں فتوحات حاصل ہوئیں اور دوسری طرف آناطولی میں کئی علاقوں کا الحاق، عموماً پُرامن طریقے پر، عمل میں آیا۔ اس نے تخت نشین ہونے (۷۶۱ھ/ ۱۳۶۰ء) کے کچھ ہی عرصہ بعد اَنقرہ پر قبضہ کر لیا جو اوّلاً برائے نام مغول والیوں کے تحت تھا اور بعد میں ان کے جانشین امراے روم (سیواس) کے تحت آ گیا تھا لیکن دراصل اُس کی حکومت اُن اصناف (guilds) کے سرداروں کے ہاتھ میں تھی جو اَخیوں کے وفاق [رک بہ اَخی] میں شامل، مگر عملاً خودمختار تھے۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے اِمارتِ حَمِید بھی لے لی (۷۸۳ھ/ ۱۳۸۱ء) اور اس طرح عثمانی سلطنت کو مشرق اور جنوب میں بہت وسعت دے دی۔ مراد کے بیٹے اور جانشین بایزید اوّل نے اپنی تخت نشینی (۷۹۲ھ/ ۱۳۸۹ء) کے تھوڑے ہی عرصے بعد آسانی سے آناطولی کی ساری ترکمان ریاستوں پر قبضہ کر لیا جن میں قرہ مان کی ریاست اور مغول والیوں کا علاقہ بھی شامل تھا؛ مگر اس کا نتیجہ تیمور کے حملے کی شکل میں رونما ہوا۔ بایزید نے اَنقرہ کے قریب تیمور کے ہاتھوں شکست کھائی (۱۹ ذوالحجہ ۸۰۴ھ/ ۲۰ جولائی ۱۴۰۲ء)۔ تیمور نے آناطولی کے معزول شدہ رئیسوں کو بحال کر دیا۔ عثمانیوں کے پاس ان کی اپنی اصلی ریاست کے علاوہ مغلوں کا اصل سابقہ علاقہ، جو شمال مشرقی آناطولی میں تھا، باقی رہ گیا۔ یہاں سے محمد اوّل نے سلطنت کو ازسرِنو متحد کیا اور مراد ثانی کے عہد میں مغربی آناطولی کی امارتیں بتدریج عثمانی سلطنت میں مدغم ہوتی گئیں۔ اب عثمانیوں کے واحد حریف قرہ مان باقی رہ گئے تھے۔ مراد کے بیٹے محمد ثانی نے قسطنطینیہ فتح کر کے (۲۹ مئی ۱۴۵۲ء)، جس سے عثمانی مملکت کو ایک قدرتی مرکز مل گیا، آناطولی میں اسے ایک مکمّل اور منظّم شکل دینے کا کام پورا کیا۔ اس نے ۱۴۶۱ء میں سلطنتِ طَربُزون کا اور ۱۴۶۷ء میں امارتِ قرہ مان کا خاتمہ کر کے دونوں کو عثمانی سلطنت میں شامل کر لیا۔ آق قویونلو قبیلے کے ترکمان حکمران اوزون حسن نے سلطان محمد کو ان صوبوں کی واپسی پر مجبور کرنے کے لیے جو کوشش کی، وہ ترجان (اِرزِنجان کے مشرق میں) کی لڑائی (۸۷۸ھ/ ۱۴۷۳ء) میں اوزون حسن کے شکست کھانے کی وجہ سے ناکام ہوئی۔ مشرق کی جانب میں عثمانیوں کا اقتدار اس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا جب محمد کے پوتے سلیم اوّل (۹۲۱ھ/ ۱۵۱۵ء) نے دُلغادِر کی امارت کا الحاق اپنی سلطنت سے کر لیا اور پھر دیار بکر کو فتح کرنے کے بعد کِلِیکِیا (Cilicia) میں رَمَضان اوغوللری کی ریاست کو اپنا باج گزار بنا لیا اور آخر کار کُرد سرداروں کی اطاعت حاصل کر لی۔ شمال مشرق کی طرف عثمانی سلاطین اور ان کے سپہ سالاروں نے ایران کے خلاف جو معرکہ آرائیاں کیں ان کی وجہ سے عثمانی سلطنت کوہستانِ قاف کے دامن کی پہاڑیوں تک اور وسیع ہو گئی۔ ان مہمّوں کا رخ زیادہ تر شمال مشرق کی طرف ہوتا تھا (سُلیمان کی فوج کشی: ۹۴۰ھ/ ۱۵۳۴ء، ۹۵۵ - ۹۵۶ھ/ ۱۵۴۸ - ۱۵۴۹ء؛ گُرجستان کے خلاف "سر عسکر" مصطفیٰ پاشا کی مہمّ: ۹۸۶ھ/ ۱۵۷۸ء؛ اِریوان کے خلاف مراد رابع کی مہمّ: ۱۰۴۵ھ/ [۱۶۳۵ - ۱۶۳۶ء])۔ اس کے بعد سے سارا آناطولی بغیر کسی جھگڑے کے عثمانیوں کے قبضے میں رہا اور عصرِ حاضر میں جمہوریۂ ترکیہ نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا ہے.

زیادہ قریب کے زمانے میں صرف یہ ایک تبدیلی ہوئی ہے کہ قارص، اَرْدَہان اور باطوم کی سنجاقیں (اضلاع) ۱۳ جولائی ۱۸۷۸ء کے معاہدۂ برلن کی رو سے، جو اس بارے میں دراصل سان سٹیفانو کے معاہدے (۳ مارچ ۱۸۷۸ء) ہی کی توثیق کرتا تھا، روس کے پاس چلی گئیں لیکن بریسٹ - لِٹوفسک کے صلح نامے (۳ مارچ ۱۹۱۸ء) کی بنا پر یہ علاقے پھر ترکیہ کو مل گئے۔ اس معاہدے کی توثیق بالآخر (شہر باطوم اور تھوڑا سا عقبی رقبہ چھوڑ کر جسے اب اَجارِستان کہا جاتا ہے) وِفاقِ جُمہوریاتِ اشتراکیۂ سوویتی (USSR) نے معاہدۂ ماسکو (۱۶ مارچ ۱۹۲۱ء) کے ذریعے کر دی اور گُرجستان، ارمنستان اور آذربیجان کی سوویتی جمہوریتوں نے بھی، جو اُس وقت تک برائے نام آزاد تھیں، معاہدۂ قارص (۱۳ اکتوبر ۱۹۲۱ء) کے ذریعے اس کی توثیق کر دی (قب G. Jäschke: *Geschichte der rüssisch-türkischen Kaukasusgrenze*, *Archiv des Völkerrechts*، ۱۹۵۳ء، ص ۱۹۸ - ۲۰۶)۔ ۲۳ جون ۱۹۳۹ء کے فرانسیسی - ترکی معاہدے کی رُو سے شام نے اسکندرون کی سنجاق ترکی کے حوالے کر دی اور یہ سنجاق (۶۳ ویں) ولایت کے طور پر حاطای (Hatay) کے نام سے مملکت ترکیہ میں شامل کر لی گئی.

۳ - آناطولی کی سیاسی تقسیم:

نسبۃً ابتدائی عثمانی تنظیم: عثمانی سلطنت اتنی تیزی کے ساتھ وسعت پذیر ہوئی کہ جلد ہی اسے انتظامی منطقوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

شروع میں یہ تقسیم محض باج گزار سوار فوج کے ''جھنڈوں'' (سنجاق [رک بآن] یا لواء) کے مطابق تھی جن میں سے ہر ضلع ایک صاحب عَلَم (سنجق بیگی یا میر لواء) کی تحویل میں ہوتا تھا۔ دوسرے عثمانی فرمانروا اورخان کے عہد ہی میں ایسے چار اضلاع بن چکے تھے: (۱) سلطان اُونیُوگی [رک بآن] جو عثمانیوں کے اصلی علاقوں، یعنی اِسکی شہر اور سُگُود (Sögüd) کے گرد و نواح پر مشتمل تھا؛ (۲) خداوند کار (ایلی)، یعنی ''حکمران کی (زمین)''، جس کا انتظام براہِ راست فرمانروا کے ہاتھ میں تھا اور جس میں بُروسہ اور اِزنیق کے شہر تھے؛ (۳) قوجہ ایلی [رک بآن]، ایک جاگیر جو اورخان نے اپنے سپہ سالار آقچہ قوجہ کو عطا کی تھی؛ یہ جاگیر جزیرہ نمائے بیتینیا (Bithynia) پر مشتمل تھی اور اس کا بڑا شہر اِزمید تھا؛ (۴) قرہ سی ایلی [رک بآن]، قرہ سی کی سابق امارت کا علاقہ، جس میں بالیکسری اور برغمہ کے شہر شامل تھے۔ مراد اوّل کے عہد میں جب سلطنت جزیرہ نمائے بلقان اور آناطولی کے مزید علاقوں کی فتح سے اَور زیادہ وسیع ہوگئی تو آبنائے کے دونوں طرف کے عثمانی مقبوضات کو ایک ایک صوبے ('ایالت'، بعد میں 'ولایت') کی شکل میں متحد کر دیا گیا اور ہر صوبہ ایک پاشا کی تحویل میں دے دیا گیا جس کا خطاب بیگلر بیگی (بعد میں ''والی'') تھا۔ اس طرح شروع میں صرف دو صوبے تھے؛ ایک کا نام آناطولیہ (آناطولی، جس کا تلفّظ بعد میں ''آنادولو' ہوا) رکھا گیا اور دوسرا صوبہ رُومیلیہ (رُوم ایلی) کہلایا۔ ان میں سے ہر ایک صوبہ تیولداری مِلیشیا [ہنگامی فوج] کے اضلاع ('سنجاق' یا 'لواء') میں منقسم تھا۔ جب آناطولی کی ترکی امارتیں سلطنت عثمانیہ میں ضم ہوگئیں تو انھیں ایسی ہی سنجاقیں بنا دیا گیا لیکن ان کے اصلی نام برقرار رہے۔ اس طرح سلطنت عثمانیہ کی سیاسی تقسیم سے اس کی تدریجی نشوونما کا پتا چلتا ہے۔ بعد میں جب عثمانی ترک بایزید اوّل اور بالخصوص محمد ثانی اور سلیم اوّل کے عہد میں مشرق کی طرف دور تک بڑھ گئے تو نئے مفتوحہ علاقوں کو 'ایالت' آنادولو کی نئی سنجاقیں نہیں قرار دیا گیا، بلکہ وہ بجائے خود علیحدہ صوبے قرار پائے۔ صوبوں اور سنجاقوں کی اس انتظامی تقسیم سے بالکل الگ ملک کی تقسیم 'قضاؤں'، یعنی دادگستری کے حلقوں میں تھی۔ ان میں سے ہر 'قضا' ایک قاضی (جج) کی عملداری میں تھی۔ ان کے علاوہ کچھ ریاستیں (حکومت) بھی تھیں۔ ان پر مقامی خاندانوں کے رئیس حکومت کرتے تھے جو براہِ راست بابِ عالی کے باج گزار تھے۔ یہ سارا نظام سلطان سلیمان اوّل قانونی کے نافذ کردہ قوانین سے آخر کار متعیّن و مکمّل ہوا۔ اس نظام کے مطابق (قب کاتب چلبی کی جہان نما کا مطبوعہ نسخہ؛ قب نیز ہامر (J. V. Hammer): *Des osmonischen Reiches Staatsverfassung und Staatsverwaltung*، ۲: ۲۴۹ ببعد اور P. A. V. Tischendorf: *Das Lehnswesen in den muslimischen Staaten*، لائپزگ ۱۸۷۲ء، ص ۶۲ ببعد) آناطولی کی ایالتیں حسبِ ذیل تھیں: (۱) آطنہ (ص ۶۰۱، اسے سنجاقِ حلب بھی لکھا گیا ہے)؛ (۲) آنادولو (ص ۶۳۰؛ قب نیز متصل بعد کا مادّہ آناطولی)؛ (۳) چِیلدِیر کا ایک حصّہ (ص ۴۰۸، بعد میں ماورائے قفقاز میں آخِسقہ)؛ (۴) دِیاربکر (ص ۴۳۶)؛ (۵) ارزَنِ روم (ارضُ روم، ص ۴۲۲)؛ (۶) قَرہ مان (قونیہ، ص ۶۱۴)؛ (۷) قارص (ص ۴۰۷)؛ (۸) [ذوالقدرِیّہ] (مرعش، ص ۵۹۸)؛ (۹) رَقّہ (اُورفہ، ص ۴۴۳)؛ (۱۰) سِیواس، (جسے صرف روم بھی کہا جاتا ہے، ص ۶۲۲)؛ (۱۱) طِرَبزون (طرَبزون، ص ۴۲۹)؛ (۱۲) وان (ص ۴۱۱)؛ (۱۳) ایالتِ حلَب میں سے سنجاقِ انطاکیہ (ص ۵۹۵، موجودہ حاطای Hatay)، بِیرہ (بِیرہ جک، ص ۵۹۷) اور کِلس (ص ۵۹۸)؛ (۱۴) مغربی آناطولی کی سنجاقیں بِیغا (ص ۶۶۷)، قرہ سی (ص ۶۶۱) اور صُغلہ (اِزمیر، ص ۶۶۷) نیز اِیچ ایل (سلِفکہ) اور علایا کے علاقے بشمول جزیرہ قُبرس، ساحل جنوبی پر، جو قپودان پاشا (امیر البحر) کے ماتحت تھے (ان سابق الذّکر ناموں میں سے ہر ایک کے لیے دیکھیے علیحدہ علیحدہ مادّے در [آ آ]).

بنیادی طور پر یہ تقسیمات انیسویں صدی عیسوی تک قائم رہیں، اگرچہ کبھی کبھی مرکزی حکومت کے کمزور ہوجانے کی صورت میں بعض مقامی پاشا عَلَمِ بغاوت بلند کرکے اپنے حلقۂ اقتدار کو اپنے صوبوں کی اصلی حدود سے آگے بڑھانے کی کوشش کرتے رہے، جن والیوں نے خودمختارانہ اقتدار حاصل کرکے خاندانی حکومتیں قائم کر لیں، انھیں ''وادیوں کے رئیس'' (دیرہ بیگی [رک بآن]) کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد ان کا شمار سرکاری ملازمین میں نہیں ہوتا تھا بلکہ انھیں (بادلِ ناخواستہ) بابِ عالی کے باج گزار مانا جاتا تھا اور وہ سلطان کے لیے لشکر مہیّا کرتے تھے۔ چونکہ اپنے علاقے کی خوشحالی میں خود ان کا فائدہ تھا اس لیے ان کی حکومت بالعموم نفع مند ہوتی تھی۔ ان کے مقابلے میں بابِ عالی کی طرف سے جو والی صوبوں میں بھیجے جاتے، انھیں اکثر تبدیل کر دیا جاتا تھا؛ لہٰذا ان کا بڑا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اپنے لیے جس قدر جلد ہو سکے، زیادہ سے زیادہ دولت جمع کر لیں۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں، بالخصوص آناطولی میں، کئی ایسی نیم آزاد ریاستیں قائم ہوئیں، مثلاً بحیرۂ ایگہ کے علاقے میں قرہ عثمان کی ریاست اور وسطی قزیل ایرماق (ہالیس Halys) کے خطّے میں چپان (یاچپار) کی ریاست.

تنظیمات: سلطان محمود ثانی نے اپنی اصلاحات کے سلسلے میں دیرہ بیگیوں کی ریاستوں کا خاتمہ کر دیا۔ اصلاح (تنظیمات) کے بعد کے زمانے میں ۷ جمادی الاُخری ۱۲۸۱ھ/ ۸ نومبر ۱۸۶۴ء کے منظور شدہ قانون کی رُو سے سلطنت کو از سرِ نو یورپی طریقے پر منقسم کیا گیا۔ اب ''صوبے'' ('ولایت') اداری رقبے ('سنجاق') اور ''اضلاع'' ('قضا') بنا دیے گئے۔ بہت سی پرانی سنجاقوں، خصوصاً ایالتِ آنادولو کی — بعد میں (۱۸۷۵ء) ارضُ روم کی ایالت کی بھی — سنجاقوں کا درجہ بڑھا کر انھیں صوبے یا ولایتیں بنا دیا گیا اور انھیں چھوٹی چھوٹی سنجاقوں میں منقسم کیا گیا۔ بعض اَور چھوٹی ایالتوں کو سنجاق قرار دے کر ولایتوں میں شامل کر دیا گیا۔ کسی قدر تامّل اور دو دلی کے بعد آناطولی کا علاقہ حسبِ ذیل ولایتوں پر مشتمل ہوا (بقول کُوینے (Cuinet): *La Turquie d'Asie*، پیرس

۱۸۹۰ء): (۱) آطنَہ؛ (۲) اَنقرہ؛ (۳) آیدِین (سمرنا، اِزمیر)؛ (۴) بِتلِیس؛ (۵) دِیاربکر؛ (۶) اِرضُ روم؛ (۷) ولایت حلب کی سنجاقیں مَرعَش اور اُورفہ، جن کے ساتھ بعض قضائیں بھی شامل تھیں؛ (۸) ولایت استانبول کی بعض قضائیں اور ناحیے؛ (۹) قَسطَمُونی؛ (۱۰) خداوندِگار (بُرُوسَہ)؛ (۱۱) قونیہ؛ (۱۲) معمورۃ العزیز (۱۸۸۰ء سے خَرپُوت)؛ (۱۳) سِیواس؛ (۱۴) طُرَبزُون؛ (۱۵) وان؛ اور دو مستقل سنجاقیں (۱۶) بِیغا؛ (۱۷) اِزمِید [ان سب پر آآآ، میں الگ الگ مقالے موجود ہیں]۔ یہ تقسیم معمولی تبدیلیوں کے ساتھ پہلی جنگِ عظیم کے بعد تک قائم رہی.

جمہوریۂ ترکیّہ کے عہد میں ان ''ولایتوں'' کو منسوخ کر کے ''سنجاقوں'' کو ''ولایتوں'' کا درجہ دے دیا گیا۔ لسانی اصلاحات کے زمانے میں انھیں ''اِیل'' [مُلک] کہا جاتا تھا۔ ان کی تعداد بدلتی رہی: ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو کل ۵۷ ''ولایتیں'' تھیں؛ ۱۹۳۵ء کے آخر میں نواحی ''ولایتوں'' کے اضلاع، یا ''قضاؤں'' سے، جو اب ''اِیلچہ'' [چھوٹا ملک] کہلاتی تھیں، پانچ نئی ''ولایتوں'' کا اضافہ کر دیا گیا؛ ۱۹۳۹ء میں تریسٹھویں ولایت حاطای (Hatay) مستزاد ہوئی (جسے شام کی فرانسیسی حکم داری [mandate]) نے ترکیّہ کے حوالے کر دیا تھا، دیکھیے سطورِ بالا۔ یکم جنوری ۱۹۴۰ء کو جو ۶۳ ولایتیں قائم تھیں، ان کے اور اُن کے اضلاع کے نام یاشکے (G. Jäschke) نے *Türkei*، برلن ۱۹۴۱ء، ص ۲۲ - ۲۴ میں دیے ہیں)۔ ۱۹۵۳ء میں چونسٹھویں ولایت عُشاق کا اضافہ ہوا۔ ۴ جنوری ۱۹۵۴ء کو مملکت ترکیّہ کا پورا رقبہ چونسٹھ صوبوں اور ۵۲۳ اضلاع میں منقسم تھا (چونسٹھ صوبوں میں سے صرف چار صوبے ترکیّہ کے یورپی حصّے میں ہیں اور باقی ماندہ ساٹھ آناطولی میں) لیکن آناطولی کے صوبوں میں سے چَناق قلعہ کا صرف کچھ حصّہ یورپ کی سرزمین پر ہے اور اس کے برعکس صوبۂ استانبول کا بیشتر حصّہ یورپ میں ہے.

جغرافیائی اعتبار سے یہ صوبے ان آٹھ منطقوں (بورلجہ bölge) میں جمع ہیں [ناموں کا موجودہ املا سابق سے قدرے مختلف ہے]: (۱) بحیرۂ اسود کا ساحلی منطقہ: اس میں طُرَبزُون، اوردُو، رِیزِہ، زونگُلدُک، گِرِہ سُون، سامسُون [صامسون]، سینوب، قسطمونو [قسطمونی]، بُولُو [بولی] اور چُورُوہ کی ولایتیں شامل ہیں؛ (۲) بحیرۂ مرمرہ اور بحیرۂ اِیگِہ کا ساحلی منطقہ: یہ ولایت استانبول کے ایشیائی حصّے (= اسکُودار [اشقودرہ]، قاضی کورئی، بِکقوز؛ آدلر، کرتل، شِیلِہ اور یالُوہ کے اضلاع) اور چَناق قلعہ (اضلاع: چناق قلعہ، آیواجق، بِیغا، بَیرامیچ، بوزجادہ، اِزِینِہ، لاپسکی، یکیجہ) اور صوبہ ہاے اِزمیر، قوجہ ایلی (ازمِید)، آیدِین، بالیکسِر، بُرُوسَہ، مَنِیسَہ اور مُغلَہ پر مشتمل ہے؛ (۳) بحیرۂ روم کا ساحلی منطقہ: اس میں حاطای (Hatay) - اِسکَندرُون)، سَیحان (اَدَنَہ)، اِیچ اِیل (سِلفکِہ)، اَنطالیہ کی ولایتیں شامل ہیں؛ (۴) یورپی ترکیّہ کا منطقہ: اس میں استانبول کی ولایتوں کا یورپی حصّہ (بک اوغلو، بشِک طاش، صاری یر، فاتح، ایُوپ [ایّوب]، اِمین اونُو، باقرکوری، چتالجہ، سِلِوری کے اضلاع) اور چَناق قلعہ (اضلاع اِجابَت، گلی بولو، اِمروز) اور ولایاتِ کِرک لَرِلی، تکِرداغ، اِدِرنہ شامل ہیں؛ (۵) مغربی آناطولی کا منطقہ: یہ دِنِزلی، بِیلَہ جِک، کُوتاہِیَہ، اَفیون قرہ حِصار، اِسپارتہ، بوردور، اِسکی شِہر اور ۱۹۵۳ء سے عُشاق کی ولایات پر مشتمل ہے؛ (۶) وسطی آناطولی کا منطقہ: اس میں ولایات توقات، چُورُم، اَماسِیَہ، قیصری، مَلطِیّہ، اَنقَرہ، چَنکِیری، یوزغاد، سِیواس، مَرعَش، نِیغدہ [نیگدہ]، قِیرشِہر وقُونیہ شامل ہیں؛ (۷) جنوب مشرقی آناطولی کا منطقہ: یہ [غازیان] تپ، مارِدین، اور اُورفہ کی ولایتوں پر مشتمل ہے؛ (۸) مشرقی آناطولی کا منطقہ: قارص، اِلازِغ، دِیاربکر، گُمُش [خا]نہ، اِرضُ روم، اِرزنجان، سِعرد، بِتلِیس، تُنجلی، اَغرِی مُوش، بِنگُورل، وان، ہکارِی کی ولایتیں شامل ہیں.

۴ - آبادی:

ترک اور غیر ترک: آناطولی کی ترکی فتح کے وقت سے پہلے ہی یہ سرزمین ہیلینیت کے رنگ میں رنگی جا چکی تھی۔ آناطولی کی مختلف قدیم اقوام کو ہیلینیت میں رنگنے کا عمل (جو یونانیوں اور رومیوں کے عہد میں شروع ہوا) ان لوگوں کو عیسائی کرنے کے دوران میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ قدیم باشندوں میں سے بچے کھچے لوگ (مثلًا لاز Lazes) اب پہاڑوں اور خصوصًا کوہ قاف کے دامن کی پہاڑیوں ہی میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ مقامات زمانۂ قدیم کے بعض مذہبی فرقوں مثلًا پوُلوُسِیوں (پوُلیشَنز Paulicians) کے لیے ایسی پناہ گاہوں کا کام بھی دیتے رہے ہیں جہاں وہ الگ فرقوں کی حیثیت سے باقی رہ گئے۔ تاہم ترکوں کے نمودار ہونے تک مجموعی طور پر سارے آناطولی میں یونانی بولی بولی جانے لگی تھی اور لوگ زیادہ تر صحیح العقیدہ (آرتھوڈوکس) بوزنطی کلیسا کے پیرو ہو چکے تھے۔ مشرق میں صرف ارمنی باشندے تھے جو مسیح کو فقط ایک ذات رکھنے والا سمجھتے تھے (یعنی جو مونوفیزی (Monoplysites) تھے۔ وابستہ بہ عقیدۂ گریگوری) اور کلیسائی اعتبار سے یونانیوں سے الگ رہے اور انھوں نے ہیلینیت قبول نہیں کی۔ چونکہ ارمنی تجارت پیشہ تھے اس لیے غالبًا وہ ترکی عہد سے پہلے ہی مغرب کی طرف دارالسلطنت [استانبول] تک پھیل چکے تھے.

جب ترک آناطولی میں آئے تو وسط ایشیا کی ایک نئی قوم ایک نیا مذہب، یعنی اسلام، لے کر ملک میں داخل ہوئی۔ ابتداءً اس قوم کے لوگ شاید یونانیوں کے مقابلے میں اقلیت ہی میں ہوں گے لیکن چونکہ یہ لوگ ترکیّہ کے مقبوضہ علاقے کا حکمران طبقہ تھے، اس لیے ان کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ اس کی وجہ غالبًا یہ تھی کہ پرانی آبادی کے بہت سے اجزا، جن کا تعلّق اپنے روحانی مرکز قسطنطینیہ سے منقطع ہو چکا تھا، اس روحانی تنہائی کو محسوس کرنے لگے تھے؛ لہٰذا دینِ اسلام قبول کر کے وہ ترکوں کے رنگ میں رنگ گئے۔ شروع میں اس عمل کی رفتار بہت سست تھی؛ کم از کم جب مارکو پولو ۱۲۷۲ء میں آناطولی میں سے گزرا تو یہاں کے باشندوں نے بظاہر ابھی ترکوں کے طور طریقے اختیار نہیں کیے تھے (قب

Die Türken und das Osmanische :E. Oberhummer *Reich*، لائپزگ ۔ برلن ۱۹۱۷ء، ص ۴۲)۔ دوسری جانب قسطنطنیہ کی بطریقی (Patriarchate) کے وثائق سے، جیسا کہ واختر (A. Wächter) نے بتایا ہے (دیکھیے *Der Verfall des Griechentums in Kleinasien im XIV. Jahrhundert*، لائپزگ ۱۹۰۳ء)، صاف طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ بالخصوص چودھویں صدی میں جب ترک بیش از پیش تعداد میں آناطولی میں آباد ہوگئے تو صحیح العقیدہ کلیسا (آرتھوڈوکس چرچ) کا اثر بتدریج زائل ہوتا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس سرزمین کے یونانی خصائص بھی بتدریج گم ہوگئے۔ اس کی وجہ ایک طرف تو یہ ہوسکتی ہے کہ ترکی قبضے کے بعد یونانی نقلِ مکان کرنے لگے لیکن دوسری طرف یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ ترکوں میں جذب ہوتے گئے۔ یہاں دو قسم کے علاقوں کے درمیان امتیاز کرنا ضروری ہے، یعنی ایک تو وہ علاقے، جن میں مدّت مدید سے یونانی باشندے آباد تھے، مثلاً مغربی آناطولی کے ساحلی علاقے، جو یونانی تمدّن اور دینِ مسیحی سے سختی اور اصرار کے ساتھ چمٹے رہے (یہی حال ان علاقوں، مثلاً طربزون، کا تھا جہاں یونانیوں کی حکومت دیر تک قائم رہی)، دوسرے وسطی آناطولی کے علاقے جنھوں نے محض سطحی طور پر یونانی تہذیب اور عیسائی مذہب کو قبول کر رکھا تھا (بالخصوص شمال مشرقی آناطولی میں، جہاں ایرانی مغول، یعنی ایلخانی، جنھوں نے خود بھی غازان [رک بآن] ہی کے وقت سے دینِ اسلام قبول کیا تھا، کچھ عرصہ تک نومسلموں کے سچّے جوش و جذبے کے ساتھ حکمرانی کرتے رہے)۔ آناطولی میں عیسائیت کو تیمور کے ہاتھوں سخت صدمہ پہنچا۔ اس نے یہاں کی عیسائی آبادی کو ــ اور سب جگہوں کی طرح جہاں وہ نمودار ہوا ــ اپنی صلابت اور شدّت کا احساس مخصوص تندی کے ساتھ کرایا۔

آناطولی میں عیسائیوں کی حالت سلطان محمد ثانی کے عہد میں بہتر ہوگئی جبکہ اس نے سیاسی اغراض کی بنا پر، قسطنطنیہ کی فتح کے بعد، کلیسائے یونان کو عثمانی مملکت میں ایک محفوظ مقام دے دیا اور سنّی اسلام کے پہلو بہ پہلو اُسے اپنی سلطنت کا دوسرا ستون بنا لیا۔ اس طرح آناطولی کے عیسائی فرقوں، یعنی یونانی (رک بہ روم، در آآا) اور ارمنی (رک بہ اَرُمنیہ، در آآا) عیسائیوں کو اپنے روحانی انقطاع سے نجات مل گئی اور انھوں نے آج تک اپنی حیثیت قائم رکھی ہے۔ ملّتوں [رک بہ ملّت] کے اس نام نہاد نظام نے، جس کی رُو سے سلطنتِ عثمانیہ میں بسنے والی غیر مسلم مذہبی جماعتوں کو خاصی حد تک داخلی آزادی حاصل ہوگئی تھی، انھیں مزید کمی سے بچا لیا۔ اس طرح اس سلطنت کے زمانۂ عروج میں ایسا تصفیۂ عارضی اور قرارِ موقّت وجود میں آگیا جو مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے لیے عادلانہ تھا۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی میں آناطولی کی ہیلینیت کا مثبت طور پر احیائے جدید ہوا اور انیسویں صدی تک بھی ارمنوں کو "ملّت صادقہ" (یعنی سلطنت کی وفادار قوم) کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ بہ حیثیت مجموعی مذہبی اور لسانی علاقے ایک دوسرے پر منطبق تھے، سوائے وسطی آناطولی (قونیہ اور قیصری) کے جہاں یونانیوں نے میل ملاقات کے لیے اور گھریلو زبان کے طور پر ترکی زبان (کسی حد تک یونانی رسم خط میں) اختیار کر لی تھی۔ ارمنوں نے بھی میل ملاقات کے لیے زیادہ تر ترکی زبان (جزوی طور پر ارمنی رسم الخط میں) اختیار کر لی، اگرچہ اپنے گھروں کے اندر انھوں نے ارمنی زبان، جو ان کی کلیسیائی زبان تھی، قائم رکھی۔

ترک باشندوں کے علاوہ، خواہ وہ شہروں میں رہنے والے ہوں یا دیہاتی کسان، آناطولی میں کچھ صحرا گرد اور نیم صحرا گرد عناصر، نیز خانہ بدوش چرواہے، بھی موجود ہیں یا پہلے تھے۔ یہ لوگ مذہبًا مسلمان لیکن نسلی اور لسانی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان میں ترک، کُرد اور چرکس شامل ہیں۔ جہاں تک ترکوں (یعنی نام نہاد یورُکوں [رک بہ یوُرُوک] اور ترکمانوں [رک بہ ترکمان] کا تعلّق ہے) ان کی اصل معرضِ بحث میں ہے۔ وہ شاید ایسے ترکمان ہیں جنھوں نے خانہ بدوشوں کی زندگی ترک نہیں کی یا مختلف نسلوں کے باقی ماندہ لوگ ہیں جو مستترک ہوگئے اور جنھوں نے ترکی تمدّن اختیار کر لیا۔ مذہبًا یہ لوگ زیادہ تر "عَلَوِی" ہیں، یعنی یا تو کسی قسم کی شیعیّت کے معتقد اور یا شیعی رجحانات رکھنے والے ہیں۔ کُرد [رک بآن]، جو بیشتر سنّی المذہب مسلمان ہیں، جنوب مشرقی صوبوں میں ایک محدود اور بستہ رقبے کے اندر بود و باش رکھتے ہیں۔ آخر میں چرکس [رک بآن] (Circassians) ہیں۔ یہ زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو قفقاز میں روسی عیسائیوں کا اقتدار قائم ہو جانے پر وہاں سے نقلِ مکان کر کے آناطولی چلے آئے۔ ان کے علاوہ ترکی میں ہر جگہ اکثر باز آمدہ مہاجر بھی ملتے ہیں، جو بالخصوص جزیرہ نمائے بلقان سے ہجرت کر کے آئے ہیں، کیونکہ انھوں نے کسی ملک میں عیسائیوں کے زیرِ حکومت رہنے پر دارالاسلام ترکی میں نیا وطن بنا لینے کو ترجیح دی؛ لیکن یہ مہاجرین خانہ بدوش نہیں ہیں بلکہ ان شہروں اور دیہات کی آبادیوں میں جذب ہوگئے ہیں جہاں انھوں نے سکونت اختیار کر لی ہے۔

انیسویں صدی عیسوی میں جب یورپ کی طاقتوں نے ترکی کے معاملات میں دخل دینا شروع کیا تو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی خوشگوار تعلّقات بگڑ گئے۔ روس کی حکومت نے کُوچُوک قَینَارجَہ کے معاہدے (۱۷۷۴ء) کی بنا پر ترکی میں صحیح العقیدہ کلیسا کے عیسائی باشندوں کے محافظ ہونے کا دعوٰی کیا اور ان میں ترکوں کے خلاف معاندانہ جذبات پیدا کر دیے۔ قومیّت کا جو تصوّر مغربی یورپ سے آیا تھا، وہ عیسائی آبادی کے دلوں میں گھر کرنے لگا۔ ترکوں کی طرف سے اس کا ردِّ عمل یہ ہوا کہ وہ اس قسم کے عیسائیوں کو ناپسند کرنے لگے اور یہ جذبہ جلدی ہی نفرت میں تبدیل ہوگیا۔ اس نفرت کا اثر سب سے زیادہ ارمنوں پر پڑا کیونکہ روسیوں کے ہمسائے ہونے کی حیثیت سے ان پر خاص طور سے روس کے آلۂ کار اور نوکر ہونے کا شبہہ کیا گیا۔ برلن کے معاہدے (۱۸۷۸ء) میں جو اصلاحات مذکور تھیں، انھیں عملی جامہ پہنانے پر اصرار ۱۸۹۴ - ۱۸۹۶ء میں کُردوں کے ساتھ [ارمنوں کے] تصادم کا باعث ہوا۔ پہلی جنگِ عظیم میں قفقاز کی

روسی افواج نے وان کے علاقے میں پیش قدمی کی جس کے دوران میں (ترکوں کے خیال میں) ارمنوں نے اپنے ملک سے غدّاری کی۔ ارمنستان کی ساری آبادی جبرًا عراق میں منتقل کر دی گئی اور ان میں سے بہت سے لوگ تلف ہوگئے۔ باقی نے جنگ کے بعد مہاجرت اختیار کی۔ ۱۹۱۹ء میں یونانیوں سے جنگ چھڑ گئی اور یونانیوں نے، جنھیں برطانیہ عظمٰی کی امداد حاصل تھی، ۱۹۲۱ء میں سمرنا [اِزْمیر] پر قبضہ کرلیا اور دریاے سَقارْیا تک بڑھتے چلے گئے۔ ترکوں نے (غازی) مصطفٰی کمال پاشا کی قیادت میں یونانی افواج کو شکست دی اور وہ آناطولی سے پسپا ہوگئیں۔ یونانی آبادی کا بیشتر حصّہ بھی ان افواج کے ساتھ چلا گیا؛ باقی ماندہ یونانیوں کا ایک معاہدے کے ذریعے (۳۰ جنوری ۱۹۲۳ء) یونان کے مسلمان باشندوں سے تبادلہ کر لیا گیا (سواے استانبول کے یونانی باشندوں اور مغربی تھریس [تراکیا] کے مسلمانوں کے)۔ اس عمل کی بدولت آناطولی نوے فیصد ترکی اور نناوے فیصد مسلمان ملک بن گیا۔ سرحدِ شام کی عرب آبادی کے سوا غیر ترکی قلیل اور منتشر مسلم آبادیاں کسی غیر معیّن عرصے تک مشکل ہی سے ترکی اثرات کا مقابلہ کرسکیں گی۔ کُردوں میں، جن کی اپنی ثقافتی روایات کچھ نہیں ہیں، فوجی ملازمت سے اور مکاتب کے اثر سے بھی، تدریجی استتراک کی توقّع کی جاسکتی ہے۔

[انیسویں صدی کے خاتمے کے متعلّق آبادی کے اعداد و شمار کے نقشے اور متعلّقہ جزئیات بنظر اختصار حذف کیے گئے۔ ادارہ].

۱۹۴۵ء کی سرشماری کی کل میزان ۱,۸۷,۹۰,۱۷۴ اور ۱۹۵۰ء کی آبادی ۲,۰۹,۳۴,۶۷۰ ہے: ۱۹۴۵ء میں یورپی ترکی اور آناطولی کے اعداد علی الترتیب ۱۴,۹۶,۶۱۲ اور ۱,۷۲,۹۳,۵۶۲ ہیں اور ۱۹۵۰ء میں یہ اعداد علی الترتیب ۱۵,۹۸,۲۵۵ اور ۱,۹۳,۳۶,۴۱۵ ہیں.

بعض شہروں کے متعلّق ۱۹۵۰ء کے صحیح اور معیّن اعداد موجود ہیں۔ ان کے مطابق ترکی میں پانچ شہر ایسے ہیں جن کی آبادی ایک لاکھ سے زائد ہے، یعنی استانبول (۱۰,۰۰,۰۲۲)، اَنقرہ (۲,۸۶,۷۸۱)، اِزْمیر (۲,۳۰,۵۰۸)، آدَنَہ (۱,۱۷,۷۹۹) اور بُرُوسَہ (۱,۰۰,۰۰۷)۔ حسبِ ذیل چھے شہر ایسے ہیں جن کی آبادی پچاس ہزار اور ایک لاکھ کے درمیان ہے، یعنی اِسکی شہر (۸۸,۴۵۹)، غازیان تپ (۷۲,۷۴۳)، قیصِری (۶۵,۴۸۹)، قونیہ (۶۴,۵۰۹)، اِرضُ روم (۵۴,۳۶۰)، سِیْواس (۵۲,۲۶۹).

۱۹۴۵ اور ۱۹۵۰ء سے متعلّق شہری اور دیہاتی آبادی کی تقسیم کے بارے میں بھی اعداد موجود ہیں، اس مادّے کے لیے ان دنوں کی فیصد شرح حسبِ ذیل نکالی گئی ہے:

	۱۹۴۵ء			۱۹۵۰ء		
شہروں میں	۴۶,۸۷,۱۰۲	:	۲۵ء۰۶ فی صد	۵۲,۶۷,۶۹۵	:	۲۵ء۱۶ فی صد
دیہات میں	۱,۴۱,۰۳,۰۷۲	:	۷۴ء۹۴ فی صد	۱,۵۶,۶۶,۹۷۵	:	۷۴ء۸۴ فی صد
	۱,۸۷,۹۰,۱۷۴	:	۱۰۰ء۰۰ فی صد	۲,۰۹,۳۴,۹۷۵	:	۱۰۰ء۰۰ فی صد

ترکیّہ کا کل رقبہ ۷,۶۷,۱۱۹ مربّع کیلومیٹر ہے۔ اس آبادی کو سارے رقبے پر پھیلایا جائے تو ۱۹۴۵ء میں آبادی کی اوسط ۲۴ء۴۹ فی مربّع کیلومیٹر اور ۱۹۵۰ء میں ۲۷ فی مربّع کیلومیٹر بنتی ہے۔ شہری اور دیہاتی آبادی کی شرح فی صد (مجموعی طور پر نیز الگ الگ ''ولایتوں'' کے بارے میں) سرکاری کاغذات کی رُو سے صرف ۱۹۳۵ء ہی کے متعلّق مل سکتی ہے۔ اس کے مطابق ۲۳ء۵ فی صد آبادی شہروں میں اور ۷۶ء۵ فی صد دیہات میں تھی۔ ان اعداد کے سلسلے میں یہ یاد رہنا چاہیے کہ ۱۹۳۰ء کے قانون کے مطابق ہر اس مقام کو، جہاں میونسپل نظم و نسق (''بِلَدِیّہ تَشْکِیلاتی'') موجود ہے، شہر شمار کیا جاتا ہے۔ [اسی قانون کی رُو سے] ایسا ادارہ دو طرح کے تمام مقامات میں قائم کیا جانا ضروری ہے: ایک تو اُن میں جن کی آبادی ۲ ہزار نفوس سے زائد ہو، دوسرے (بلالحاظ اس حدِ اقلّ کے) ہر اس مقام میں جو کسی قضا کا مرکز ہو (جن میں بعض کی آبادی بہ مشکل پانچ سو ہوگی)؛ گویا مغربی معیاروں سے دیکھا جائے تو دیہاتی آبادی کا فی صد تناسب اَور بڑھ جائے گا۔ لوئیس (H. Louis) نے اپنی تصنیف *Die Bevölkerungskarte der Türkei* (برلن ۱۹۴۰ء) کو ترکیّہ میں ۱۹۳۵ء کی شائع شدہ سرشماری پر مبنی کیا ہے۔ اس کے نقشے سے یہ پتا چل سکتا ہے کہ آناطولی میں سب سے زیادہ گنجان آبادی والے علاقے تین ہیں: (۱) مغربی آناطولی کے ساحلی علاقے اور دریاؤں کی وادیاں جو اندرون ملک میں چلی گئی ہیں (خصوصًا میانڈر (Maeander) یعنی بوٗیوٗک مِنْدِرِس چای کی وادی)؛ (۲) بحیرۂ اسود کا ساحلی رقبہ؛ (۳) کِلِیکِیہ، حاطای (Hatay) کی نئی سنجاق اور دریاے فرات کی طرف میدان، جو جغرافیائی اعتبار سے شمالی شام کا حصّہ ہے۔ اس کے

مقابلے میں وسطی آناطولی (جس میں بے درخت میدان ہیں) اور شمال مشرق کے کوہستانی اقطاع آبادی کی گنجانی کے اعتبار سے سب علاقوں سے کم ہیں۔ تقسیم آبادی کی یہ کیفیت ملک کی ہیئت طبیعی کا نتیجہ ہے اور غالبًا ہمیشہ، کم از کم ازمنۂ وسطی سے اب تک، کم و بیش ایسی ہی چلی آ رہی ہے اور قیاس یہ ہے کہ۔کم از کم مستقبلِ قریب میں ــ اسی طرح رہے گی۔ مذہبی اور لسانی تقسیم کے اعداد صرف ۱۹۴۵ء کی سرشماری میں مل سکتے ہیں (۲۱ اکتوبر ۱۹۴۵ء گینل نُفُوس صایمی، *Recensement général de la population du, 21 October, 1945*،تورکیہ نُفُوسی، *Population de la Türquie*، ج۶۵، انقرہ ۱۹۵۰ء)۔ ان اعداد و شمار کی رُو سے ترکی کو لسانی اعتبار سے یوں تقسیم کیا جا سکتا ہے:-

وہ باشندے جن کی مادری زبان ترکی ہے:	۱,۶۵,۹۸,۰۳۷	:	۸۸ء۳۴ فی صد
وہ باشندے جن کی مادری زبان ترکی کے علاوہ کوئی اور ہے:	۲۱,۹۲,۰۰۲	:	۱۱ء۶۶ فی صد
نامعلوم:	۱۳۱		
میزان	۱,۸۷,۹۰,۱۷۴	:	۱۰۰ فی صد

آبادی بہ لحاظ مذاہب:

دینِ اسلام کے پیرو:	۱,۸۴,۹۷,۸۰۱	:	۹۸ء۴۵ فی صد
غیر اسلام مذاہب کے پیرو:	۲,۹۲,۱۵۲	:	۱ء۵۵ فی صد
نامعلوم مذہب والے:	۲۲۱		
میزان:	۱،۸۷،۹۰،۱۷۴	:	۱۰۰ فی صد

غیر مسلموں کی تقسیم بصورت ذیل تھی:

عیسائی:	۲,۰۲,۰۴۴	:	۶۹ء۱۶ فی صد
یہودی:	۷۶,۹۶۵	:	۲۶ء۳۴ فی صد
لامذہب:	۵۶۱	:	۰ء۱۹ فی صد
دیگر مذاہب کے پیرو:	۱۲,۵۸۲	:	۴ء۳۱ فی صد
میزان:	۲,۹۲, ۱۵۲	:	۱۰۰ فی صد

جب ان تخمینی اعداد و شمار کا مقابلہ ان اعداد سے کیا جائے جو کُوینِے (Cuinet) نے گزشتہ صدی کے آخر کے متعلّق دیے ہیں تو بہت بڑا تغیّر نظر آتا ہے جس کا باعث وہ واقعات ہیں جو پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں اور اس کے کچھ عرصے بعد رونما ہوئے۔

مذہب اور زبان دونوں کے اعتبار سے تقسیمِ آبادی کے متعلّق زیادہ مفصّل معلومات مندرجۂ ذیل گوشوارے سے معلوم ہو سکیں گی جو صفحہ ۱۷۳ پر مختصر شکل میں نقل کیا جا رہا ہے:

زبان	مسلمان	کیتھولک عیسائی	صحیح العقیدہ (آرتھوڈوکس) عیسائی	پروٹسٹنٹ	متبعین [پوپ] گریگوری	نامعلوم فرقوں کے عیسائی	یہودی	لامذہب	دیگر مذاہب کے لوگ	نامعلوم	میزان
ترکی	۱,۶۵,۴۶,۶۸۱	۴,۹۵۵	۱۰,۷۰۵	۱,۰۹۹	۱۷,۵۸۱	۳,۸۴۷	۱۱,۸۳۶	۲۹۸	۱,۰۱۷	۱۸	۱,۶۵,۹۸,۰۳۷
کردی	۴,۶۹,۵۷۰	۲۲	۵۷	۱۴	۴۳	۱۶	۲۳	۹	۵,۲۰۸	۳	۱۴,۷۶,۵۶۲
عربی	۲,۳۵,۲۶۸	۹۶۴	۱,۰۷۷	۶۵۷	۹۲	۶۱۷	۱,۰۲۷	۱	۱,۵۱۷	۳	۲,۴۷,۲۰۴
یونانی	۹,۸۹۸	۴,۵۴۶	۷۳,۰۸۳	۶	۱۷۷	۴۶۰	۲۹۰	۲	۸۰	۳	۸۸,۶۸۰
چرکسی	۶۶,۶۸۱	۱	۵	—	—	۳	۱	—	—	—	۶۶,۶۹۱
ارمنی	۳,۳۹۶	۲,۲۹۵	۲,۸۸۰	۹۷۹	۴۲,۰۱۹	۴,۳۰۱	۱۲۴	۴۰	۱۳۶	۹	۵۶,۱۷۹
یدش* (yiddish)	۶۰۲	۲۲	۵۷	۱۴	۴۳	۱۶	۵۰,۲۱۶	۵	۴۲	۲	۵۱,۰۱۹
لاز	۴۶,۹۷۹	۲	۳	—	—	—	۳	—	—	—	۴۶,۹۸۷
گرجستانی	۳۹,۸۷۰	۲۱	۲۳	—	—	۱	۱۵۹	—	—	۲	۴۰,۰۷۶
دیگر زبانیں: البانوی، بوسنوی، عبری۔ہسپانوی (Judaeo-Spanish)، تاتاری وغیرہ	۷۸,۴۴۷	۱۱,۲۱۴	۱۹,۹۵۱	۲,۳۴۲	۳۰۵	۱۰,۷۱۲	۱۳,۲۸۶	۱۹۶	۴,۵۸۲	۱۸۱	۱,۱۸,۶۰۸
نامعلوم	۴۷	۸	۴	۲	—	۷۰	—	—	—	—	۱۳۱
میزان	۱,۸۴,۹۷,۸۰۱	۲۱,۹۵۰	۱,۰۳,۸۳۹	۵,۲۱۳	۶۰,۲۶۰	۱۰,۷۸۲	۷۶,۹۶۵	۵۶۱	۱۲,۵۸۲	۲۲۱	۱,۸۷,۹۰,۱۷۴

* مشرقی یورپ کے یہودیوں کی زبان، جو قرونِ متوسطہ کی آلمانی سے ماخوذ ہے، جس میں بہت سے عبرانی الفاظ بھی ہیں۔

جہاں تک لسانی تقسیمات کے مجموعی اعداد کا تعلّق ہے اُن اعداد و شمار سے، جو الگ الگ 'ولایتوں' کے بارے میں مہیّا کیے گئے ہیں، یہ باتیں ظاہر ہوتی ہیں (یہاں بھی تخمینی اعداد ہی دیے گئے ہیں): کُردی زبان بولنے والے لوگ جنوب مشرقی ولایتوں میں باہم رہتے ہیں اور گنجان طور پر آباد ہیں اور حسبِ ذیل ولایتوں میں بڑی اکثریت میں ہیں: آغری (اسّی ہزار)، بِنگول (بیالیس ہزار)، بِتلیس (تینتالیس ہزار)، دیار بکر (ایک لاکھ اسّی ہزار)، ہکّاری (تیس ہزار)، ماردِین (ایک لاکھ پچپن ہزار)، مُوش (ترپین ہزار)، سِعرد (ایک لاکھ) اور وان (اٹھتر ہزار)۔ حسبِ ذیل ولایتوں میں ان کی تعداد ترک آبادی سے کسی قدر زیادہ ہے: تُنجلی (اڑتالیس ہزار) اور اُورفہ (ایک لاکھ تیئیس ہزار) کیونکہ ان ولایتوں میں ترکوں کی آبادی بالترتیب تینتالیس ہزار اور ایک لاکھ تین ہزار ہے مگر ولایات اِلازِغ (بیاسی ہزار)، قارص (چھیاسٹھ ہزار) اور مَلَطِیّہ (ایک لاکھ اکتالیس ہزار) میں اُن سے ایک بڑی اقلیت متشکّل ہوتی ہے۔

عربی بولنے والے لوگ کُردوں کے مقابلے میں ہر جگہ کم تعداد میں ہیں، مثلاً ماردِین میں ان کی تعداد ساٹھ ہزار اور کُردوں کی تعداد ایک لاکھ پچپن ہزار ہے لیکن ترکوں کے مقابلے میں وہ اکثریت میں ہیں کیونکہ ترکوں کی تعداد اس ولایت میں صرف پندرہ ہزار ہے۔ اُورفہ کی ولایت میں عربی بولنے والے چالیس ہزار، کُرد ایک لاکھ تیئیس ہزار اور ترک ایک لاکھ پانچ ہزار ہیں۔ حاطای (Hatay) کی ولایت میں، جہاں عربوں کے سب سے زیادہ افراد آباد ہیں، ان کی تعداد ایک لاکھ ہے مگر ترکوں کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار ہے۔ ترکوں کی قلیل ترین آبادیاں ماردین اور سِعرد کی ولایتوں میں (ہر ایک میں تقریباً پندرہ ہزار) اور ہکاری میں (چار ہزار) پائی جاتی ہیں۔ یونانی، اَرمَنی اور یہودی (ان میں تقریباً دس ہزار وہ بھی شامل ہیں جو عبری۔ ہسپانوی زبان بولتے ہیں) تقریباً سب کے سب صرف استانبول کی ولایت میں آباد ہیں۔ چَناق قلعہ میں تقریباً سات ہزار یونانی اور اِزمیر میں تقریباً بارہ ہزار یہودی آباد ہیں؛ ان کے علاوہ دیگر مقامات پر نہایت ہی چھوٹی چھوٹی جماعتیں پائی جاتی ہیں۔ دوسرے چھوٹے چھوٹے نسلی گروہ بھی ہیں، مثلاً چرکس (جن کی بیشتر تعداد قیصری کی ولایت میں ہے)، لاز (Lazes) اور گرجستانی (یہ دونوں گروہ خاص طور پر بحیرۂ اسود کے مشرقی ساحلی اضلاع میں آباد ہیں) مگر ان سب جگہوں میں ترکوں کے مقابلے میں ان سے چھوٹی چھوٹی اقلیتیں ہی متشکّل ہوتی ہیں۔

مذاہب کے لحاظ سے آبادی کی تقسیم بھی بہت پُراز معلومات ہے لیکن سب سے زیادہ قابلِ توجّہ امر یہ ہے کہ اُن سب لسانی گروہوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا ہے جن کی مادری زبان ترکی ہے۔ دینِ اسلام کے سلسلے میں شیعہ اور سنّی کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں رکھا گیا لیکن جو لوگ ''دوسرے فرقوں'' کے خانے میں درج کیے گئے ہیں، ان میں (معدودے چند غیر معمولی عقائد رکھنے والے غیر ملکیوں کے سوا) زیادہ تر وہ کُرد (غالباً غالی شیعہ یا یزیدی) ہیں جو یا تو خود ہی اپنے کو اسلام کا پیرو شمار نہیں کرتے یا جنھیں سنّی اور معتدل شیعہ [اثنا عشریہ] مسلمان نہیں مانتے۔ جن لوگوں نے اپنی مادری زبان گُرجی یا گُرجستانی لکھائی ہے وہ لاز (Lazes) ہیں نہ کہ حقیقی گُرجستانی (جو مذہباً عیسائی ہیں) اور اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کی اکثریت نے اپنا مذہب اسلام لکھایا ہے۔ ''دیگر زبانوں'' کے خانے میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں کی بڑی تعداد صریحاً غیر ملکیوں سے متعلّق ہے۔ ''دیگر زبانوں'' کے تحت یہودیوں کی وہ تعداد (۱۰٬۸۶۶) بھی شامل ہے جو عبری۔ ہسپانوی زبان بولتے ہیں۔ قبطی [یا چنگانہ]، جن کی تعداد کُوینے (Cuinet) نے خاصی بڑی، یعنی چالیس ہزار دکھائی ہے، موجودہ اعداد و شمار سے یکسر غائب ہوگئے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ ان لوگوں سے مختلف زبان نہیں بولتے جن کے درمیان وہ رہتے ہیں اور نہ ان سے الگ مذہب رکھتے ہیں، لہٰذا ہم فرض کر سکتے ہیں کہ وہ اعداد و شمار کے اَور مختلف گروہوں میں شامل کر لیے گئے ہیں اور علیحدہ نام سے مذکور نہیں ہوے۔

(۵) ذرائع آمد و رفت کی ترقی:

چونکہ آناطولی کم آباد جزیرہ نما ہے، جس کے وسط میں بے درخت میدانوں کا علاقہ ہے اور ساحل پر معدودے چند ہی قابلِ استعمال بندرگاہیں ہیں، لہٰذا یہاں آمد و رفت زیادہ نہیں ہے۔ استانبول سے مشرق کی طرف لمبے سفر کرتے وقت عموماً آناطولی کو ایک طرف چھوڑ دیا جاتا ہے اور خشکی کے دشوار گزار راستوں پر ساحلِ سمندر کے ان سہل تر راستوں کو ترجیح دی جاتی رہی ہے جو یا تو بحیرۂ اسود کی بندرگاہ طرَبزُون تک جاتے ہیں یا ازمنۂ وسطٰی میں آیاس تک جاتے تھے، جو دریاے جَیحان کے دہانے پر واقع تھا، یا عثمانیوں کے عہد میں پیاس تک، جو خلیج اِیسُوس (Issus) پر واقع ہے، اور یا زمانۂ حال میں اِسکندرُون (Alexandretta) تک جاتے ہیں۔ قرنہا قرن تک بڑے بڑے کاروانی راستے انھیں بندرگاہوں سے اندرونِ ایشیا کی طرف جاتے رہے۔ آناطولی کی اندرونی آمد و رفت عموماً صرف مقامی اہمیّت رکھتی تھی، تاہم یہاں ایک سرے سے دوسرے تک جانے والی سڑکیں ہمیشہ سے موجود تھیں جو بالعموم استانبول سے آتی یا استانبول تک جاتی تھیں (جو اُس زمانے میں بھی بلا اختلاف مرکزِ سلطنت مانا جاتا تھا جب کہ آناطولی میں اسے سیاسی صدر مقام نہیں سمجھا جاتا تھا)۔

ترکوں کے عہد میں تین مختلف قسم کی اندرونی شاہراہوں کا پتہ چلتا ہے: (۱) فوجی سڑکیں؛ (۲) کاروانی راستے؛ (۳) ڈاک کے راستے۔ تینوں قسم کے راستے ملک کی طبیعی حالت کے مطابق بنے ہوے ہیں اور اندرونی بے درخت میدانوں سے اینچ پینچ کے ذریعے بچتے ہوے نواحی علاقوں میں سے گزرتے ہیں لیکن ملک کے سرحدی پہاڑوں کے اندر ہی رہتے ہیں۔ ان راستوں کے بنانے میں بے درخت میدانوں کے کناروں کو ترجیح دی گئی ہے کیونکہ وہاں مویشی چر سکتے ہیں اور شہر اور قصبے آباد ہیں۔ یہ سب راستے قریب قریب ایک ہی خطوط پر جاتے ہیں، اگرچہ یہ خطوط ایک دوسرے پر منطبق نہیں ہوتے۔

بڑی فوجی سڑک (جس پر سے ترکی سلاطین کی فوجیں سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں ایران اور قفقاز کی مہموں پر جاتے ہوے گزرتی تھیں) وسطی آناطولی کے بے درخت میدان کے جنوب میں ایک بڑی قوس کی شکل بناتی تھی۔ وہ اسکودار [اشقودرہ] سے اِزْمید، اِسکی شہر، اور آق شہر سے گزرتی ہوئی قونیہ تک اور قونیہ سے اِرِگلی، نِگدِہ، قیصری میں سے ہوتی ہوئی سیوٰاس تک اور وہاں سے براہِ اِرْزِنجان واِرضِ روم مشرق کی سمت جاتی تھی۔ سلیم اوّل نے جب شام پر چڑھائی کی تو وہ بھی پہلے قیصری گیا تھا اور وہیں سے طاوروس قہقرائی (Anti-Taurus) کے پہاڑوں میں سے گزرتا ہوا اِلبِستان اور مَرعَش تک پہنچا تھا۔ اِرِگلی سے جو راستہ کِلِیکِیا کے درّے (گُولِک بوغازِی) سے گزر کر اَدَنَہ کو اور وہاں سے آگے شام کے اندر تک جاتا تھا، اس سے عام طور پر اجتناب کیا جاتا تھا، خصوصًا دشوار حمل ونقل کے لیے اور بالخصوص اس لیے کہ گُولِک بوغازی آسانی سے بند ہوسکتا ہے، مثلًا مراد چہارم کو ۱۶۳۸ء میں تسخیر بغداد کے لیے جن توپوں کی ضرورت تھی، اس نے انھیں بحری راستے سے پَیَاس تک پہنچایا اور یہاں سے خشکی کے راستے بھینسوں کے ذریعے آگے بھیجا۔ شمالی کاروانی راستہ (جس کا ذکر آگے آئے گا) فوج کے صرف چھوٹے دستوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ شہنشاہی افواج کے اطلاع ناموں میں اکثر اُن چھاؤنیوں کے نام مذکور ہیں جو اس بڑی فوجی سڑک پر واقع تھیں لیکن یہ چھاؤنیاں اکثر ان مقامات سے خاصی دور ہیں جو سڑک کے کنارے آباد ہیں۔

کاروانی راستوں میں سے اہم ترین راستہ وہ ہے جو اشقودرہ سے اُریبی خط میں گِبْزِہ [گکبوزہ] جاتا ہے اور پھر خلیج اِزْمید کو عبور کرنے کے بعد ذیل سے اِزْنیق کو چلا گیا ہے اور یہاں سے کم وبیش فوجی سڑک کے ساتھ ساتھ اِسکی شہر کے راستے قونیہ اور اِرِگلی تک جا پہنچتا ہے، پھر وہاں سے باب کِلِیکِیا (گُولِک بوغازی) میں سے ہوتا ہوا آطَنَہ اور وہاں سے آگے شام یا الجزیرہ کو چلا گیا ہے۔ جو راستہ آنطاکیہ سے ہوکر شام کو جاتا ہے، وہ ان حاجیوں کا راستہ بھی تھا جو (دمشق ہوکر) اسلامی حرمین شریفین، یعنی مکّے اور مدینے کو جاتے تھے اور اس حیثیت سے اس کا ذکر اکثر ہوتا رہا ہے۔ مشرق کو جانے کے لیے ایک شمالی کاروانی راستہ بھی کسی قدر اہم ہے جو اشقودرہ سے اِزْمید، بُولی (Boli)، اور طَوسِیَہ (Ṭosya) کے راستے اَماسِیَہ کو جاتا ہے (یا اَماسیہ کو ایک طرف چھوڑتے ہوئے، نِکسار کے راستے) اور وہاں سے اِرْزِنجان، اِرضِ روم اور آگے مشرق کو نکل جاتا ہے یا اس کے متبادل طور پر اَماسیہ سے تُوقات، سِیواس اور مَلَطِیَہ کی راہ سے دیارِ بکر اور اس سے آگے موصل اور بغداد تک پہنچتا ہے۔ اشقودرہ سے آگے اس راستے کو 'بغداد یُولُو' (بغداد کے راستے) کا نام دیا جاتا ہے۔ اس راستے سے ذرا مختلف ایک قدیم راستہ، جسے بُسبِک (Busbecq) نے ۱۵۵۵ء میں استعمال کیا تھا، اُریبی خط والے مذکورۂ بالا راستے کے ساتھ ساتھ اِسکی شہر تک جاتا اور وہاں سے براہِ اَنقرہ اَماسیہ کو جا نکلتا ہے۔ آخر میں شمالی۔جنوبی راستہ، جو وسطی آناطولی کے بے درخت میدان سے پہلو بچاتا ہوا مشرق کو جاتا ہے، کسی قدر اہم ہے۔ سلجوقی عہد میں یہ راستہ دارالحکومت قونیہ سے نکل کر بے درخت میدان کو قطع کرتا ہوا خوش منظر سلطان خان اور آق سرای سے گزر کر قیصری اور آگے سِیواس تک جاتا تھا جہاں وہ شمالی راستے نیز مشرق (اِرْزِنجان اور اِرضِ روم) کو جانے والی شاہراہوں سے جا ملتا تھا۔ قرہ مانیوں اور عثمانیوں کے عہد میں یہ راستہ طاوروس کے دامن کے مقامات، لارَنْدَہ (قرہ مان) یا اُلُوقِیشلَہ سے براہِ نِگدِہ قیصری تک جا نکلتا تھا۔ مغربی آناطولی میں صرف وہ سڑکیں بظاہر کچھ مقامی اہمیّت رکھتی تھیں جو اِزْمیر سے نکلتی تھیں۔ ان کا ذکر بہت کم آیا ہے۔

ڈاک کے راستے: یہ بھی کاروانی راستوں کی طرح، تین ''بازووں'' میں منقسم تھے (ترکی اصطلاح ''قُول'' کے لیے، جسے اِداری زبان میں اصطلاحی مفہوم میں بھی استعمال کیا جاتا ہے، قب (۱) Redhouse: *A Turkish and English Lexicon*، ۱۹۴۲ء؛ (۲) H. W. Duda: *Balkantürkische Studien*، وی اِنّا ۱۹۴۹ء، ص ۹۸ بعد، تعلیقہ ۸)۔ جہان نُما کے بیان کے مطابق سترھویں صدی میں ان ''بازووں'' میں سے درمیانی ''بازو'' اور یب شاہراہ کی ساری لمبائی پر، اور دمشق تک اس شاہراہ کی تمام شاخوں پر حاوی تھا۔ اسی طرح دایاں ''بازو'' مغربی آناطولی کے تمام شاخ در شاخ راستوں پر اور بایاں ''بازو'' شمالی کاروانی راستے اور بغداد تک اس کی توسیع پر حاوی تھا۔ ڈاک کے راستوں کے متعلّق انیسویں صدی عیسوی کی اطلاعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اریبی راستے سے (مغربی آناطولی کے شاخ در شاخ راستوں سمیت) دایاں 'بازو' اور شمالی کاروانی راستے سے وسطی 'بازو' متشکّل ہوتا تھا۔ اور بایاں 'بازو' تُوقات تک وسطی 'بازو' کے ساتھ ساتھ جاتا تھا اور وہاں سے وہ اِرضِ روم کو جانے والے شاخ در شاخ مشرقی راستوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا تھا۔ انیسویں صدی سے پہلے سڑکوں اور راستوں کے شاخ در شاخ نظام کی اصلاح و ترقّی کے بارے میں قب (۱) تیشنر (F. Taeschner): *Das Anatolische Wegenetz nach Osmanischen Quellen*، لائپزگ ۱۹۲۴ء؛ (۲) وہی مصنّف: *Die Verkehrslage und das Wegenetz Anatoliens im Wandel der Zeiten*، در *Petermanns Geographische Mitteilungen*، ۱۹۲۶ء، ص ۲۰۲-۲۰۶۔

ان راستوں کے لیے ''سڑکوں'' کے لفظ کا استعمال صرف ایک محدود مفہوم میں کیا جاسکتا ہے کیونکہ [اُس زمانے میں] سڑکیں زمین تیار کرکے اور زیر سازی کے بعد نہیں بنائی جاتی تھیں؛ ان مقامات کے سوا، جہاں رومیوں کی سڑکیں ابھی تک قابلِ استعمال تھیں، یہ سب سڑکیں فقط ایسے راستے تھے جو بکثرت استعمال ہوتے رہے تھے اور خوب روندے جاچکے تھے اور جن کے کنارے پر مخیّر اشخاص نے مسافروں کی سہولت کے لیے کاروان سرائیں، کنویں اور پل تعمیر کرادیے تھے۔ سڑکوں کا یہ سہ گانہ نظام اس وقت سے رفتہ رفتہ غیر مستعمل ہوتا جارہا ہے

جب سے کہ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں ریل کی توسیع عمل میں آئی ہے؛ اگرچہ ریل کا راستہ بھی تقریبًا وہی ہے جو ان پرانی سڑکوں کا ہے ـ کم از کم جہاں تک اریبی شاہراہ کا تعلّق ہے، یہی صورت ہے۔

ظاہر ہے کہ ریلوے کی تعمیر سڑکوں کی تعمیر کا بدل نہیں ہو سکتی تھی، لہٰذا سڑکوں کی تعمیر کو بھی ''تنظیمات'' کے وقت سے (ایک حدّ تک) ترقّی دی جاتی رہی ہے (سڑکوں کی تعمیر کے لیے روپیہ فراہم کرنے کے جو ذرائع، یعنی بیگار (Corvée) اور سڑکوں کا محصول (''یوْل پارہ سی'')، اختیار کیے گئے، ان کے لیے دیکھیے G. Young: *Corps de Droit Ottoman*، ۴، اوکسفرڈ ۱۹۰۶ء، ص ۲۴۵ ببعد۔

آناطولی میں ریلوں کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب ۱۸۵۶ء میں ایک برطانوی کمپنی کو سمرنا (اِزمیر) سے آیدین تک ریلوے بنانے کے لیے مراعات دی گئیں۔ اس کے دس سال بعد یہ ریل جاری ہوگئی۔ سلطنتِ عثمانیہ کے آخری تیس چالیس سالوں میں آناطولی میں ریلوں کے حسبِ ذیل حصّے بن چکے تھے:۔

(۱) برطانوی کمپنی کی ریلیں: سمرنا (ازمیر)۔o۔ آیدین ۱۸۶۶ء۔o۔ دینار ۱۸۸۹ء (نیز اس بڑی لائن سے اودمِش، تیرہ، سورکیہ، دِنگزلی اور چوْرِل تک شاخیں)۔o۔ اِگردیر ۱۹۱۲ء؛ (۲) فرانسیسی بلجیکی کمپنی کی ریلیں (۱۸۹۳ء تک برطانوی کمپنی کی): سمرنا (اِزمیر)۔o۔ مَنیسہ۔o۔ قصبہ ۱۸۶۶ء۔o۔ اَلاشہر (۱۸۷۳ء؟)۔o۔ آفیون قرہ حصار ۱۸۹۷ء؛ مَنیسہ۔o۔ سومہ ۱۸۹۰ء بالیکسر۔o۔ باندرمہ ۱۹۱۲ء، (۳) چھوٹی پٹڑی کی ریل: مُدانیہ۔o۔ بُرسہ (بُروسہ) ۱۸۷۵ء، اس لائن کو ایک فرانسیسی بلجیکی کمپنی نے ۱۸۹۲ء میں ازسرِ نو تعمیر کیا (اب یہ لائن مستعمل نہیں)؛ (۴) آلمانی کمپنی (از ۱۸۸۸ء) کی آناطولی ریلوے: (ا) حیدر پاشا۔o۔ اِزمید ۱۸۷۳ء (ایک شاخ آطہ پازاری کو)۔o۔ اِسکی شہر۔o۔ انقرہ ۱۸۹۲ء؛ (ب) اِسکی شہر۔o۔ افیون قرہ حصار (ایک شاخ: اَلایُونت۔o۔ کُوتاہیہ)۔o۔ قونیہ ۱۸۹۶ء؛ بغداد ریلوے: قونیہ۔o۔ بُلغُرلُو ۱۹۰۴ء؛ طوْپراق قلعہ۔o۔ اِسکندرون ۱۹۱۳ء؛ بُلغُرلُو۔o۔ آطنہ۔o۔ طوْپراق قلعہ۔o۔ حَلَب۔o۔ نُصَیبین ۱۹۱۸ء (اور مارْدین تک ایک شاخ)؛ (۵) برطانوی کمپنی: مرسین۔o۔ اَطنہ ۱۸۸۶ء (۱۹۰۶ء میں بغداد ریلوے کمپنی نے لے لی)۔

گویا آناطولی ریلوں کا نظام (ان چھوٹی شاخوں کو چھوڑ کر جو آطنہ اور بُروسہ کو اپنی اپنی بندرگاہوں کے ساتھ ملاتی ہیں) ایک طرف ریلوں کے اس جال پر مشتمل ہے جس کا سرآغاز سمرنا (اِزمیر) سے ہے اور جو مغربی آناطولی کے زرخیز زرعی اضلاع تک پہنچا ہوا ہے اور دوسری طرف ایک اریبی (diagonal) لائن پر، جس کی ایک شاخ اَنقرہ کو جاتی ہے اور جو دارالحکومت کو الجزیرہ، عراق اور شام کے بعید عربی اضلاع سے ملا دیتی ہے۔ بحیرۂ اسود کے علاقے میں اور شمال مشرقی آناطولی میں روسی مخالفت کی وجہ سے ریلوے تعمیر کرنے کے منصوبے قوت سے فعل میں نہ آ سکے۔ موجودہ ریلیں جمہوریۂ ترکیہ کے آغاز، یعنی ۱۹۲۰ء ہی میں قومی ملکیّت بنا لی گئی تھیں (''تورکیہ جُمھُوریتی دوْلت دیمِر یوْل لَری'') اور ریلوے نظام کی توسیع کر کے اسے اَنقرہ پر متمرکز کر دیا گیا ہے۔ یہ توسیع ۱۹۲۲ء ہی سے شروع ہوگئی تھی جب ایک چھوٹی پٹڑی کی لائن اَنقرہ۔o۔ ایرماق۔o۔ یحشی خان ۱۹۲۵ء۔o۔ یرکوری اور ۱۹۲۵ء میں قیصری کی سمت میں بنائی گئی۔ اسے پھر بڑی لائن بنا کر اور وسیع کر دیا گیا۔

اب حسبِ ذیل ریلیں ہیں:۔

(۱) اَنقرہ۔o۔ قیصری ۱۹۲۷ء۔o۔ سِیواس ۱۹۳۰ء۔o۔ اِرزِنجان ۱۹۳۸ء۔o۔ اِرضِ روم ۱۹۳۹ء۔o۔ خراسان ۱۹۵۰ء۔o۔ ساری قَمیش، زیرِ تعمیر؛ یہاں یہ چوڑی لائن کی اُن ریلوں سے مل جائے گی جو روسیوں نے ۱۸۹۶ء میں بنائی تھیں: گمرُو (الیگزانڈروپول، اب لینن آکان Leninakan)۔o۔ قارص۔o۔ ساری قَمیش؛ پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں اس لائن کو ساری قَمیش۔o۔ اِرضُ روم۔o۔ ماما خاتون تک بڑھا دیا گیا؛ (۲) اِیلیجہ (خلیج اِدرِمید میں)۔o۔ پَلاموطلُق (چھوٹی لائن) ۱۹۲۴ء (۱۹۵۳ء سے غیر مستعمل)؛ (۳) فوْزی پاشا (اَطنہ۔o۔ حلب لائن پر)۔o۔ مَلَطیہ ۱۹۳۱ء۔o۔ دِیاربَکر ۱۹۳۵ء (مع ایک شاخ اِلازِیغ کو)۔o۔ قُرتَ الان ۱۹۴۴ء؛ (۴) سَمسُون۔ چارشنبہ (چھوٹی لائن) ۱۹۲۶ء (اب غیر مستعمل)؛ سَمسُون۔o۔ اَماسِیہ۔o۔ سِیواس ۱۹۳۲ء؛ (۵) کُوتاہیہ۔o۔ بالیکسر ۱۹۳۲ء؛ (۶) قیصری۔o۔ اولوقیشلَہ (زیادہ معیّن طور پر: بوغاز کوپرُو۔o۔ قارْدیش گِدیگی) ۱۹۳۳ء (اس کے بعد سے شام اور عراق کو براہِ راست ریل [طاوروس اکسپریس] اَنقرہ کے راستے چلنے لگی جو قونیہ سے ہو کر نہیں جاتی؛ (۷) اِیرماق۔o۔ فِلیوس ۱۹۳۵ء۔o۔ زُنگلداک ۱۹۳۷ء۔o۔ کوْزلُو ۱۹۴۳ء۔o۔ اِیرگلی کا منصوبہ بن چکا ہے اور ریل چاملی تک زیرِ تعمیر ہے؛ (۸) اَفیون قرہ حصار۔o۔ قرہ قُیو (نزد دینار)۔o۔ بالادِز (نزد اِگرِدیر)۔o۔ بُوردُور اور بوزان اُونُو (نیز نزد اِگرِدیر)۔o۔ اِسپارتہ ۱۹۳۶ء؛ (۹) چتینکایا (سِیواس۔o۔ ارزنجان کی لائن پر)۔o۔ مَلَطیہ ۱۹۳۷ء؛ (۱۰) اِلازِیغ۔o۔ گنج ۱۹۴۷ء۔o۔ مُوش زیرِ تعمیر۔o۔ طوَان (جھیل وان پر) زیرِ تجویز؛ (۱۱) کورپرْ آغزِی (نزد فوْزی پاشا)۔o۔ مَرعَش ۱۹۴۸ء؛ (۱۲) نارلی (نزد فوْزی پاشا)۔o۔ غازِعنتب [غازی عینتاب] ۱۹۵۳ء۔o۔ قارقامُوش (سابق جَرابُلُوس) (فرات پر، حلَب۔o۔ نُصَیبین لائن پر) زیرِ تعمیر، (دیکھیے G. Jäschke: *Geschichte und Bedeutung der türkischen Eisenbahnen*، در *Zeitschrift für Politik*، ۱۹۴۲ء، ص ۵۵۹–۵۶۶؛ بالخصوص بغداد ریلوے کے متعلّق قب (۱) H. Bode: *Der Kampf um die Baghdadbahn 1903-1914*، برسلاؤ (Breslau) ۱۹۴۱ء؛ (۲) R. Hüber: *Die Baghdadbahn*، برلن ۱۹۴۳ء)۔

حمل و نقل کے لیے موٹروں کے استعمال میں زیادتی اور اس کے نتیجے میں ریلوے کے ذریعے آمد و رفت میں کمی کے باعث بعض مقامی ریلوے لائنیں ابھی سے بند ہو چکی ہیں (مُدانیَہ -o- بُروسَہ -o- اِیلیجَہ -o- اِذْبرمید -o- پَلا مُوط لُق) اور اندیشہ ہے کہ ترکیّہ میں آئندہ حمل و نقل کے لیے موٹریں ریلوے سے بازی لے جائیں گی۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ سڑکوں کی تعمیر پر از سر نو زیادہ زور دیا جا رہا ہے (مُقْبِل گورک دوغان [طوغان]: Mukbil Gökdogan: *Strassen-bau und Verkehrspolitik in der Türkei*، شٹُٹ گارٹ (Stuttgart) ۱۹۳۸ء)۔ حال میں ترکیّہ کے اندر سڑکوں کے جال کو - ایک حد تک امریکی امداد سے - بہت وسعت دے دی گئی ہے اور اب بسوں کے لیے متعدد راستے بن گئے ہیں (دیکھیے R. W. Kerwin: *The Turkish Roads Programme*، در *The Middle East Journal*، ۱۹۵۰ء).

چونکہ آناطولی کے دریا کشتی رانی کے قابل نہیں لہٰذا اندرونِ ملک میں حقیقی معنی میں کشتی رانی نہیں ہوتی، اس کے سوا کہ چند بڑے دریا صرف دہانوں کے قریب جہاز رانی کے قابل ہیں۔ ان کے علاوہ دجلہ میں کَلِک رانی ہوتی ہے [یعنی ہوا بھری ہوئی مشکوں کے اوپر بندھے ہوئے تختے [رکّ بہ کَلِک] استعمال ہوتے ہیں]۔ حمل و نقل کے لیے نہریں بھی موجود نہیں ہیں۔ جھیل سَبَنجَہ کو ایک طرف (دریاے) سَقارِیَہ سے اور دوسری طرف خلیج اِزْمید سے ملانے کے لیے نہر کی تعمیر کا منصوبہ دو مرتبہ زیرِ غور آ چکا ہے (۹۹۹ھ / ۱۵۹۰ - ۱۵۹۱ء اور ۱۰۶۴ھ / ۱۶۵۳ء) لیکن دونوں موقعوں پر معاملہ ابتدائی مراحل سے آگے نہیں بڑھا (رکّ بہ سَبَنجَہ).

بحری جہاز رانی کے لیے بھی حالات زیادہ موافق نہیں ہیں کیونکہ شمالی اور جنوبی ساحلوں پر قدرتی بندرگاہیں بہت کم ہیں اور مغربی ساحل کی بہت سی چھوٹی چھوٹی خلیجیں بھی اس لیے کسی کام کی نہیں کہ ان دریائی دہانوں کو دریا مٹی سے بھر دیتے ہیں (دیکھیے صفحات بالا، بذیل (۲) طبیعی جغرافیہ: بحرایگہ کا ساحلی آناطولی)۔ سمرنا (اِزْمیر [رکّ بآں]) کی اہم ترین بندرگاہ کے علاوہ مغربی ساحل پر اور چند بندرگاہیں موجود ہیں جو مسلّمہ طور پر غیر اہم ہیں، مثلاً فُوچَہ [رکّ بآں] [قدیم نام: فُوقایَہ] (Phocaea) ازمنۂ قدیم و ازمنۂ وسطٰی میں یہ بندرگاہ سمرنا کی زبردست حریف تھی کیونکہ یہ سمندر میں اور زیادہ آگے کی طرف بڑھی ہوئی تھی)، بُودُرُوم (ہالیقارنَاسَہ Halicarnassus) اور فَتحِیَہ (مَکْرِی Makri)؛ یہ بندرگاہیں محض ساحلی جہاز رانی کے لیے اہمیت رکھتی ہیں۔ زمانۂ حال میں صرف سمرنا ہی بیرونی بحری بندرگاہ کی حیثیت سے کچھ اہم رہا ہے، اگرچہ ازمنۂ وسطٰی میں یہی حیثیت فُوچَہ کو بھی حاصل تھی.

آناطولی کے مغربی ساحل ہی کی بندرگاہیں ایسی ہیں جن تک وسطی آناطولی سے دریاؤں کی وادیوں کی راہ پہنچنا آسان ہے، ورنہ شمالی اور جنوبی ساحلوں کی معدودے چند بندرگاہوں تک رسائی مشکل ہے۔ شمالی ساحل پر سِینُوب [رکّ بآں] (Sinope) کی بندرگاہ (جو اپنے پہاڑی عقبی علاقے کی وجہ سے ایک حد تک ناقابلِ رسائی ہے) اور صامْسون [رکّ بآں] (آمیْسُوس Amisos) کی بندرگاہیں کسی قدر اہم ہیں، خصوصاً کریمیا سے آمد و رفت کے تعلقات کے لیے، جو ان کے بالمقابل واقع ہے۔ صامْسُون نے، جو دریاے قِزِیل اِیرماق (ہالِیس Halys) اور دریاے یشِیل اِیرماق کے دہانوں کے درمیانی میدان میں واقع ہے، سینوب سے زیادہ اہمیّت حاصل کر لی ہے، خصوصاً انیسویں صدی میں۔ جنوبی ساحل کی بندرگاہیں آنطالِیَہ [رکّ بآں] (آدالِیَہ، قدیم نام آطالِیَہ (Attaleia) اور صلیبیوں کی Satalia) اور عَلانِیَا [رکّ بآں] (علایّہ، بوزنطی عہد کی Galonoros اور مشرقِ وسطٰی کے یورپی تاجروں کی Candelor) قرونِ وسطٰی ہی سے مشہور چلی آتی ہیں۔ زیادہ قریب کے زمانے میں مِرْسِینَہ (موجودہ مِرْسین [رکّ بآں]) کی بندرگاہ بھی ۱۸۳۲ء سے، جب کہ وہ تعمیر کی گئی، خاصی اہم رہی ہے۔ خشکی پر واقع ہونے کے ایسے مقامات، جن کے ذریعے برّ اعظم کے آر پار جانے والے راستوں سے رابطہ قائم کیا جا سکتا تھا، حقیقت میں جزیرہ نماے آناطولی کے قاعدے (base) ہی پر واقع تھے، یعنی بحیرۂ اسود کے کنارے پر طَرَبْزُون [رکّ بآں] اور ایک مقام بحیرۂ روم کے ساحل پر (ازمنۂ وسطٰی میں اَیاس [رکّ بآں]، صلیبیوں کا Laiazzo، عثمانی عہد میں پیاس اور اب اِسکَندرُون Alexandretta)؛ کاروان طَرَبْزُون سے آذربیجان اور ایران کی طرف اور بحیرۂ روم کی مذکورۂ بالا بندرگاہوں سے شمالی شام (حَلَب)، الجزیرہ (موصل) اور عراق (بغداد) کی طرف جاتے تھے.

(۶) اقتصادیات:

آناطولی ہمیشہ سے زراعتی ملک چلا آ رہا ہے اور گو اُسے ابتدائی طور پر اچھا خاصا صنعتی بنا دیا گیا ہے، اس کے باوجود اب بھی ایک زراعتی ملک ہے۔ وسطِ ملک میں، جہاں کہیں بھی زمین چرائی سے کسی بہتر کام کے لائق ہے، زیادہ تر اناج بویا جاتا ہے اور پھل اور ترکاریاں ساحلی علاقوں میں اور دریاؤں کے قریب کاشت کی جاتی ہیں جہاں باغوں کو پن چرخیوں (دولاب) سے سیراب کیا جا سکتا ہے۔ پھلوں کی کاشت بالخصوص اُن اضلاع کی نمایاں خصوصیّت ہے جو بحیرۂ اسود پر واقع ہیں (اَماسِیَہ کے سیب ملک بھر میں مشہور ہیں اور کراسُوس (Cerasus)، جسے اب گِیرِہ سُون (Giresun) کہتے ہیں، گیلاس یا کراز (cherry) کا اصلی وطن گمان کیا جاتا ہے، فُنْدُق (hazel-nuts) ملک کے بہت سے حصّوں میں کاشت کیے جاتے ہیں۔ بحیرۂ ایگہ کے ساحلی علاقے میں (جہاں بحیرۂ روم کی قسم کی پیداوار ہوتی ہے) انجیر، زیتون، خربوزہ، (تربوز (کَرپُوز) اور سردے (کاوُن))، شہتوت اور انگور کی کاشت کی جاتی ہے۔ بحیرۂ اسود کے علاقے کے جنگل (خصوصاً سَبَنجَہ کے قریب پرانے وقتوں کا "جنگل کا سمندر ـ بحر الشجر"، یعنی "اَغاچ دِگزی" [اَغاج دِنزی]) اتنے وسیع تھے کہ ان سے نہ صرف عمارتی لکڑی، ایندھن اور کوئلے کی مقامی ضروریات پوری کی جا سکتی تھیں بلکہ دارالسّلطنت کی

ضروریات کے ایک حصّے کو بھی ان سے پورا کیا جاتا تھا، باقی لکڑی یورپ کی طرف کے جنگلوں سے آتی تھی۔

وسطی آناطولی کے بے درخت میدان (steppes) مویشی پالنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ یہاں مختلف قسم کی بھیڑیں اور بکریاں پائی جاتی ہیں۔ ان میں انگورہ بکری بھی ہوتی ہے جس کی اون (''تِفتِک'' mohair) کی مانگ بہت زیادہ ہے۔ آناطولی کے گھوڑے قرونِ وسطٰی سے مشہور چلے آتے ہیں؛ قَرِہ بیجیہ میں عزیزیہ نام کی پرورش گاہ [ایلخی stud farm] سلاطینِ عثمانیہ کی سوار فوج کے لیے گھوڑے پالا کرتی تھی۔ شمال مغربی آناطولی میں شہتوت کے درختوں کی کاشت کی بدولت ریشم کے کرموں کی پرورش خاص طور پر ہوتی ہے۔ بُروسہ اس صنعت کا اور ریشم کاتنے کی صنعت کا اہم مرکز ہے۔

طَرَبْزون اور اِرضُ روم کے درمیان گُمُش خانہ کی، نیز اَماسِیَہ کے قریب گُمُش حاجی کُوریِ کی چاندی کی کانوں کا ذکر ضروری ہے کیونکہ وہ قدیم ترین ہیں۔ انھیں مقامات میں چاندی کے سکّے ڈھالنے کی ٹکسالیں تھیں۔ گُو رِہ (اینِہ بولُو اور قسطَمُونی کے درمیان) اور اِرْغنی مَعْدِن میں (دِیار بَکْر کے قریب) تانبا پایا جاتا تھا۔ اِسْکی شہر سے قریب دنیا بھر میں وہ تنہا خطّہ ہے جہاں مِیرشام (meershaum) [= کفِ دریا؛ ترکی: لُولہ طاشی] پایا جاتا ہے۔ انیسویں صدی عیسوی میں پائپ (لُولہ) اور اس قسم کی دوسری چیزیں بنانے کے لیے اس کی بڑی مانگ تھی لیکن چونکہ اب اس کا رواج نہیں رہا اس لیے اس کی پیداوار بھی بہت کم ہوگئی ہے۔

صنعت وحرفت کو خاصا فروغ حاصل رہا ہے، خصوصاً کوزہ سازی کی صنعت کو (جو سلجوقیوں کے عہد ہی میں ایران سے یہاں آ گئی تھی)۔ سلاجقۂ روم کے عہد کی کوزہ گری کے شاندار نمونے قونیہ کی عمارتوں میں بالخصوص نظر آتے ہیں۔ عثمانی صنعتِ کوزہ گری کا عہدِ زرّین اس وقت شروع ہوا جب سلیم اوّل نے اپنی ایرانی مہمّ (۱۵۱۴ء) سے واپسی کے وقت تبریز سے کاریگروں کو لا کر استانبول اور اِزْنیق میں آباد کر دیا۔ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں اِزْنیق بہترین عثمانی مٹی کے ظروف کا مرکز تھا جن میں زیادہ تر سبز اور نیلے رنگ ہوتے تھے اور اُن کے بالمقابل بیچ بیچ میں خوبصورتی کے ساتھ شوخ سرخ رنگ (''Bolus-red'') استعمال کیا جاتا تھا۔ اِزْنیق کی روغنی ٹائلیں [کاشی کار اینٹیں] مسجدوں، ''تربتوں'' اور طوپ قپوسرائے میں استانبول کی آرائش کے لیے استعمال کی گئی ہیں۔ ظروف میں رکابیاں (جو تاجروں کی اصطلاح میں ''روڈس کی رکابیاں'' (''Rhodes plates'') کہلاتی ہیں) سب سے زیادہ مشہور ہیں اور کوزہ گرخانوں کی پیداوار میں سب سے زائد تعداد میں باہر بھیجی جاتی ہیں۔ بعد کے زمانے (عہدِ احمد ثالث) میں استانبول میں طِکفُور سرائے اور کُوتاہیَہ میں کوزہ گری کے کارخانے قائم ہوئے (اِزْنیق اور دیگر مقامات میں ترکی صنعت کوزہ گری کے متعلّق قب K. Otto-Dorn: *Das islamische Iznik*، برلن ۱۹۴۱ء، ص ۱۰۹ ببعد اور فہرست مآخذ از R. Anhegger: وہی کتاب، ص ۱۶۵ ببعد)۔ [قب نیز مادّۂ خزف]۔

گِلی ظروف کے علاوہ منسوجات، خصوصاً غالیچے، آناطولی کی پیداوار کا اختصاصی جز ہیں۔ ترک اس فن کو مشرق سے لے کر آئے اور انھوں نے اسے (بالخصوص عُشّاق ـ قُولَہ ـ گوردوس (Gördez) اور دیگر مقامات میں) کسی حدّ تک ایرانی روایت کے مطابق اور کچھ ایک زیادہ عوام پسند طرز میں ترقّی دی۔ یورپ میں ترکی کے سب سے زیادہ معروف قالین وہ ہیں جو انیسویں صدی میں بنائے جاتے تھے؛ ان کی گرہیں چھدری اور روئیں لمبے ہوتے ہیں اور انھیں ''سمرنا'' کے قالین کہتے ہیں کیونکہ یہ اسی بندرگاہ سے یورپ کو بھیجے جاتے ہیں، اگرچہ دراصل یہ عُشّاق کے علاقے میں تیار ہوتے تھے۔ آناطولی کی ریشم کی صنعت بھی بہت مشہور تھی جس کا مرکز بُروسہ میں تھا۔ ریشمین مصنوعات میں زربفت کے پارچے، جن میں ریشم کے ساتھ سونے چاندی کے تار بُنے جاتے تھے، خاص طور پر نہایت اعلٰی درجے کی صنّاعی کا نمونہ ہوتے ہیں اور زیادہ تر شاہی دربار اور اونچے طبقے کے لوگوں کے لیے تیار کیے جاتے تھے (ترکی پارچہ بافی کی مصنوعات کے متعلّق قب تحسین اَوْز: تورک قماش وقطیفہ لری، استانبول ۱۹۴۶ - ۱۹۵۱ء؛ وہی مصنف: *Turkish Textiles and Velvets*، انقرہ ۱۹۵۰ء)؛ آخر میں موٹی قسم کی قالین بافی (''کِلیم'') اور چٹائیوں [حَصِیر] کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے۔ ایسی چٹائیاں سردی کے موسم میں مساجد کے فرشوں پر بچھائی جاتی ہیں (قب نیز رک بہ ''بساط''، ''نسج الاسلامی'')۔

شہروں میں اہلِ حرفہ کو اصناف (guilds) کی شکل میں منظّم کر دیا گیا تھا۔ یہ 'اَصْناف' (واحد 'صِنف' [رک بآن]) درویشی سلسلوں سے کسی قدر ملتی جلتی ''برادریاں'' تھیں جو اپنی روایات، کام کی خوبی اور ساکھ قائم رکھتی اور ان روایات کی حفاظت کرتی تھیں۔ حادثات کی صورت میں ان ''برادریوں'' کے ارکان رفاقتِ باہمی کے جذبے کے باعث نقصانات سے بچ جاتے تھے اور اس سے ان کے درمیان یگانگی کی روح پیدا ہوتی تھی جس سے انھیں اتنی قوّت حاصل ہو جاتی تھی کہ بعض اوقات حکومت کو بھی ان کے سامنے جھکنا پڑتا تھا۔ ان اصناف کی نگرانی 'محتسِب' کیا کرتا تھا اور وہ خود قاضی کے تحت ہوتا تھا۔ احتساب کا ادارہ شریعت سے متعلّق تھا (اہلِ حرفہ کی ان ترکی انجمنوں کے متعلّق قب عثمان نُوری: مجلّۂ اُمورِ بلدیہ، جلد اوّل، استانبول ۱۹۲۲ء، باب اصناف: ص ۶۷۹ - ۶۸۸؛ تیشنر (Taeschner): *Die Zünfte in der Türkei*، در *Leipziger Vierteljahrsschrift für südosteuropa*، ۱۹۴۱ء، ص ۱۷۲ - ۱۸۸ اور مادّۂ ''صنف''۔ آلِ عثمان کے ابتدائی ادوار کی عام اقتصادی حالت پر قب Afet Inan: *Aperçu général sur l' Histoire economique de l' Empire Turc-Ottoman*، استانبول ۱۹۴۱ء)۔

یہ قدیم برادریاں (guilds) انیسویں صدی میں ٹوٹنا شروع ہوگئیں کیونکہ

اس زمانے میں ملکی اصلاحات (''تنظیمات'') نے مغربی یورپ کی طرز کی تجارتی اصلاحات کا اور اس کے ساتھ ہی مغربی طرز کے قوانین ناموں کے اجرا کا (جو ایک حد تک براہِ راست یورپی قانون ناموں سے اخذ کر لیے گئے تھے) دروازہ کھول دیا اور بالآخر ۱۳ فروری ۱۳۲۵ھ/ ۲۶ فروری ۱۹۱۰ء (کِدِک، ۱۶ فروری ۱۳۲۸ھ/ یکم مارچ ۱۹۱۳ء) کو ان برادریوں کو رسمی طور پر ختم کر دیا گیا اور ان کی جگہ جدید انجمنوں نے لے لی (ان انجمنوں کو ٹریڈ یونین Trade Unions، یعنی اتّحادیۂ اصناف) قرار دے کر ۱۹۴۳ء میں منظّم کر دیا گیا)۔ زراعت میں بھی اصلاحات کی گئیں، مثلاً قونیہ کے میدان کی آبپاشی کا کام بغداد ریلوے کے ذریعے سرانجام دیا گیا (۱۹۰۷-۱۹۱۳ء) اور نئی فصلیں کاشت ہونے لگیں (مثلاً کِلیکِیا (Cilicia) کے میدانی علاقے میں کپاس).

آناطولی کو اقتصادی حیثیت سے یورپی ملکوں کا ہم پلّہ بنانے کے لیے جو کوششیں عمل میں لائی گئیں وہ ترکی جمہوریت کے قیام کے وقت سے خصوصاً بہت نمایاں ہوگئی ہیں؛ قبّ (من جملہ دیگر تصانیف) (۱) Orhan Conker اور Emile Witmeur: *Redressement économique et industrialisation de la Nouvelle Turquie*، پیرس ۱۹۳۷ء؛ (۲) Ahmad Oguz: *Die Wirtschaftslenkung in der Türkie*، برلن ۱۹۴۰ء؛ (۳) Schewket Raschid: *Die türkische Landwirtschaft als Grundlage der türk. Volkswirtschaft*، برلن-لائپزگ ۱۹۳۲ء؛ (۴) M. Thornburg، G. Spry، G. Soule: *Turkey. An Economical Appraisal*، نیویارک ۱۹۴۹ء؛ (۵) *The Economy of Turkey: An Analysis and Recommendations of a Development Program*، بالٹی مور ۱۹۵۱ء.

مآخذ: (۱) الِادریسی: کتاب رُجار یا نزهة المشتاق (K. Miller: *Mappae Arabicae*، ج ۴، شٹُٹ گارٹ ۱۹۲۷ء، لوحۂ شمارہ ۳۵، ۴۵، ۵۵)؛ (۲) *Edrisii Geographia Arabica*، روما ۱۵۹۲ء، ورق ۱۱۳ الف، ۱۱۴ب، ۱۳۹ الف تا ۱۴۲ الف، ۱۵۳ب تا ۱۵۴ب؛ P. Amédée Jaubert: *Géographie d, Edrisi*، پیرس ۱۸۳۶-۱۸۴۰ء، ۲: ۱۲۹، ۳۰۵، ۳۹۱؛ (۳) یاقوت: مُعجم البُلدان والقزوینی: آثار البلاد، بذیل مادّۂ الروم؛ (۴) ابوالفِداء: تقویم البلدان *Géographie d' Aboulféda*، طبع رینو (Reinaud) و دیسلان (de Slane)، پیرس ۱۸۴۰ء؛ ترجمہ فرانسیسی از رینو (Reinaud)، پیرس ۱۸۴۸ء؛ ادامۂ ترجمہ از گایار (St. Guyard)، پیرس ۱۸۸۳ء)؛ (۵) ابن بطّوطہ (عربی متن مع ترجمہ فرانسیسی، بعنوان *Voyages d'Ibn Batoutah*، از Defrémery و Saguinetti، ج ۲، پیرس ۱۸۷۷ء، ۲: ۲۵۴-۳۵۴؛ ترجمۂ فرانسیسی مع حواشی از Defrémery در *Nouvelles Annales de Voyages*، دسمبر ۱۸۵۰ - اپریل ۱۸۵۱ء؛ ترجمۂ انگریزی از H. A. R. Gibb، بعنوان *Ibn Battuta: Travels in Asia and Africa 1325-1354*، لنڈن ۱۹۵۳ء، ص ۱۲۳-۱۶۶)؛ (۶) العُمَری: مسالک الابصار (تیشنر F. Taeschner: *Al-'Umarī's Bericht über Anatolien*، لائپزگ ۱۹۲۹ء؛ نامکمّل ترجمہ از کاترمیر (Quatremére) در *Notices et Extraits*، ج ۱۳، پیرس ۱۸۳۸ء، ص ۱۵۱-۳۸۴)؛ (۷) حمداللہ مُستوفی: نُزْهَة القلوب (*The geographical part of Nuzhat al Qulub*، طبع G. Le Strange، لائڈن - لنڈن ۱۹۱۵ء، ترجمۂ انگریزی ۱۹۱۹ء)؛ (۸) G. Le Strange: *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۰۵ء، ص ۱۲۷-۱۵۸؛ (۹) تیشنر (F. Taeschner): *Ein altosmanischer Bericht über das Vorosmanische Konstantinopel*، در *Annali Ist. Univ. Or. Napoli*، N. S. I، روما ۱۹۴۰ء، ص ۱۸۱-۱۸۹؛ (۱۰) محمد عاشق کی مناظر العوالم (۱۰۰۶ھ-۱۵۹۸ء) پر قرونِ وسطٰی کی طرز کا جغرافیائی ادب ختم ہو جاتا ہے۔ اپنی کتاب کے جغرافیائی حصّے میں اس نے پرانے مصنّفین، مثلاً الِادریسی، ابوالفداء وغیرہ کے بیانات کے ترکی ترجمے سے ابتدا کی ہے اور جو مقامات خود اس نے دیکھے ہیں ان کے بارے میں اس نے پہلے مصنّفین کے بیانات کے بعد اپنے چشم دید حالات بڑھا دیے ہیں۔ اس کے یہ بیانات، جو کتاب میں جا بجا درج ہیں، بہت زیادہ اہم ہیں اور اس قابل ہیں کہ انھیں صحت کے ساتھ شائع کیا جائے، خصوصاً اس لیے کہ بعد کی تصنیفات میں ان بیانات کو بنیاد کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

عثمانی اہلِ قلم کی اصلی تصنیفات، جو محفوظ رہ گئی ہیں، مذکورۂ بالا کتابوں کی بہ نسبت زیادہ پُر از معلومات ہیں، مثلاً: (۱۱) پیری رئیس: کتاب بحریه، استانبول ۱۹۳۵ء طباعت عکسی، از ص ۷۴۶؛ (۱۲) کاتب چلبی (یا حاجّی خلیفہ): جہان نُما، جس کی دو روایتیں ہیں (قبّ تیشنر (Taeschner): *Zur Geschichte des Djihānnumā*، در *MSOS*، ۱۹۲۶ء، ۲۹: ۹۹-۱۱۱؛ وہی مصنّف: *Das Hauptwerk der geographischen Literatur des Osmanen, Kātib Čelebis Gihānnumā Imago Mundi*، ۱۹۳۵ء، ص ۴۴-۴۷)۔ ان میں سے پہلی روایت ایک نامکمّل نسخے کی شکل میں مخطوطات کے ایک سلسلے میں موجود ہے جن میں سے وی آنا کا مخطوطہ Mxt. 389 (فہرست فلُوگل (Flügel)، ج ۲، شمارہ ۱۲۸۲) سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ یہ بظاہر اس مشہور مصنّف کے اپنے استعمال میں رہا تھا۔ ابوبکر بن بَہرام الدِمشقی (م ۱۱۰۲ھ/ ۱۶۹۱ء) نے کاتب چلبی کے کام کو جاری رکھا اور آناطولی کے کوائف قلم بند کیے۔ اس کی کتاب کا ایک مخطوطہ لنڈن (موزۂ برطانیہ، Or.1038) میں ہے۔ ابراہیم مُتفرِّقہ نے جہان نُما کو طبع کیا (۱۰ محرّم ۱۱۴۵ھ/ ۲۳ جولائی ۱۷۳۲ء)؛ لاطینی زبان میں جہان نما کا ایک غیر صحیح ترجمہ از نوربرژ (Matth. Norberg): *Gihan Numa, Geographia Orientalis*، دو جلد، Lund ۱۸۱۸ء؛ ترجمۂ فرانسیسی از Armain: *Déscription*

l'Asie Mineure de، در Louis vivien de Saint Martin: *Histoire des découvertes Géographiques*، ج ۳، پیرس ۱۸۴۶ء، ص ۷۶۳ بعد۔ اس ترجمے میں اس نے اس حصّے کو، جسے کاتب چلبی نے نامکمّل چھوڑ دیا تھا، ابوبکر کی تصنیف (ص ۴۲۲ بعد، نوربرگ (Norberg)، ۱: ۶۱۸ بعد) سے مکمّل کر دیا ہے اس طرح اس کتاب نے ــ جو ترکی طباعت کے نقوش اوّلین (incunabula) میں سے ہے ــ ایشیا کے متعلّق ایک جغرافیائی بیان کی حیثیت اختیار کر لی؛ تاہم اس کتاب میں آناطولی کے کوائف (نوربرگ، ۱: ۵۸۹ بعد) کے صرف وہ حصّے، جو ایالتِ وان کے بارے میں ہیں (ص ۴۱۱)، فی الواقع کاتب چلبی کے لکھے ہوئے ہیں؛ اس کے علاوہ اور جو کچھ بھی ہے، یعنی بیانات متعلقۂ ایالتِ قارص (داخل کردہ در ص ۴۰۷)، ایالتِ ارضِ روم (ص ۴۲۲)، ایالتِ طربزون (ص ۴۲۹)، ایالتِ دیار بکر (ص ۴۳۶: اس سے آگے دیکھیے نوربرگ، ج ۲)، ایالتِ کلیکیا (ایچ ایل، ص ۶۱۰)، ایالتِ قرہ مان (ص ۶۱۴)، ایالتِ سیواس (ص ۶۲۲) اور آنادولو (ص ۶۳۱)، وہ سب کے سب ابوبکر کے لکھے ہوئے ہیں۔

عثمانی عہد کے آناطولی کے متعلّق معلومات کے مزید مآخذ ترکی اور عربی زبان کے معدودے چند سفرنامے ہیں: اولیاء چلبی: سیاحت نامہ (ج ۱-۴، ناقص ادارت، استانبول ۱۳۱۴-۱۳۱۶ھ؛ ج ۷ و ۸ کسی قدر بہتر ادارت کے ساتھ، ۱۹۲۸ء؛ ج ۹ و ۱۰ (لاطینی حروف میں)، ۱۹۳۵ء و ۱۹۳۸ء؛ پہلی دو جلدوں کا ایک نارسا اور ناکافی انگریزی ترجمہ فان ہامر (Von Hammer) نے ایک ناقص مخطوطے سے بعنوان *Narrative of Travels in Europe, Asia and Africa* کیا تھا، لنڈن ۱۸۳۴ء، ۱۸۴۶ء و ۱۸۵۰ء)؛ یہ ہمارے پاس صرف تقریبی خاکے کی صورت میں موجود ہے۔ کتاب کے ان حصّوں کو، جن میں آناطولی کا حال بیان کیا گیا ہے، تیشنر (Taeschner) نے *Das Anatolische Wegenetz nach osmanischen Quellen*، لائپزگ ۱۹۲۴ء، ۱: ۷۳-۳۹، ۴۴، میں جمع کر دیا ہے۔ علاوہ بریں مکّۂ مکرّمہ کو جانے والے حاجیوں کے لیے سفری ہدایت نامے بھی موجود ہیں، مثلاً محمّد ادیب کی کتاب جو ۱۱۹۳ھ/ ۱۷۷۹ء میں لکھی گئی (طبع استانبول ۱۲۳۲ھ/ ۱۸۱۷ء)، ترجمۂ فرانسیسی از Bianchi، بنام *Itinéraire de Constantinople á la Mecque*، پیرس ۱۸۲۵ء۔ اس میں سنۂ تالیف غلطی سے ۱۰۹۳ھ/ ۱۶۸۲ء درج ہے، قبّ تیشنر (Taeschner): *Wegenetz*، ۱: ۸۲)۔

مشرقی سیّاحوں کے مذکورۂ بالا سفرنامے جو تصویر پیش کرتے ہیں اس کی تکمیل کے لیے یورپی سیّاحوں کے سفرنامے موجود ہیں جن میں سے قدیم تر کی فہرست L. Vivien de Saint-Martin نے *Histoire des découvertes Géographiques* میں دے دی ہے، دیکھیے ج ۳: ۷۴۳-۸۰۸، ج ۶: فہرست مآخذ Bibliographie؛ اسی طرح قریب تر زمانے کے سفرناموں کی فہرست Selčuk Trak نے اپنی تصنیف تورکیہ یہ عائد جغرافی لٹریٹورِ کِنِل ببلیوغرافیہ سی میں درج کر دی ہے۔

ترکی سرکاری اسناد و اوراق (archives) میں جو دستاویزات محفوظ ہیں ان سے گرانقدر معلومات حاصل ہونے کی توقّع کی جا سکتی ہے، لیکن ان کی تحقیق اور چھان بین کا کام ابھی ابتدائی مراحل میں ہے (عمر لطفی برکان: تورکیہ دہ امپراطورلک دوورلرینگ نفوس و اراضی تحریر لری و خاقانہ مخصوص دفترلر، استانبول ۱۹۴۱ء اور xv و xvi اِنجی عصرلرده عثمانلی ایمپراطورلغندہ زراعی ایکونومی نک حقوقی و مالی اساسلری، قانونلر، استانبول ۱۹۴۳ء)۔

آخر میں ان سرکاری کتبِ دستی (handbooks) (دولتِ علیّۂ عثمانیّہ سالنامہ سی) کو، جو ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء سے لے کر ۱۳۳۴ھ مالیہ/ ۱۹۱۸ء تک کے ۶۸ سالوں کے بارے میں دستیاب ہو سکتی ہیں اور الگ الگ ولایتوں کے سالناموں کو بھی سلطنتِ عثمانیہ کے آخری عشرات کے متعلّق معلومات کے مآخذ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ (اس عہد کے شہنشاہی اور صوبائی سالناموں اور دیگر مآخذ سے کُوینے (V. Cuinet) نے اپنی اہم تصنیف *La Turquie d'Asie*، پیرس، ۱-۲، ۱۸۹۲ء، ۳-۴، ۱۸۹۴ء، میں پورا فائدہ اٹھایا ہے)۔ ترکی جمہوریہ کے ماتحت بھی اس قسم کی مطبوعات کا سلسلہ (بنام تورکیہ جمهوریتی دولت سالنامہ سی) شروع کیا گیا تھا لیکن تا حال صرف پانچ جلدیں شائع ہوئی ہیں (ج ۱، ۱۹۲۶ء، ج ۲، ۱۹۲۷ء، ج ۳، ۱۹۲۸ء، ج ۴، ۱۹۲۹ء، ج ۵، ۱۹۳۰ء) اور ان میں تقریبًا اتنا مواد موجود نہیں جتنا کہ عثمانی عہد کے سابقہ سالناموں میں ہوا کرتا تھا۔

آخر میں مقامات کے ناموں کی فہرستیں بھی قریب ترین زمانے کے متعلّق معلومات کے مآخذ کے طور پر استعمال کیا جا سکتی ہیں، مثلاً سون تشکیلات ملکیّہ دہ کویلری مزِک آدلری، استانبول ۱۹۲۸ء؛ ادارہ تقسیماتی ۱۹۴۲ء، استانبول ۱۹۴۲ء؛ تورکیہ ده مسکون یرلر قِلاوزو، دو جلد، انقرہ ۱۹۴۶ء و ۱۹۵۰ء۔

سترھویں صدی کے آناطولی کے نقشے کی کلید:

یہ نقشہ H. Louis کے *Bevölkerungskarte der Türkei*، ۱۹۳۸ء، پر مبنی ہے جس کا پیمانہ ۱: ۴،۰۰۰،۰۰۰ ہے۔ اس کے اندراجات بیش تر کاتب چلبی کی جہان نما سے لیے گئے ہیں، لہٰذا وہ آناطولی کے سترھویں صدی عیسوی کے حالات ظاہر کرتے ہیں۔ اس نقشے میں (ترکیّہ کی موجودہ حدود کے اندر) ایالتوں (ولایتوں) کی تخمینی سرحدیں سرخ شکستہ خطوط سے دکھائی گئی ہیں اور بعض ایالتوں میں لواؤں (یا سنجاقوں) کی حدود سرخ نقطہ دار خطوط سے ظاہر کی گئی ہیں۔ مزید براں اس میں کاتب چلبی، اولیاء چلبی اور دیگر مآخذ کی بیان کردہ زیادہ اہم سڑکیں بھی دکھائی گئی ہیں اور رسل و رسائل کی اصلی شاہراہیں دوہرے سرخ خطوط سے اور دوسرے راستے ابھرے سرخ خطّوں سے، شہروں کے نام سرخ رنگ میں اور پہاڑوں کے نام (میٹروں میں بلندی کے ساتھ) کالی روشنائی سے لکھے گئے ہیں [انگریزی نقشے میں ان ناموں کو مخفّف لکھا گیا ہے اور اعلام کی فہرست میں ان اختصارات کی تشریح کر دی گئی ہے]۔ [ذیل میں پہلے مقامات

کے نام بہ ترتیب ہجی دیے گئے ہیں۔ ہر نام جہان نُما کے، نیز سترھویں صدی کے دوسرے مآخذ کے، مطابق درج کیا گیا ہے اور اس کے آگے خطوط وحدانی میں اس جگہ کا قدیم یا بوزنطی نام (بشرطیکہ وہ پرانے نام سے مختلف ہو) اور اداری ضلع کا (جس میں وہ واقع ہے) نام لکھ دیا گیا ہے سوا ایسے شہروں کے جنھوں نے بعد میں اہمیّت حاصل کی، لہٰذا پرانے مآخذ میں مذکور نہیں ہیں؛ آخر میں ہر نام کے ساتھ نقشے کے خانے کا حوالہ دے دیا گیا ہے]۔ اعلام کی صورت میں سابق ترکی رسمِ خط کا تتبّع کیا گیا ہے.

آخِسقہ (ی ۲)

آرتوِین (ایالتِ چِلدِر: ط ۲)

آرجیش (ایالتِ وان: ی ۳)

آردہان (ایالتِ چِلدِر: ط ۲)

آطنہ [اَدَنہ] (ایالتِ اَطنہ: و ۴)

آطہ پازاری (د ۲)

آغری [اَگری] داغ (ارارات: ک ۳)

آفیون قرہ حِصاری (لواءِ قرہ حِصارِ صاحِب: د ۳)

آق سَرای (ایالتِ قرہ مان: ھ ۳)

آق شہر (اَنڈیرس؛ لواءِ قرہ حِصارِ شرقی: ج ۲)

آق شہر (فیلومِلیون Philomelion؛ ایالتِ قرہ مان: د ۳)

آلاشہر (فیلادِلفیہ Philadelphia؛ لواءِ اَیدِین: ج ۳)

آلاداغ (و ۴)

آلتون طاش (لواءِ کِرمِیان: د ۳)

آماسیہ (Amasia: ایالتِ سِیواس: و ۲)

آماصرہ (اَماستری Amastris؛ لواءِ بولی: ھ ۲)

آمدر دیاربکر (دِیاربکر؛ ایالتِ دِیاربکر: ط ۴)

آنطاکیہ (Antiocheia: لواءِ اَنطاکیہ: ز ۴)

آنطالیہ (Attaleia، اَضالیہ؛ لواءِ تکّہ: د ۴)

اَنقرہ (Ankyra، اَنگورہ: ھ ۳)

آیاسلوغ (آیوس تیولغوس Hegios Theologos، افسوس Ephesos، سِلجُوق؛ لواءِ اَیدِین: ب ۴)

آیاش (ایالتِ اَدَنہ: و ۴)

آیاش (لواءِ اَنقرہ: ھ ۲)

اَخلاط (ایالتِ وان: ی ۳)

اَدرَمید (لواءِ قرہ سی: ب ۳)

اِدرِنہ (Adrianopolis: ب ۲)

ارجیاس داغی (Argaios: و ۳)

آرْدُو (ایالتِ طرَبزون: ز ۲)

اِرزِنجان (ایالتِ اِرضِ رُوم: ح ۳)

اِرضِ رُوم (اَرزَن الرُّوم؛ ایالتِ اِرضِ رُوم: ط ۳)

اِریگلی (اِیراقلیا Herakleia؛ ایالتِ قرہ مان: و ۴)

اِرگنی (ایالتِ دِیاربکر: ح ۳)

اِرمِناک (لواءِ اِیچ ایل: ھ ۴)

اُرمِیہ (ک ۴)

اِزمیر (سمرنا؛ لواءِ صُغلہ: ب ۳)

اِزنیق (نیکیا Nicaea؛ لواءِ قوجہ ایلی: ج ۲)

اِسپارتہ (لواءِ حَمید: د ۴)

اَسکلِب (ایالتِ سِیواس: و ۲)

اِسکندرُون (Alexandreria، Alexandretta؛ لواءِ اَنطاکیہ: ز ۴)

اِسکی شہر (لواءِ سلطان اَوْیوْ گی: د ۳)

اُشقُودر (سقُوطری: ج ۲)

اِگرِدیر (لواءِ حَمید: د ۴)

اَلایہ (عَلائیہ، اَلانیہ، Kalonoros؛ لواءِ اِیچ ایل: ھ ۴)

اِلبِستان (ایالتِ مَرعَش: ز ۳)

اِلغاز طاغی (ھ ۲)

اِلما طاغی (ھ ۳)

اِلمالی (لواءِ تکّہ: ج ۴)

اُولُوبورلی (لواءِ حَمید: د ۳)

اُولُوقشلہ (ایالتِ قرہ مان: و ۴)

اِیسنِیقومیدیا (نیقومد Nikomedeia، اِزمِید؛ لواءِ قوجہ ایلی: ج ۲)

اِیلغین (ایالتِ قرہ مان: د ۳)

اینونو (لواءِ سُلطان اُوْیوْ گی: د ۳)

اینیہ بولی (لواءِ قسطمونی: ھ ۲)

باطوم (ط ۲)

بالیکسری (بالکیسر؛ لواءِ قرہ سی: ب ۳)

بای بُورد (ایالتِ اِرضِ رُوم: ط ۲)

بایزید (Doğu Bayazit؛ ایالتِ قارص: ک ۳)

بدلیس رِبتلیس (ایالتِ وان: ی ۳)

برغمہ (Pergamon؛ لواءِ قرہ سی: ب ۲)

بُروسہ (Prusa، Brussa؛ لواءِ خُداوندگار: ج ۲)

بک بوغاداغی (ز ۳)

بک شہری (ایالتِ قرہ مان: د ۴)

ہِنْدِ ایرِگْلی (ہراقلیہ پونٹیکا Heraclea Pontica، ایرِگْلی؛ جنوبی بُولی: د ۲)
بُودرُوم (ہالیقارناسہ Helikarnassos؛ لواءِ مَنْتِشا: ب ۴)
بُور دُور (لواءِ حَمِید: د ۴)
بُوزداغی (تُمُولوس Tmolos: ج ۳)
بُوزداغی (ح ۳)
بُولُوادِین [بُولیُوادِین] (لواءِ قرہ حِصارِ صاحِب: د ۳)
بُولی (لواءِ بُولی: د ۲)
بِیرہ (بِیرہ جِک: لواءِ بِیرہ: ح ۴)
بِیغا (لواءِ بِیغا: ب ۲)
بکپازاری (لواءِ اَنْقرہ: د ۲)
بِیلہ جِک (لواءِ سلطان اُونُو گی: ج ۲)
پَیاس (Baiai؛ ایالتِ اَدَنَہ: ز ۴)
تاتْوان (ایالتِ وان: ی ۳)
تدمر [تدمور] (پیلمائرا Palmyra: ح ۵)
ترجان (ماماخاتون: ایالتِ ارضِ رُوم: ط ۳)
ترحال (ایالتِ سیواس: ز ۲)
تفلیس (ک ۲)
تنغنی (لواءِ حمید: د ۴)
تیکہ لی داغی (ز ۲)
تکیر داغ [تکفور داغ] (رادستوس Rhaidestos، رودوستو Rodosto:
ب ۲)
تورتُوم (ایالتِ ارضِ رُوم: ط ۲)
توقات [توقاد] (ایالتِ سیواس: ز ۲)
تِیرہ (لواءِ اَیدِین: ب ۳)
چالدِران (ایالتِ وان: ی ۳)
چائی (لواءِ قرہ حصارِ صاحِب: د ۳)
چرکش (لواءِ کانقیری [کنغری یا چانغری]: ھ ۲)
چلدر (ایالتِ چلدِر: ی ۲)
چورلی (Tzurullon: ب ۲)
چورم (ایالتِ سیواس: و ۲)
چورل ایمرک (ایالتِ وان: ی ۴)
حاجی بکتاش (ایالتِ قرہ مان: و ۳)
حرّان (Karrhai؛ ایالتِ رقّہ: ح ۴)
حسن داغی (و ۳)
حسن قلعہ (پاسِین لر؛ ایالتِ ارضِ رُوم: ط ۲)
حِصْنِ کَیف (حِصْن کَیفا، حَسن کَیف؛ ایالتِ دیار بکر: ط ۴)
حِصْنِ مَنْصُور (Hüsnümansur، آدیامان؛ ایالتِ مَرْعَش: ح ۴)
حکیم خانی (ایالتِ سیواس: ز ۳)
حَلَب (Aleppo: ز ۴)
حَما (ز ۵)
حِمص (Emesa، Höms: ز ۵)
خُراسان (ایالتِ ارضِ رُوم: ی ۲)
خَرپوت (خَرْت بِرْت، اِلازیغ؛ ایالتِ دیار بکر: ح ۳)
خِرْبیک (لواءِ خداوندگار: ج ۲)
خِنس (ایالتِ ارضِ رُوم: ط ۳)
خُوی (ک ۳)
دِرگزلی (لواءِ کرمیان: ج ۴)
دورزجہ (لواءِ بولی: د ۲)
دِوِہ لو- قرہ حصار (دِوِہ لی؛ ایالتِ قرہ مان: و ۳)
دِیُورِگی (Tephrike؛ ایالتِ سیواس: ح ۳)
رأس العَین (ایالتِ رقّہ: ط ۴)
رُہا، اُورفہ (Edessa؛ ایالتِ رقّہ: ح ۴)
رِیزہ (ایالتِ طرَبزون: ط ۲)
رِیوان (اِریوان: ک ۲)
زَرہ (ایالتِ سیواس، ز ۳)
زَعفران بولی (لواءِ قسطمونی: ھ ۲)
زُنغُولداق (د ۲)
زِیلہ (ایالتِ سیواس: و ۲)
سُرُوج (ایالتِ رقّہ: ح ۴)
سِعِرد (سِعِرت؛ ایالتِ دیار بکر: ط ۴)
سِفری حصار، سِوْری حصار (لواءِ اَنقرہ: د ۳)
سُلطان داغی (د ۳)
سِیلفکہ (سِیلوقیہ Seleukeia، سِلفکہ؛ لواءِ اِیچ ایل: ھ ۴)
سوردگور (لواءِ سلطان اُونُو گی: د ۳)
سِیدی غازی (ناقولیہ Nakoleia؛ لواءِ سلطان اُونُوگی: د ۳)
سِیس (ایالتِ اَدَنہ: و ۴)
سِینوپ (لواءِ قسطمونی: و ۱)
سِیواس (سواستہ Sebasteia؛ ایالتِ سیواس: ز ۳)
سِیوِرک (ایالتِ دیار بکر: ح ۴)
شَرقیشلہ (ایالتِ سیواس: ز ۳)

شِیلِہ (لواءِ قوجہ ایلی: ج ۲)
صامسُون (اَمِیسوس Amisos؛ ایالتِ سیواس: ز ۲)
صَبانجہ (صَبانجہ؛ لواء قوجہ ایلی: د ۲)
صُوصِغِیرلِغی (صُوصُوزلِق؛ لواءِ قرہ سی: ج ۳)
طاوشانلی (لواءِ کِرمیان: ج ۳)
طرابُلسِ شام (Tripolis: و ۵)
طرَبزُون (طرابزُوس Trabezus؛ ایالتِ طرَبزُون: ح ۲)
طرسُوس (Tarsos؛ ایالتِ اَدَنہ: و ۴)
طوسیہ (لواءِ کنغری: و ۲)
عادِل جواز (ایالتِ وان: ی ۳)
عُثمان جق (ایالتِ سِیواس: و ۲)
عُشاق (لواءِ کِرمِیان: ج ۳)
عَینِ تاب (Gaziantep؛ ایالتِ مَرعَش: ز ۴)
فِنیکہ (لواءِ تکّہ: د ۴)
فوچہ (فوقایہ Phokaïa؛ لواءِ صارُوخان: ب ۳)
قادِین خانی (ایالتِ قرہ مان: ھ ۳)
قارص (ایالتِ قارص: ی ۲)
قرق کلیسا (قرق لرہ لی: ب ۲)
قرہ بیگار (قرہ پینار؛ ایالتِ قرہ مان: ھ ۴)
قرہ حِصارِ شرقی (شابِین قرہ حصار؛ لواءِ قرہ حِصارِ شرقی: ح ۲)
قسطمونی (لواءِ قسطمونی: ھ ۲)
قسطنطینیہ (Konstantinopolis، اِستانبُول: ج ۲)
قغزمان (ایالتِ قارص: ی ۲)
قلعہ جک (لواءِ کنغری: ھ ۲)
قلعہ سُلطانیہ (چناق قلعہ سی: لواءِ بیغا: ب ۲)
قنغال (ایالتِ سِیواس: ز ۳)
قُوش اطہ سی (اسقالہ نووہ Scala Nuova؛ لواءِ ایدِین: ب ۴)
قُولہ (لواءِ کِرمِیان: ج ۳)
قونیہ (ایقونیو Ikonion؛ ایالتِ قرہ مان: ھ ۴)
قویل حِصار (Koyluhisar؛ لواءِ قرہ حِصارِ شرقی: ز ۲)
قیرشہری (ایالتِ قرہ مان: و ۳)
قیصریہ (Kaisareia، قیصری؛ ایالتِ قرہ مان: و ۳)
کانقری رکنغری (چانغری؛ لواءِ کنغری: ھ ۲)
کِرماستی (لواءِ خُداوندِگار: ج ۲)
کسکِین (ایالتِ سِیواس: ھ ۳)

کشیش داغی (اولوداغ، بیثینیا کا اُولِیمپُوس Olympus: ج ۲)
کشیش داغی (ح ۳)
کلکیت (ایالتِ اِرضِ رُوم: ح ۲)
کلیس (لواءِ کلیس: ز ۴)
کماخ (ایالتِ اِرضِ روم: ح ۳)
کوتاہیہ (Kotyaion: ایالتِ آناطولی، لواءِ کِرمِیان: ج ۳)
کورہ (لواءِ قسطمونی: ھ ۲)
کوہودداغی (ج ۴)
کیغی (ایالتِ اِرضِ رُوم: ط ۳)
گدیز رگدُوس (لواءِ کِرمِیان: ج ۳)
گیردہ (گردہ) (لواءِ بولی: ھ ۲)
گکبوزہ (Dakibyza، گبزہ؛ لواءِ قوجہ ایلی: ج ۲)
گلیبولی (Kalliopolis، Gellipoli: ب ۲)
گمرو (Leninakan، Alexandropol: ی ۲)
گملیک (لواءِ خُداوندِگار: ج ۲)
گموش خانہ (گموشانہ: ایالتِ اِرضِ رُوم: ح ۲)
گوردوس (Gördes؛ لواءِ صارُوخان: ج ۳)
گوزل حِصار - ایدِین (ایدِین؛ لواءِ ایدِین: ب ۴)
گوک قلعہ سی (ایالتِ اَدَنہ: و ۴)
گونان (لواءِ بیغا: ب ۲)
گونک (Göynuk؛ لواءِ سُلطان اُویوگی: د ۲)
گیرہ سون (کراسُوس Kerasus؛ ایالتِ طرَبزُون: ح ۲)
گیک داغی (ھ ۴)
گیوہ (لواءِ سلطان اُویوگی: د ۲)
لاذقیہ (لاوُدیکیہ Laodikeia: و ۵)
لارندہ (قرہ مان: ایالتِ قرہ مان: ھ ۴)
لفکہ (لُوکہ Leukai، عُثمان ایلی؛ لواءِ سُلطان اُویوگی: ج ۲)
لُولہ بُرغاس (Luleburgoz: ب ۲)
ماردِین (ایالتِ دیاربکر: ط ۴)
مُجر (ایالتِ قرہ مان: و ۳)
مُدانیہ (لواءِ خُداوندِگار: ج ۲)
مِرِد سِرز داغی (و ۴)
مرزیفون (ایالتِ سِیواس: و ۲)
مرسِین (و ۴)
مرعَش (مَراش؛ ایالتِ مرعَش: ز ۴)

مِسیِس (Mopsuesteia؛ ایالتِ اَدَنَہ: و ۴)

مَعَرّۃ النُعمان (ز ۵)

مُغلَہ (لواءِ منتشا: ج ۴)

مَغنِیسہ (Magnesia، مَنِیسَہ: لواءِ صارُوخان: ب ۳)

مَکُری (فتحیّہ، لواءِ منتشا: ج ۴)

مَلازگرد (ایالتِ وان: ی ۳)

مَلطِیَّہ (Melitene؛ ایالتِ مَرعَش: ح ۳)

مَلکَرہ (ب ۲)

مَنبِج (ز ۴)

مَنوُغات (لواءِ اِیچ اِیل: د ۴)

مُودُرنی رمُدُرنی (لواءِ بولی: د ۲)

مُوش (ایالتِ وان: ط ۳)

مُوصِل (ی ۴)

میافارِقِین (سِلوان Silvan؛ ایالتِ دِیاربکر: ط ۳)

مِیخالِیچ (قَراجہ بِگ؛ لواءِ خُداوندِگار: ج ۲)

مِیلاس (لواءِ منتشا: ب ۴)

نُصَیبِین (Nisibis؛ ایالتِ دِیاربکر: ط ۴)

نوشہر (و ۳)

نِیکسار Neokaisareia؛ (لواءِ قَرہ حِصارِ شَرقی: ز ۲)

نِیگدہ (ایالتِ قَرہ مان: و ۴)

وُسطان (ایالتِ وان: ی ۳)

یِنگی شہر (لواءِ خُداوندِگار: ج ۲)

یلدِز داغی (ز ۲)

یلواچ (لواءِ حَمِید: د ۳)

یوزغاد (و ۳)

(تیشنر F. TAESCHNER)

----

* **آناطولی (۲):** [اَناطولی] (Anadolu) پندرھویں صدی عیسوی سے اٹھارھویں صدی عیسوی تک کے درمیان اس نام [آناڈولو] کا اطلاق اس صوبے (ایالت) پر ہوتا تھا جو آناطولی کے مغربی نصف پر مشتمل تھا (قب سابقہ مادّہ) اور جس میں زیادہ تر مغربی آناطولی کی ترکی ریاستیں شامل تھیں۔ ابتدا میں اَنقرہ اس صوبے کا صدر مقام اور اس کے والی (بگلر بگ) کی اقامت گاہ تھی اور بعد میں کُوتاہیَہ۔ 'آنادولو' کی ایالت میں حسبِ ذیل فوجی اضلاع (سنجاق یا لِواء) شامل تھے جو جزئی طور پر سابق میں امارتیں تھیں (یہ اُسی ترتیب سے مذکور ہیں جس میں کاتب چلبی نے جہان نُما میں ان کا ذکر کیا ہے): (۱) گرمِیان: صدر مقام کُوتاہیَہ؛ (۲) صارُوخان: صدر مقام مَغنِیسَہ (موجودہ منیسہ)؛ (۳) آیدِین: صدر مقام تیرَہ؛ (۴) [منتشا]: صدر مقام مُغلَہ؛ (۵) تکّہ: صدر مقام آنطالِیَہ؛ (۶) حَمِید: صدر مقام اِسپارتہ؛ (۷) قرہ حصارِ صاحِب: پہلے صدر مقام کا بھی یہی نام تھا (بعد میں آفیون قرہ حصار ہوا)؛ (۸) سلطان اُویوگی (بگڑی ہوئی شکل میں اکثر سلطان اُوگی)؛ صدر مقام اِسکی شہر؛ (۹) اَنقرہ: صدر مقام کا بھی یہی نام (جسے اِنگورِی بھی کہتے ہیں)؛ (۱۰) [کَنغرِی] [کانقیری]: صدر مقام کا یہی نام (موجودہ [چانغرِی]، چانکرِی)؛ (۱۱) قَسطَمونی: صدر مقام کا یہی نام (موجودہ قَسطَمونُو)؛ (۱۲) بولی: صدر مقام کا یہی نام (موجودہ بولُو)؛ (۱۳) خُداوندِگار: صدر مقام بُرُوسَہ (بُرسَہ)؛ (۱۴) قوجہ اِیلی: صدر مقام اِزنیقومِید (بعد میں 'اِزمِید، اِزمِیت۔ ان کے علاوہ اس میں حسبِ ذیل سنجاق بھی شامل تھے جو قپودان پاشا کے زیرِ حکومت تھے): (۱) قرہ سی: صدر مقام بالیکسرِی؛ (۲) بِیغَہ: صدر مقام کا یہی نام، نیز قلعہ سلطانیہ (یا چناق قلعہ سی)؛ (۳) سُغلہ: صدر مقام اِزمِیر [قب وہ مقالات جو ان میں سے ہر ایک پر [آآ، میں بھی دیے ہیں].

جب ترکیّہ کے ایشیائی حصّے میں 'آنادولو' کے علاوہ دوسری ایالتیں بنائی گئیں تو 'آنادولو' کی اصطلاح کا اطلاق غیر معیّن طور پر سلطنت ترکیّہ کے ایشیائی نصف پر بھی ہونے لگا، حتّٰی کہ جہاں سلطنت کے یورپی حصّے، رُوم اِیلی، کے لیے اعلٰی ترین ''قاضی عسکر'' (عمومی تلفُّظ: 'قَضَسکَر') مقرّر کیا جاتا تھا وہاں ایشیائی نصف کے لیے بھی قاضی عسکر متعیّن ہوتا تھا۔ ایشیائی قاضی عسکر کا فرض تھا کہ جب بادشاہ کسی ایشیائی مہم پر جائے تو وہ اس کے ہم رکاب رہے۔ اس کے علاوہ جس طرح رُوم اِیلی میں ایک ''دفتر دار'' (وزیرِ مال، محاسبِ اعلٰی) رکھا جاتا تھا اسی طرح آناطولی میں بھی ایسا عہدے دار ہوا کرتا تھا، اگرچہ اس آناطولی کے دفتر دار کا عہدہ رُوم اِیلی کے دفتر دار کے مقابلے میں محض نمائشی رہ گیا تھا.

۷ جُمادَی [الاُخرٰی] ۱۲۸۱ھ / [۷] نومبر ۱۸۶۴ء کو ولایتوں [صوبوں] کے بارے میں جو قانون نافذ کیا گیا اس کی رُو سے 'آنادولو' کی ایالت، جو حد سے زیادہ بڑی تھی، توڑ دی گئی اور خُداوندِگار، آیدِین، اَنقرہ اور قَسطَمونی کی سنجاقوں کو ولایتوں کا رتبہ دے کر باقی ماندہ سنجاقیں بھی انھیں میں شامل کر دی گئیں.

مآخذ: (۱) کاتِب چلبی: جہان نُما، استانبول ۱۱۴۵ھ / ۱۷۳۲ء، ص ۶۳۰ ببعد؛ مزید مآخذ کے لیے دیکھیے مادّۂ آناطولی (۱) یعنی سابقہ مقالہ.

(تیشنر F. TAESCHNER)

----

* **آناطولی حصاری:** [اَناطولی حِصاری] Anadolu Ḥiṣāri، ایک قلعہ (جو گُوزلِجہ حِصار، ینگیجہ، یِنگی یا آقچہ حِصار بھی کہلاتا ہے)۔ یہ قلعہ آبنائے باسفورس کے تنگ ترین حصّے پر واقع ہے اور اسے بایزید اوّل نے ۷۹۷ھ / ۱۳۹۵ء میں بیزانٹیون [استانبول کا قدیم نام] اور بحیرۂ اسود کے درمیان آمد و رفت بند کرنے کی غرض سے تعمیر کرایا تھا (قب عاشق پاشا زادہ، طبع

Giese، لائپزگ ۱۹۲۸ء، ص ۶۱، ۱۲۱، ۱۳۱؛ نشری، طبع تیشنر (Taeschner)، ج ۱، لائپزگ ۱۹۵۱ء، ص ۹۰؛ بہشتی: تاریخ؛ صولاق زادہ: تاریخ، استانبول ۱۲۹۸ھ، ص ۶۴؛ سعد الدین: تاج التواریخ، استانبول ۱۲۷۹ھ، ۱: ۴۱۸؛ منجم باشی: صحائف الاخبار، استانبول ۱۲۸۵ھ، ص ۳۱۰)۔ محمد ثانی نے جب ۸۵۶ھ/ ۱۴۵۲ء میں قلعہ رُوم ایلی حصاری [رک بآن] تعمیر کرایا تو اس قلعے کی درستی کی طرف بھی کچھ توجہ کی (اسی لیے غلطی سے اُسے آناطولی حصاری کا بانی بتایا جاتا ہے، قب [اوْلیاء] چلبی: سیاحت نامہ، ۱: ۴۶۶ ببعد)۔ جنگ وارنا سے پہلے، مرادِ اوّل کی فوجوں کے آناطولی کے ساحل سے یورپ کے ساحل تک جانے کے دوران میں، آناطولی حصاری نے ایک اہم کردار ادا کیا (قب (۱) نشری، محلّ مذکور؛ (۲) سعد الدین، ص ۳۷۹؛ (۳) منجم باشی، ص ۳۵۸؛ (۴) لطفی پاشا: تواریخ آل عثمان، استانبول ۱۳۴۱ھ، ص ۱۱۷)۔ استانبول کی فتح کے بعد اس قلعے کی فوجی اہمیّت جاتی رہی اور جب سیاسی اقتدار میں مزید تبدیلیوں کے باعث باسفورس کو دوبارہ محفوظ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو مراد رابع نے رُوم ایلی کوَاغی اور آنادولو کوَاغی میں جنگی استحکامات تعمیر کرائے تاکہ قازاقوں (Cossacks) کے حملوں کی روک تھام کی جا سکے۔ اس قلعے کا حال اوْلیاء چلبی (سیاحت نامہ، محلّ مذکور) نے قلم بند کیا ہے۔ مدّتِ دراز تک بے غوری کی حالت میں رہنے کے بعد ۱۹۲۸ء میں اس قلعے کی پوری طرح مرمّت کی گئی۔ آناطولی حِصاری نام کے ذیلی ضلع میں (جس کا ذکر اوْلیاء چلبی نے بھی کیا ہے) تقریباً پانچ ہزار کی آبادی ہے (بشمول قانلیجہ وچُبوقلی)۔ گورک صُو اور کُوچک صُو ندیاں، جو "یورپ کے آب ہاے شیریں" کے نام سے معروف ہیں، گزشتہ زمانے میں استانبول کے باشندوں کی مقبول ترین سیرگاہوں میں سے شمار کی جاتی تھیں اور ان کا ذکر ترکی ادب میں اکثر آتا ہے۔ یہاں قانلیجہ اور آناطولی حصاری کے درمیان "Maison de plaisance" ["کوشک مُفرّح"] واقع ہے جو اُس یبلاقی اقامت گاہ کا تنہا باقی ماندہ حصّہ ہے جسے عموجہ زادہ حسین پاشا نے ۱۶۹۵ء کے قریب تعمیر کرایا تھا۔ ابتدائی عثمانی عہد کی غیر فوجی تعمیرات کے جو معدودے چند نمونے رہ گئے ہیں انھیں میں یہ عمارت بھی ہے۔

مآخذ: (۱) S.Toy: *The Castles on the Bosporus*، اوکسفرڈ ۱۹۳۰ء، ص ۲۲۵ ببعد؛ (۲) H. Högg: *Türken-Burgen am Bosporus und Helles pont*، ڈریسڈن ۱۹۳۲ء، ص ۹ ببعد؛ (۳) A. Gabriel: *Châteaux Turcs du Bosphore*، پیرس ۱۹۴۳ء، ص ۹ ببعد؛ (۴) *I.A*، بذیل مادّہ۔

(آن ہیگر R. ANHEGGER)

----

* **آناموُر:** [اَنامور] آناطولی کے جنوبی ساحل پر ایک چھوٹا سا قصبہ اور بندرگاہ ہے؛ عرض شمالی ۶ً-۳۶°، طول شرقی ۱۰ً-۳۲°؛ ولایت ایچ ایل کی ایک قضا کا صدر مقام؛ آبادی ۲،۷۳۴ (۱۹۴۵ء، پوری قضا کی آبادی ۲۳،۷۲۵) نفوس پر مشتمل ہے۔ یہ قصبہ ایک میدان میں واقع ہے جو ایک چھوٹی سی ندی کے دہانے سے بن گیا اور رأس اَنامور [بُرونی - سامی] (Anamur Burnu) سے، جو آناطولی کا انتہائی جنوبی مقام ہے، تقریباً ۵ کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ازمنۂ وُسطٰی کے کشتی رانی کے ہدایت ناموں اور ان کی مشمولہ شرح بنادر (portulans) میں اس قصبے کا نام ستالیمُوری (Stallimuri)، ستالیمُورا (Stalemura)، وغیرہ دیا گیا ہے۔ ساحل پر اور اَنامور [بُرونی] کے دامن میں اور اس کی ڈھلانوں پر عہدِ قدیم کے دورِ متأخر اور ابتدائی مسیحی زمانے کے شہر آن مُوریَم (Anemurium) یا آن مُوریَم (Anemorium) کے وسیع کھنڈر ہیں.

آنامور کے میدان کے مشرقی سرے پر، ساحل کے قریب، مَمُوریہ قلعہ سی واقع ہے۔ یہ قرونِ وُسطٰی کا قلعہ ہے جو اچھی حالت میں ہے اور جس سے عثمانی سلاطین کام لیتے رہے اور اس کی مرمّت کراتے رہے تھے۔ اس بات کا ذکر ۸۷۴ھ/ ۱۴۶۹ - ۱۴۷۰ء کے ایک کتبے میں موجود ہے۔ قلعے کے اندر ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے.

مآخذ: کُوینے (V. Cuinet): *La Turquie d' Asia*، ۲: ۸۱ ببعد؛ (۲) توماشک (W. Tomaschek): *Zur historischen Topographie von Kleinasien im Mittelalter*، وی آنا ۱۸۹۱ء، ص ۵۹.

(تیشنر F. TAESCHNER)

----

* **آنہ:** (یا آنہ) [رک بہ مادّۂ سکّہ].

----

* **آنی:** قدیم ارمنی دارالسلطنت، جس کے کھنڈر دریاے اَرپہ چای (Arpa-Čay) جسے ارمنی اَخُوریان Akhuryan کہتے ہیں، کے دائیں کنارے پر اس دریا اور دریاے اَرَس (Araxes) کے سنگم سے بیس میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ ایک راے یہ ہے کہ شہر کا یہ نام شاید ایرانی دیوی اَناہیتہ (Anāhita) [ناہید ہ] [یونانی (Anaïtis)] کے نام پر رکھا گیا ہوگا۔ اس مقام پر میلادِ مسیح سے پہلے بھی آبادی تھی کیونکہ شہر کے نزدیک دورِ کفر کے مقبرے پائے گئے ہیں۔ قلعۂ آنی کا ذکر پانچویں صدی عیسوی کے سے قدیم زمانے سے ملتا ہے۔ اس کی بنیاد رکھتے وقت اس کے محلّ وقوع کو ملحوظ رکھا گیا تھا، جس کے ایک طرف تو تسَل کوت زَدْ زَور (Tsalkotzadzor) [ابن الاثیر مذکور در سطور آئندہ کا: دسل وردہ؟] کا گہرا کھڈ ہے جس میں ایک ندی بہتی ہے جو الاجہ (Aladja) کی پہاڑیوں سے نکل کر آتی ہے اور اس کھڈ میں بہتی ہوئی دریاے اَرپہ چای (Arpa-Čay) کی طرف جاتی ہے اور دوسری طرف اس دریا (اَرپہ چای) کا تند اور بلند کنارہ ہے [قب ابن الاثیر، طبع الاستقامہ، قاہرہ، ۸: ۱۰۰]۔ بعد کی صدیوں میں کامساراکان (Kamsarakan) کے شاہی خاندان کا (جس

کا تعلق اَرْشکیوں Arshakids سے تھا) آنی میں ایک محلّ بھی تھا اور اس عمارت کی، جو براہِ راست چٹان پر پتھر کے بڑے بڑے قطعوں سے چونے کی مدد کے بغیر بنائی گئی تھی، بنیادیں پائی گئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس عمارت کا قدیم ترین حصّہ ایک چھوٹا سا گرجا ہے جو ممکن ہے آٹھویں صدی کے قلعے سے پہلے بنایا گیا ہو اور جسے بعد میں خانوادۂ کامسارا کان (Kamsarakan) کے اراکین اپنے خانگی گرجا کے طور پر استعمال کرتے ہوں.

آٹھویں صدی سے لے کر، باقی اَرمنیہ کی طرح، آنی کا ضلع بھی خلفا کے زیرِ سیادت رہا۔ اس زمانے میں بگراتی خاندان (Bagratids) کے حکمران اپنے مقبوضات کو رفتہ رفتہ مستحکم کرنے اور خلفا کے ساتھ براہِ راست تعلّقات قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ۸۸۷ء میں اَشوْت (Ashot) [اَشُوط - بلاذری، ص ۲۱۱] بگراتی کو، جو ''اَرمنیہ اور گرجستان کا امیر الامرا'' تھا، اس کے ملک کے سرداروں نے اپنا بادشاہ بنا لیا اور خلیفہ نے اس کے اس مرتبے کی توثیق کردی۔ اس پہلے بادشاہ کے بیٹے سُمْبات (Smbat) کو (جسے عرب مصنّفین [سَنْباط] بن اَشُوط لکھتے ہیں) والی [آذربیجان وارْمِینِیَہ] یوسف بن ابی السّاج [دِیوْ داد] [م ۳۱۵ھ/جنوری - فروری ۹۲۸ء] نے ۹۱۴ء میں سولی پر چڑھا دیا مگر اس کے اس فعل کی ابن حَوْقل (ص ۲۵۲) نے ''ظُلم اور خدا اور اس کے رسول [صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم] کے خلاف بغاوت'' (''غَدْرًا منه و ظلمًا و خلافًا للّٰه تعالٰی و لرسولِه'') کہہ کر مذمّت کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سَنْباط (Smbat) کے عہد میں بھی بگراتی مملکت دَوِیْن (Dwin) (عربی میں: دَبِیْل) سے لے کر بَرْذَعَہ تک کے علاقے پر مشتمل تھی اور جنوب میں الجزیرہ (Mesopotamia) کی سرحدوں تک پہنچ گئی تھی (بقول الِاصْطَخْری: ص ۱۸۸، ۱۹۴)۔ مقتول بادشاہ کا بیٹا ''آہنی'' اَشوْت (Ashot)، ایک حدّ تک بوزنطی امداد سے، اپنی مملکت کو دوبارہ مسخّر کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اَرمنیہ کے فرمانروا کی حیثیت سے اس کا ایرانی لقب 'شاہنشاہ' تھا۔ یہ لقب اس سے پہلے اس کے پیش رو اور حریف اَشوْت بن شاپُوہ کو یوسف کے جانشین سَبُکْ [غلام یوسف] (Sabuk) کی طرف سے عطا ہو چکا تھا [۳۰۷ اور ۳۱۰ھ کے درمیان]۔ نویں صدی کے نصف اوّل میں بگراتی اَشوْت مُسَاکِر (Ashot Msaker) (''گوشت خور'') نے کامسارا کان (Kamsarakan) سے آنی کا ضلع خرید لیا لیکن اَشوْت ثالث (۹۶۱ - ۹۷۷ء) کے عہد میں جا کر ہی آنی شاہی دارالسلطنت مقرّر ہوا۔ فصیل، جو اس وقت بھی موجود ہے، سُمْبات ثانی (۹۷۷ - ۹۸۹ء) نے بنوائی تھی۔ ایک قدیم تر فصیل کا، جو ۹۶۴ء میں تعمیر ہوئی تھی، موقع محلّ ۱۸۹۳ء کی کھدائی سے متعیّن ہو گیا ہے؛ اور دونوں فصیلوں کے اندر گھرے ہوئے رقبوں کا باہمی مقابلہ کرنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آبادی نے کس قدر سرعت کے ساتھ ترقّی کی تھی۔ اور آگے چل کر شہری آبادی ان دیواروں کی نسبۃً تنگ حدود کے باہر نکل گئی۔ بگراتیوں (Bagratids) نے دریائے اَرپہ چای - (Arpa Čay) پر کئی پُل تعمیر کیے جس سے اس تجارتی آمد و رفت کے لیے، جو طَرَبْزُون اور ایران کے درمیان جاری تھی، یہ ممکن ہو گیا کہ وہ دَوِیْن کے بجائے آنی کے زیادہ چھوٹے راستے کو اختیار کرے۔ بگراتیوں اور ان کے دارالسلطنت کا عروج گاگِک (Gagik) [جاجق - بلاذُری، ص ۲۱۲] اوّل (۹۹۰ - ۱۰۲۰ء) کے عہد میں اوجِ کمال تک پہنچ گیا؛ ۹۹۳ء کے بعد سے آنی اَرمنیہ کے جاثلیق (Catholicos) کی اقامت گاہ بن گیا۔ متعدّد کتبوں سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ گاگِک (Gagik) کو بھی ''شاہنشاہ'' کا ایرانی لقب حاصل تھا جو ایک ارمنی شکل (*ark'ayitz* *ark'ai*) میں بھی پایا جاتا ہے۔ اسے ''ارمنوں اور گرجیوں کا بادشاہ'' بھی کہا جاتا تھا۔ ایک گرجے کے باقی ماندہ آثار، جسے گاگِک نے ۱۰۰۱ء میں تعمیر کرایا تھا، ۱۹۰۵ اور ۱۹۰۶ء میں کھود کر نکالے گئے اور ان میں بادشاہ کا ایک مجسّمہ ملا جس کے ہاتھ میں اِس کلیسا کا ایک نمونہ (model) تھا اور سر پر مسلمانوں کی سی پگڑی۔ ایسا ہی عمامہ اس کے پیشرو سُمْبات (Smbat) ثانی کی ایک برجستہ کار (ابھری ہوئی، relief) تصویر میں بھی موجود ہے جو ہَلْبَت (Halbat) کی خانقاہ میں محفوظ ہے.

گاگِک کے جانشینوں کے عہد میں یہ سلطنت نہایت تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہوتی گئی اور ۱۰۴۴ء میں یہ بوزنطی سلطنت کا ایک جز بن گئی؛ لیکن بوزنطی وُلاۃ (catapans) نے شہرِ آنی کی ترقی میں مزید مدد کی؛ چنانچہ ایک ارمنی کتبے کی رُو سے والی (catapan) ہارون (Aaron) نے آلاجہ کی پہاڑیوں سے شہرِ آنی تک پانی لانے کے لیے ایک شاندار آب گزر (aqueduct) بنوائی تھی.

رومیوں کی حکومت کا خاتمہ سلطان آلْپ اَرْسلان کے ہاتھوں ہو گیا جس نے ۱۰۶۴ء میں آنی کو فتح کر کے تباہ و برباد کر دیا۔ ابن الاثیر، ۱۰: ۲۷ [طبع ۱۳۴۸ھ المنیریہ، قاہرہ، ۸: ۱۰۰] کے بیان کے مطابق اُس وقت شہر میں ۵۰۰ گرجے تھے۔ رومانوس دیوجانس (Romanos Diogenes) کی شکست کے ایک سال بعد، یعنی ۱۰۷۲ء میں سلطان نے آنی کو بنوشدّاد [رَبِّ آن] کے مسلمان خاندان کے ہاتھ فروخت کر دیا اور بارھویں صدی کے آخر تک (بجز چند وقفوں کے) آنی اسی خاندان کی ایک شاخ کا مسکن رہا۔ اُس وقت شہر میں دو مسجدیں تھیں جن میں سے ایک سولھویں صدی کے نصف آخر میں منہدم ہوگئی؛ دوسری جو بچ گئی وہ (۱۹۰۷ء سے) ان چیزوں کے لیے، جو کھدائی میں برآمد ہوئی تھیں، بطورِ عجائب گھر استعمال کی گئی۔ وہاں اسی زمانے کی بعض مسیحی عمارتیں بھی موجود ہیں۔ شدّادی فرمانروا اپنی رعایا کے ساتھ، یہاں تک کہ عیسائیوں کے ساتھ بھی، فیّاضانہ سلوک کرتے تھے اور چونکہ انھوں نے بگراتیوں کے ساتھ شادی بیاہ کا رشتہ قائم کر لیا تھا، اس لیے وہاں کی عیسائی آبادی بھی انھیں اپنا ہم وطن اور جائز فرمانروا تسلیم کرتی تھی۔ ان کے عہدِ حکومت میں شہر پناہ کی مرمّت کی گئی اور چند برج بھی اس میں تعمیر کیے گئے.

آنی کو گُرجیوں نے سب سے پہلے ۱۱۲۴ء میں داؤد ثانی کی قیادت میں فتح کیا جس نے گُرجی بادشاہوں کے اقتدار کی بنیاد رکھی۔ شہرِ آنی زَکَرِیوں

(Zak'arids) (گرجی میں: Mkhargrdzeli = دراز دست) کو بطورِ جاگیر دے دیا گیا اور انھوں نے شہر کی چار دیواری کو بڑھا کر دریاے اَرپہ چای کے تند اور بلند کناروں تک پہنچا دیا۔ ارمنی روایت میں اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ گرجی فرمانروا (اپنے رومی، پیش رووں کی طرح) رومی صحیح العقیدہ رجحان کے حامی تھے؛ چنانچہ اس رجحان کی جھلک اس زمانے کی عمارتوں میں زیادہ تر نمایاں تھی۔ اس عہد میں مسلمانوں پر مذہب کی بنا پر کسی قسم کا ظلم و تشدّد نہیں کیا جاتا تھا، اُسی طرح جس طرح شدّادیوں کے دَورِ حکومت میں عیسائیوں کو کسی قسم کی ایذا نہ دی جاتی تھی۔ ایک مسلم ہم عصر، جس کا تعلیقہ ابن حَوقَل، ص ۲۴۲، میں موجود ہے، اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ گرجی فرمانروا ہر مضرّت سے اسلام کی حفاظت کرتا تھا اور مسلمانوں اور گرجیوں میں کسی قسم کا امتیاز نہیں برتتا تھا۔ غالبًا سلطنتِ طَرَبْزُون (Trebizond) کے قیام (۱۲۰۴ء) کے سلسلے میں آنِی بین الاقوامی تجارت کا ایک اہم مرکز بن گیا؛ دیکھیے A. Manandian: *O torgovle i gorodakh Armenii*، طبع دوم، اِیریوان (Erevan) ۱۹۵۴ء، ص ۲۷۸.

۱۲۲۶ء میں خوارزم شاہ جلال الدّین نے آنِی کا ناکام محاصرہ کیا اور ۱۲۳۹ء میں تاتاریوں نے اسے فتح کر لیا؛ لیکن اس فتح کے بعد بھی یہ شہر کچھ عرصے تک زَکَرِیوں (Zak'arids) کے قبضے میں رہا۔ صدر دروازے کے ایک کتبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعد کے زمانے میں یہ شہر ایران کے مغول فرمانرواؤں کا "ذاتی علاقہ" ("خاصِ اینجُو") متصوّر ہوتا تھا لیکن اسے وہ پہلی سی وقعت اور اہمیّت دوبارہ نصیب نہیں ہوئی۔ ایک روایت کی رُو سے آنی ۱۳۱۹ء میں ایک زلزلے سے آخری طور پر تباہ ہو گیا لیکن اس کے بعد کے زمانے کے سکّے اور کتبے دونوں دستیاب ہو چکے ہیں۔ ایک قسم کے تانبے کے سکّوں کو، جنھیں اِیلخان سلیمان (۱۳۳۹ - ۱۳۴۴ء) نے آنی میں جاری کیا تھا، ترک "میمون سِکّہ سی" یعنی "بن مانسی سکّے" کہتے ہیں کیونکہ ان سکّوں پر ایک آدمی کی تصویر ہے جس کے جسم پر بال ہیں۔ ایسے سکّے، جن پر آنی کا نام کندہ ہے، چودھویں صدی تک بھی جلائری حکمرانوں نے اور بعد ازاں پندرھویں صدی میں بھی قرہ قویونلو نے جاری کیے، گو حقیقت میں ٹکسال ضرور شہر سے باہر، شاید قلعۂ مَغازبَرد (Maghazberd) میں (جو آنی سے دو میل سے کسی قدر کم فاصلے پر ہے)، ہوگی۔ کھدائی سے جو آثار برآمد ہوے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ محلّات اور کلیساؤں کی تباہی کے بعد ایک وحشی اور فلاکت زدہ آبادی نے ان کھنڈروں پر اپنے مکان بنا لیے تھے۔ کِرپورٹر (Ker Porter) جب یہاں آیا (نومبر ۱۸۱۷ء) تو اس وقت ان گھروں کو اور ان کے جداگانہ کمروں کو، نیز بعد کے زمانے کے بازاروں کو بھی پہچان لینا ممکن تھا جو صرف ۱۲ سے ۱۴ فٹ تک چوڑے تھے۔ بعد میں آنی کا نام صرف ایک مسلمان بستی کی بدولت زندہ رہا جو انھیں کھنڈروں کے آس پاس بن گئی تھی۔ ۱۸۷۷ - ۱۸۷۸ء کی جنگ کے بعد آنِی روس کی سلطنت میں شامل کر لیا گیا تھا لیکن ۱۹۲۱ء کے معاہدے کے رُو سے ترکیّہ کو واپس کر دیا گیا۔ اب یہ قارص کی ولایت کے اندر اَرپہ چای کی قضا میں شامل ہے اور اس کی آبادی تقریبًا ۳۵۰ ہے۔

مآخذ: آنی کے تاریخی حالات زیادہ تر ارمنی مآخذ اور خصوصًا (۱) آسُولِک (Stephan Asolik) کے ہاں ملتے ہیں جو شاہ گاگِک (Gagik) اوّل کا ہم عصر تھا۔ عربی اور فارسی بیانات نہایت مختصر ہیں اور نویں اور دسویں صدی کے عرب جغرافیہ نگار اس کا کوئی ذکر نہیں کرتے؛ (۲) یاقوت (۱: ۷۰) کے ہاں آنِی پر صرف ایک سطر ہے؛ (۳) حمد اللہ مُستوفی، نُزھۃ، ص ۹۳، میں صرف یہ بیان کرتا ہے کہ اس علاقے کی آب و ہوا سرد ہے اور یہاں غلّہ بہت اور پھل کم پیدا ہوتے ہیں۔ وہ واحد اسلامی ماخذ، جس میں چھٹی/ بارھویں صدی میں آنی کے متعلّق مصادر اصلی سے ماخوذ مواد ملتا ہے، (۴) الفارِقی کی تأریخ میّافارقین ہے، موزۂ برطانیہ، شمارہ Or.5803 اور Or.6310؛ نیز دیکھیے مقامی فاضل (۵) برہان الدین آنَوی کی سبق آموز تاریخ (انیس القُلوب، جو ۶۰۸ھ/ ۱۲۱۱ء میں فارسی میں لکھی گئی اور جس کی کیفیت فؤاد کوپرولو نے *Türk Tarih Kurumu Belleten*، ۱۹۴۳ء، ص ۳۷۹ - ۵۲۱ میں بیان کی ہے)۔ نیز قب (۶) ابن الأثیر، ۱۰: ۲۷ (یہ مواد سارے کا سارا صحیح نہیں ہے)۔ دیکھیے مِنوَرسکی (Minorsky): *Studies in Caucasian History*، ۱۹۵۳ء، ص ۷۹ - ۱۰۶.

شہر کے کھنڈروں کو سب سے پہلے (۷) جِمِلّی - کارِیری (Gemelli-Carreri) نے ۱۶۹۳ء میں دیکھا تھا (*Collection de tous les voyages faits autour du monde*، جلد ۲، پیرس ۱۷۸۸ء: ص ۹۴) اور ۱۸۱۷ء میں (۸) کِرپورٹر (Ker Porter) نے ان کا حال نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے (*Travels*، جلد ۱، لنڈن ۱۸۲۱ء، ص ۱۷۲ - ۱۷۵)۔ ۱۸۳۹ء میں (۹) تیکسیے (Texier) نے شہر مذکور کے خاکے تیار کیے (*Voyages en Arménie*، پیرس ۱۸۴۲ء، *Atlas*، لوحہ عدد ۱۴) اور ۱۸۴۴ء میں (۱۰) آبِش (Abich) نے (قب M. Brosset): *Rapports sur un voyage dans la Géorgie et dans l'Arménie*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۵۱ء، *Atlas*، لوحہ عدد ۲۳ اور (۱۱) بُرُوسے (Brosset): *Les ruines d'Ani*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۰ء، *Atlas* لوحہ عدد ۳۰)۔ عیسائی یادگاروں کا حال (۱۲) (Muravyev) نے لکھا ہے، دیکھیے *Gruziya i Armeniya*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۴۸ء؛ اسلامی کتبوں کے لیے دیکھیے (۱۳) خانی کوف (Khanykov) (در ۱۸۴۸ء)، قب *Mélanges Asiatiques*، ۱: ۷۰ ببعد اور (۱۴) بُرُوسے (M. Brosset): *Rapports etc., 3-e rapport*، ص ۱۲۱ - ۱۵۰؛ (۱۵) Kästner کے تیّار کردہ البم (مرقّع) (۱۸۵۰ء) میں یادگار عمارتوں کی تصویریں ۳۶ ورقوں پر دی گئی ہیں اور ارمنی، عربی، ایرانی اور گرجی کتبے ۱۱ ورقوں پر دیے گئے ہیں (قب (۱۶) بُرُوسے (Brosset): *Les ruines d'Ani*، ص ۱۰ - ۶۳)۔ ارمنی مصنّفین میں سے (۱۷) نرسِس سَرکِسیان (Nerses Sarkisyan) اور (۱۸) سَرکِیس جلالیانتس (Sarkis Djalalyantz) نے ارمنی کتبے جمع کیے اور ان کے فراہم کردہ مواد سے شہر کی تاریخ کے سلسلے میں (۱۹) عالیشان (؟) Alishan

کی تاریخ میں کام لیا گیا ہے (وینِس ۱۸۵۵ء، ارمنی زبان میں، قب بُرؤسے (Brosset) در *Mélanges Asiatiques*، ۴: ۳۹۲-۴۱۲) مگر اب یہ کتاب متروک ہو چکی ہے.

روسیوں نے کھدائی کا کام ۱۸۹۲ء سے شروع کیا اور پروفیسر مار (N. Y. Marr) نے اسے ۱۹۰۴ء تک باقاعدگی کے ساتھ جاری رکھا۔ ان کھدائیوں کے نتائج کی بے شمار (۲۰) رونداد یں روسی جرائد میں شائع ہوتی رہیں۔ اور پھر ایک خاص سلسلہ (۲۱) (*Aniyskaya Seriya*) شائع ہوا جو مار (N. Marr)، اُوْرْبیلی (J. Orbeli) اور بارٹولڈ (Barthold) وغیرہ کی مرتبہ راہنما کتابوں (guide-books) اور مطالعات پر مشتمل ہے۔ زیادہ تفصیل کے لیے دیکھیے (۲۲) مار (N. Marr): *Ani. Kniz-naya istoriya goroda i raskopki*، ماسکو ۱۹۳۴ء اور (۲۳) T'oros T'oramanian کے عماراتی مطالعات (درارمنی)، ایریوان (Erevan) ۱۹۴۲ - ۱۹۴۴ء اور (۲۴) V. and I. Kratchkovsky: *Iz arabskoy epi-grafiki v Ani*، ارمغانِ علمی میں جو مار (N. Y. Morr) کو پیش کیا گیا، طبع ماسکو ۱۹۳۵ء، ص ۶۷۱ - ۶۹۳.

(بارٹولڈ - (مِنوْرسکی) (W. BARTHOLD-[V. MINORSKY]

✱ **آوہ:** (یا آبِہ) وسطی ایران کے دو شہروں کا نام: (۱) قصبۂ آوہ، جو آج کل ''آوج'' کہلاتا ہے، قزوین سے ہمدان جانے والی سڑک پر قزوین کے جنوب مغرب میں ستّر میل (۱۱۱ کیلومیٹر) پر واقع ہے؛ تقریباً ۳۵° ۳۵' عرض بلد شمالی اور ۴۹° ۱۵' طول بلد شرقی (گرینچ)۔ یہ قصبہ اپنی بلندی کی وجہ سے سرد سیر علاقے میں شمار کیا جاتا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں اس قصبے کی آبادی تقریباً ۱,۸۰۰ فارسی اور ترکی بولنے والے باشندوں پر مشتمل تھی.

قرونِ وسطٰی کے جغرافیہ نویسوں نے اس قصبے کے صرف مختصر حالات لکھے ہیں۔ یاقوت [۱: ۴۰۸] ایک عالم آوَ تی کا ذکر کرتا ہے جو آوہ کا رہنے والا تھا [اور جس سے وہ ۶۲۴ھ میں بیت المقدس میں ملا تھا؛ یہ شیخ صالح خود کو الآوِی، یعنی منسوب بہ آوہ، کہتا تھا]۔ اس قصبے کے نواح میں قدیم عمارت صرف ایک کاروان سرائے ہے جو شاہ عبّاس کے زمانے سے چلی آتی ہے [اور اب منہدم ہونے کے قریب ہے].

(۲) ایک اَور قصبہ، جو آبہ کہلاتا ہے، دریاے گاوماہا کے کنارے، جو عام طور پر خشک رہتا ہے، قُم کے مغرب کی طرف ۱۸ میل (۳۰ کیلومیٹر) پر شہرستانِ ساوہ کی بخش (county) جعفر آباد میں ہے اور اب محض ایک گاؤں رہ گیا ہے؛ ۳۴° ۴۵' شمالی عرض بلد اور ۵۰° ۲۰' مشرقی طول بلد (گرینچ)۔ قرونِ وسطٰی کے جغرافیہ نگار اس کا ذکر ساوہ کے ساتھ کرتے ہیں۔ اسے مغلوں نے تاخت و تاراج کر دیا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دوبارہ اہمیّت حاصل کر لی۔ بشرطیکہ یہ وہی آوہ ہو جہاں ایلخانی سکّے ڈھالے جاتے تھے (دیکھیے شپُولر (B. Spuler): *Die Mongolen in Iran*، برلن ۱۹۵۵ء، ص ۱۲۹).

موجودہ گاؤں کی آبادی ۱۹۵۰ء میں صرف ۸۸۵ باشندوں پر مشتمل تھی جو زمانۂ ماضی کے باشندوں کی طرح تیز و تند شیعی ہیں۔ آوہ کے نواح میں بہت سے قدیم مصنوعی ٹیلے ہیں اور گاؤں میں ایک قدیم ''امام زادہ'' [یعنی کسی امام زادے کا مقبرہ] بھی موجود ہے.

مآخذ: لی سٹرینج (Le Strange)، ص ۱۹۶، ۲۱۱؛ (۲) P. Schwartz: *Iran im Mittelalter*، ص ۵، ۵۴۹، ۵۴۲؛ (۳) حمد اللہ مُستَوفی: نزھۃ، ص ۶۰، ۲۲۱ (صرف دوسرا آوہ)؛ (۴) رزم آرا: فرہنگِ جغرافیاے ایران، جلد ۱، تہران ۱۳۲۸ش / ۱۹۵۰ء، ص ۲۶ - ۲۷ بعد؛ (۵) P. Schwartz: *Drei Ortslagen in Nord-Iran*، در *Isl.*، ۸ (۱۹۱۸ء): ۱۸ (صرف پہلا آوہ = اُدٗ؟).

(R. N. FRYE فرائی)

✱ **آہی:** [سلطان سلیم اوّل کے زمانے کا] ایک ترکی شاعر۔ اس کا اصلی نام، معلوم ہوتا ہے، بنگُو حسن، یعنی ''خال والا حسن'' تھا۔ اس کا باپ سیدی خواجہ تِرِسْتِنِیک (Trestenik) کا، جو شہر نکوپولس [نیکبولی، بلغارستان] سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے، سوداگر تھا۔ والد کی وفات کے بعد آہی قسطنطینیہ چلا گیا اور وہاں علمی مشاغل اختیار کیے لیکن خاصی مدّت گزر جانے کے بعد بھی وہ مُلازِم، یعنی معمولی امیدوار، کے درجے سے آگے ترقّی نہ کر سکا کیونکہ اس نے بُرُوسہ میں بایزید پاشا کے مدرسے میں مُدرّس کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر کار اسے شہر قَرہ فِرِیَہ (Berrhoea) (در ولایت سلانیک) میں مُدرّس کی جگہ لینی پڑی جو پہلے عہدے سے کم درجے کی تھی اور یہیں ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء میں اس کا انتقال ہوا۔ [قرہ فِرِیَہ کی ملازمت کے دوران میں اس کی شادی مناستر کے شاعر خاوری کی بہن سے ہوئی۔] اس نے دو نامکمّل منظومات چھوڑی ہیں جن کے نام ہیں: شیرین و پرویز (شیخی کی شیرین و خسرو کی تقلید میں) اور حُسن و دِل (استانبول ۱۲۷۷ء)۔ مؤخّر الذّکر ایک مثالیہ نظم ہے جو نثر میں لکھی گئی ہے اور اس میں جابجا اشعار لائے گئے ہیں۔ یہ فتاحی [رکّ بآن] کی اسی نام کی ایک تصنیف کی تقلید میں لکھی گئی ہے۔ گِب (Gibb) نے [اپنی تصنیف *History of Ottoman Poetry*، ۲: ۲۸۶ بعد، میں] اس کے مضامین کا خلاصہ لکھا ہے.

مآخذ: (۱) سہی، ص ۱۰۸؛ (۲) لطیفی (Chabert)، ص ۱۰۵؛ (۳) عاشق چلبی و قِنالی زادہ [حسن چلبی: تذکرۃ الشعراء]، بذیل مادّہ؛ (۴) گب (Gibb)، ۲: ۲۸۶ بعد؛ (۵) ہامر- پُورگشتال (Hammer-Purgstall): *Gesch. d. Osman. Dichtkunst*، ۱: ۲۰۹؛ (۶) یکی مجموعہ، ۱۹۱۸ء، عدد ۵۴؛ (۷) *Istanbul Kitaplīklarī Türkçe Yazma divanlar kataloğu*، عدد ۲۳.

(ادارۂ آ، طبع دوم)

----

* **آیات:** رک بہ آیۃ.

----

* **آیاس:** [اَیاس] ایک شہر جو کِلیکیا (Cilicia) کے ساحل اور خلیج اسکندرون کے مغربی کنارے پر دریاے جیحان (Pyramos) کے دہانے کے مشرق میں واقع ہے۔ اس کا عرض بلد ۵۳´ - ۳۶° شمالی اور طول بلد ۴۶´ - ۳۵° مشرقی ہے اور جُیحان (ولایت سَیحان/اَدَنہ) کی قضا میں ناحیۂ یُمُورطہ لِق کا صدر مقام ہے۔ زمانۂ قدیم میں یہ "ایگائی" (Aigi) کے نام سے مشہور تھا (Ramsay: *Historical Geography of Asia Minor*، ص ۳۸۵ بعد)۔ ازمنۂ وسطٰی کے اطالوی ملاح اور تاجر اسے اَیاچّو (Ajazzo) یا لایاچّو (Lajazzo) کہتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں اس کے باشندوں کی تعداد ۶۶۷ تھی (ناحیہ میں ۱۱،۰۲۴) (پاؤلی ۔ وِسّووا Pauly-Wissowa، ۱: ۹۴۵).

آیاس کی بندرگاہ کو (جو اُن دنوں ارمنیۂ کوچک کی عیسائی ریاست کا ایک حصّہ تھی) تیرھویں صدی کے نصف آخر میں جا کر کوئی اہمیّت حاصل ہو سکی جب صلیبیوں کے اُن علاقوں کو، جو بحیرۂ روم کے مشرقی ساحلوں پر واقع تھے، فرنگیوں نے خالی کر دیا اور طرسُوس کی بندرگاہ [جیحان کی لائی ہوئی مٹی سے] پٹ جانے کے باعث ناکارہ ہو گئی تو مغرب و مشرق کے درمیان ساری تجارت کا واحد مرکز یہی بندرگاہ بن گئی، جہاں سے ایک طرف شام اور دوسری طرف عراق، بلکہ (براہِ مشرقی آناطولی) ایران تک عمدہ خشکی کے کاروانی راستے بھی جاتے تھے۔ یہیں سے ۱۲۷۱ء میں مارکو پولو نے خشکی کے ذریعے ایشیا کے بیچوں بیچ اپنے سفر کا آغاز کیا۔ چودھویں صدی کے خاتمے پر فلورنس کے ایک باشندے پگولوتی (Pegolotti) نے تبریز کو جانے والی ایک کاروانی شاہراہ کا ذکر کیا ہے جو یہیں سے شروع ہوتی تھی۔ (*La pratica della Mercatura scritta da Francesco Balducci Pegolotti*، در *Delle Decima e delle altre Gravezze..... de Fiorentini fino al Secolo XVI*، ج ۳، لزبن و لُکّا (Lucca) ۱۷۶۶ء، ص ۹-۱۱ [تنقیدی طباعت از ایلَن اِیوَنز (Allan Evans)، کیمبرج میساچوسٹس ۱۹۳۶ء، اشاریہ بذیلِ مادّۂ Laiazo]؛ قب W. Heyd: *Geschichte des Levantehandels*، اشاریہ)۔ آیاس میں ایک وینسی [بُندُقی، وَندیکی] بیلو (Bailo = محافظ یا امین) بھی رہتا تھا۔

مسلمان افواج نے اس شہر کو ۶۶۵ھ/ ۱۲۶۶ء اور ۶۷۴ھ/ ۱۲۷۵ء میں لوٹا۔ مملوک سلطان الناصر محمد نے ۷۲۲ھ/ ۱۳۲۲ء میں اسے فتح کیا اور صلح نامۂ ۱۳۲۵ء کے بعد اسے عیسائیوں نے دوبارہ تعمیر کیا۔ بالآخر ۷۴۸ھ/ ۱۳۴۷ء میں یہ مصر کے مملوک سلاطین کے قبضے میں آیا۔ اس کے بعد سے اس پر زوال آنا شروع ہوا اور اس انحطاط کا یہ عمل یوں اور تیز ہو گیا کہ دریاے جیحان کا دہانہ گاد مٹی کے جمع ہوتے رہنے سے اتنا پھیل گیا کہ یہاں ایک دلدل بن گئی جو بخار کا گھر تھی؛ تاہم ۱۴۰۰ء میں بھی اس کا ذکر ولایت حَلَب کے اداری مرکز کی حیثیت سے آتا ہے۔ جب عثمانی [سلطان] سلیم اوّل نے مملوکوں کی سلطنت کو فتح کر لیا (۱۵۱۷ء) تو آیاس ایالتِ اَدَنہ کی ایک قضا بن گیا۔ آج کل آیاس یُمورطہ لِق (Yumurtalîk) ایک مفلوک الحال ساحلی بستی ہے جہاں بہت سے کھنڈر بکھرے پڑے ہیں۔

مآخذ: (۱) دِمشقی (طبع Mehren)، ص ۲۱۴؛ (۲) ابوالفداء: تقویم، ص ۲۴۸ بعد؛ (۳) قلقشندی: صُبح الاَعشٰی، ۱۲: ۱۶۹؛ (۴) مختصر صبح الأعشی قاہرہ ۱۹۰۶ء، ۱: ۲۹۷؛ (۵) رِٹّر (K. Ritter): *Erdkunde*، ۱۹: مقامِ مذکور، ص ۱۱۵، ۱۲۶؛ (۶) W. Heyd: *Geschichte des Levantehandels*، ۲: ۷۹ بعد؛ (۷) F. X. Schaffer: *Cilicia, (Petermanns Mitteilungen Ergänzungsheft* 141)، ص ۹۷؛ (۸) حاجی خلیفہ: جہان نما، ص ۶۰۳؛ (۹) تکسیے (Ch.Texier): *Asie Mineure*، ص ۷۲۹ بعد؛ (۱۰) سالنامۂ ولایت آدَنہ، سال دوازدہم، ۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۳ء؛ (۱۱) کُوینے (V. Cuinet): *La Turquie d' Asie*، ۲: ۱۰۷ بعد؛ (۱۲) *IA*، ۲: ۴۲ بعد (از بیسیم ارکوت).

(FR. TAESCHNER تیشنر)

----

* **آیاس پاشا:** [اَیاس پاشا] (۸۸۶-۸۸۷ تا ۹۴۶ھ/ ۱۴۸۲-۱۵۳۹ء) سلطنت عثمانیہ کا وزیر اعظم۔ آیاس پاشا البانیا کا رہنے والا تھا۔ وہ کیمیرہ (Cimera) (خیمارہ Himara) کے علاقے میں پیدا ہوا جو اَوْلونیہ (Valona) سے زیادہ دور نہیں (عالی؛ براگادینو Bragadino) (۹ جون ۱۵۲۶ء)؛ یُفْرا (Geuffroy)۔ براگادینو کے بیان کے مطابق ۹۳۲ھ/ ۱۵۲۶ء میں آیاس پاشا کی عمر ۴۴ برس تھی۔ اس کے تین بھائی تھے (اصل الفاظ "tre fradelli" ہیں۔ ہامر (Hammer) کے ہاں "tre fratelli monachi" غلط لکھا ہے) اور وہ ہر ماہ اپنی ماں کو، جو اَوْلونیہ میں عیسائی راہبہ "christiana monacha a la Valona" تھی، سو دوکت بھیجا کرتا تھا [دوکت ducat، یورپ کا چاندی یا سونے کا سکّہ جس کی اوسط قیمت تین چار شلنگ (چاندی کی صورت میں) اور $9\frac{1}{28}$ شلنگ (سونے کی صورت) میں تھی]۔ استانبول میں آیاس پاشا کی قبر پر جو کتبہ لگا ہے اس میں اس کا نام آیاس بن محمد لکھا ہوا ہے۔

آیاس پاشا سلطان بایزید ثانی (۸۸۶-۹۱۸ھ/ ۱۴۸۱-۱۵۱۲ء) کے عہد میں 'دِیوشِرمہ' قانون کے تحت بھرتی کیا گیا اور قصرِ شاہی سے 'آغا' کا عہدہ حاصل کر کے نکلا (عالی)۔ وہ یکی [ینی] چری فوج کے آغا (سردار) کی حیثیت سے جنگ چالدِران (۹۲۰ھ/ ۱۵۱۴ء) میں لڑا (شُکری؛ اِوْلیاء چلبی) اور علاء الدّولہ، فرمانرواے اَلبُستان (Albistān)، کے خلاف جب لڑائی ہوئی (۹۲۱ھ/ ۱۵۱۵ء) تو اس میں بھی شریک تھا (اِوْلیاء چلبی) اسی عہدے پر وہ ۹۲۲-۹۲۳ھ/

۱۵۱۶–۱۵۱۷ء میں سلطان سلیم اوّل کی تمام شامی اور مصری مہمات میں جنگی خدمات بجا لاتا رہا اور ان واقعات کی ایک روایت کے مطابق مصر کے آخری مملوک سلطان طُوْمان بای کی آخری شکست اور گرفتاری میں بڑی حد تک اس کا ہاتھ تھا (سُہَیلی)۔ جس زمانے میں سلطان سُلیمان تخت نشین ہوا (ستمبر ۱۵۲۰ء) تو معلوم ہوتا ہے کہ آیاس پاشا آناطولی کا بیگلر بیگ تھا کیونکہ ۹۲۵ھ/ ۱۵۱۹ء میں یِنگی چری فوج کا ایک نیا آغا مقرّر ہو چکا تھا (مصطفٰی چلِبی، صولاق زادہ).

شام میں جان بِردی الغزالی کی بغاوت (۱۵۲۰–۱۵۲۱ء) فرو کرنے میں مدد دینے کے بعد (سُہیلی) آیاس پاشا دمشق کا والی مقرر ہوا۔ اس عہدے پر وہ ربیع الثانی ۹۲۷ سے محرّم ۹۲۸ھ تک/ مارچ تا دسمبر ۱۵۲۱ء فائز رہا (لاؤسْت Laoust؛ نجم الدین الغزّی؛ ابن اِیاس)۔ ولایت روم ایلی کے بیگلر بیگ کی حیثیت سے وہ رودس کے محاصرے (۹۲۸ھ/ ۱۵۲۲ء) میں لڑا (مصطفٰی چلِبی؛ فرِیدُون) اور بعد ازاں وزیرِ ثالث اور پھر وزیرِ ثانی کے عہدے پر ترقی پا کر حسبِ ذیل مہمّات میں خدمات سرانجام دیں: مُہاج (Mohács) (۹۳۲ھ/ ۱۵۲۶ء)، وی انّا (۹۳۵ھ/ ۱۵۲۹ء)، گُونُس (Güns) (۹۳۸ھ/ ۱۵۳۲ء) اور عراق (۹۴۱–۹۴۲ھ/ ۱۵۳۴–۱۵۳۵ء) (مصطفٰی چلِبی؛ فرِیدُون؛ پِچوی؛ صُولاق زادہ؛ کمال پاشا زادہ)۔ ابراہیم پاشا کی وفات (۲۲ رمضان ۹۴۲ھ/ ۱۵ مارچ ۱۵۳۶ء) پر آیاس پاشا وزیرِ اعظم مقرّر ہوا اور اپنی وفات (یعنی ۹۴۶ھ/ ۱۵۳۹ء) تک اس عہدے پر قائم رہا۔ اس کے عہدِ وزارت کے اہمّ واقعات یہ ہیں: وینس کے خلاف جنگ (۹۴۴–۹۴۷ھ/ ۱۵۳۷–۱۵۴۰ء)؛ اِسْزِیک [تلفّظ غیر یقینی] (Eszék) پر آسٹرویوں کا حملہ (۹۴۴ھ/ ۱۵۳۷ء)؛ مولدوایا [بغدان] کی مہمّ (۹۴۵ھ/ ۱۵۳۸ء) اور سلیمان پاشا والی مصر کا دِیو (Diu، ہندوستان) پر حملہ (۹۴۵–۹۴۶ھ/ ۱۵۳۸–۱۵۳۹ء)۔ قورفہ (Corfu) کی مہمّ (۹۴۴ھ/ ۱۵۳۷ء) کے موقعے پر آیاس پاشا کی کوشش سے وہ اَلبانوی، جو اَوْلونیہ (والونہ) کے قرب و جوار میں بس گئے تھے، سلطنت عثمانیہ کے تحت آ گئے اور اس علاقے میں دِلْوِینِہ کی ایک نئی سنجاق وجود میں آ گئی (مصطفٰی چلِبی؛ عالی؛ پِچوی)۔ آیاس پاشا نے ۲۶ صفر ۹۴۶ھ/ ۱۳ جولائی ۱۵۳۹ء کو وفات پائی۔ اپنے معاصرین میں اس کی شہرت یہ تھی کہ وہ ایک ان پڑھ شخص ہے اور کچھ زیادہ سیاسی سوجھ بوجھ کا مالک بھی نہیں (عالی؛ براگادینو (Bragadino)؛ گیوای (Gévay))۔ اس کی ایک بیٹی گُوزلجہ رُستم پاشا کے ساتھ بیاہی گئی تھی جو بُودَہ (Buda) کا بیگلر بیگ مقرر ہوا (سِجلّ عثمانی)۔ اس کی ایک اور بیٹی (یا شاید اسی بیٹی؟) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی شادی سِلِسْتْرِہ کے 'سنجاق' کے حاکم سے ہوئی تھی (گیوای Gévay)۔ ابن طولون نے ہمیں جو معلومات بہم پہنچائی ہیں ان کی رُو سے احمد، آیاس پاشا کا ایک بھائی، پہلے قرہ مان کا والی تھا اور بعد ازاں دمشق کا والی مقرّر رہا (لاؤسْت Laoust).

مآخذ: (۱) جلال زادہ مصطفٰی چلِبی: طبقات الممالِیک (موزۂ برطانیہ، مخطوطہ شمارہ Add. 7855)، ۳۱ الف، ۶۵ ب، ۷۳ ب، ۱۵۸ الف، ۲۱۱ ب؛ (۲) عالی: کُنہ الاخبار (غیر مطبوعہ حصّہ: موزۂ برطانیہ مخطوطہ، شمارہ Or.32)، ۱۸۱ ب، ۱۸۷ ب تا ۱۸۸ الف؛ (۳) شُکْرِی: سِلِیم نامہ (موزۂ برطانیہ مخطوطہ، شمارہ Or.1039، ۹۳ ب)؛ (۴) اِوْلِیاء چلِبی: سِیاحت نامہ (استانبول ۱۳۱۴ھ – ۱۹۳۸ء)، ۱: ۴۱۶، ۴۴۳، ۴۴۳؛ ۳: ۱۷۵؛ ۶: ۱۳۵؛ ۹: ۳۸۸؛ ۱۰: ۶۷۶؛ (۵) سُہَیلی: تأریخ مصر الجدید (استانبول ۱۱۴۲ھ)، ۲۸ ب، ۳۹ الف، ۴۲ الف، ۵۰ الف–۵۱ ب؛ (۶) پِچوی: تأریخ، ج ۱، استانبول ۱۲۸۳ھ، ص ۲۰–۲۱، ۱۳۲ (مصطفٰی پاشا بحیثیتِ وزیرِ ثانی: ۹۳۵ھ)، ۱۵۳ (آیاس پاشا بحیثیتِ وزیرِ ثانی: ۹۳۶ھ)، ۱۹۶؛ (۷) صُولاق زادہ: تأریخ، استانبول ۱۲۹۷ھ، ص ۴۱۴، ۴۷۵، ۴۸۹؛ (۸) کمال پاشا زادہ: *Histoire de la Campagne de Mohácz*، طبع پاوہ دکُورتی (Pavet de Courteille)، پیرس ۱۸۵۹ء، ص ۱۵۸؛ (۹) فرِیدُون: مُنْشَئات السلاطین، طبع ثانی، ج ۱، استانبول ۱۲۷۴ھ، ص ۵۳۳، ۵۴۷، ۵۷۰، ۵۷۷، ۵۹۲؛ (۱۰) ابنِ اِیاس: بَدائعِ الظُّهور ... طبع P. Kahle و محمد مصطفٰی، ج ۵، استانبول ۱۹۳۲ء: ۳۸۶، ۳۸۸، ۳۹۴، ۴۲۶؛ (۱۱) نجم الدین الغزّی: الکواکِب السّائِرة، طبع جبرائیل-س- جَبُّور (اورینٹل سیریز، شمارہ ۲۰، امریکن یونیورسٹی بیروت)، ۲ (۱۹۴۹ء): ۱۲۵–۱۲۶؛ (۱۲) H. Laoust: *Les Gouverneurs de Damas*......(658-1156/1260-1744) *Traduction des Annalesd 'Ibn Ṭūlūn et d 'Ibn Gum 'a*، دمشق ۱۹۵۲ء، ص ۱۵۹–۱۶۰، ۱۶۷، ۱۷۴، ۱۸۳؛ (۱۳) *Relazione di Piero Bragadino*، در M. Sanuto: *Diarii*، ج ۴۱، وینس ۱۸۹۴ء، ص ۵۲۸ (منقول در E. Alberi: *Relazioni degli Amb-asciatori Veneti a lSenato*، سلسلہ ۳، ج ۳: ص ۱۰۴–۱۰۵؛ قب نیز وہی کتاب، ۳: ۹۶)؛ (۱۴) یُفْرا (A.Geuffroy): *Briefve Description de la Court du Grant Turc*، در J. Chesneau: *Le Voyage de M. d' Aramon*، طبع شیفر (Ch. Schefer)، پیرس ۱۸۸۷ء، تکملہ ۱۱: ۲۳۸؛ (۱۵) A. von Gévay: *Urkunden und Actenstücke*...، ج ۲، وی انّا ۱۸۳۸–۱۸۴۱ء: Gesandtschaft (۱۵۳۴ء)، ۵۳، III و Gesandts-chaft (۱۵۳۶ء)، ۱۱۵–۱۱۶ (آیاس پاشا کا مکتوب (۱۵۳۶ء) بنام فرڈِینںڈ شاہ آسٹریا)؛ (۱۶) عثمان زادہ تائب: حدیقہ الوزراء، استانبول ۱۲۷۱ھ، ص ۲۶–۲۷؛ (۱۷) کورپرُولُو زادہ محمد فؤاد: لطفی پاشا، در تورکیات مجموعہ سی، ۱، استانبول ۱۹۲۵ء: ۱۲۵، حاشیہ ۱ (آیاس پاشا کی تاریخ وفات کے بارے میں)؛ (۱۸) اوزون چارشی لی: عثمانلی دولتی زمانندہ... بعضی مؤهورلر، حقندہ بر تدقیق، در *Bell.*، ج ۴، شمارہ ۱۶ (۱۹۴۰ء): ص ۵۰۶ و لوحہ ۹۰، شمارہ ۳ (آیاس پاشا کی مہر) و طغرا و پنچہ لر ایلہ فرمان....، در *Bell.*، ج ۵، شمارہ: ۱۷/ ۱۸ (۱۹۴۱ء): ص ۱۳۷ و لوحہ ۳۶، شمارہ ۲۶ (پنچۂ آیاس پاشا)؛ (۱۹) محمد طَیّب گوکبِلگِن: *XV-XVI asi̊rlarda*

Edirne ve Paşa Livası، استانبول ۱۹۵۲ء، ص ۷۵، ۸۱؛ (۲۰) L. Fekete: Einführung in die Osmanisch-Türkische Diplomatik....، بُوداپسٹ ۱۹۲۶ء، دستاویزات ۳ تا ۵ و لوحہ ۱ (مکتوب آیاس پاشا (۱۵۳۶ء)): یہی دستاویز گیوای (Gévay) کے ہاں؛ (۲۱) ہامر۔ پُورگشٹال (Hammer - Purgstall)، ۳، (۱۸۲۸ء)، ۵۲، ۲۱۱، ۶۲۹، ۶۴۷، ۶۵۲، ۶۸۶؛ (۲۲) سِجّل عثمانی، ۱: ۴۴۶ - ۴۴۷؛ (۲۳) Arsiv Kılavuzu، کراسہ ۱، استانبول ۱۹۳۸ء، ص ۴۸؛ (۲۴) Istanbul Ansiklopedisi، ج ۳، بذیل مادّۂ آیاس پاشا تورہ سی (آیاس پاشا کے لوح مزار کا کتبہ)؛ (۲۵) IA، ج ۲ (۱۹۴۹ء)، بذیل مادّۂ آیاس پاشا (جاوید بیسُون M. Cavid Baysun).

(V. J. PARY)

✱ **آیاسْتِفانوس:** [اَیاسْتِفانوس] رَکّ بہ یشِیْل کُوری.

✱ **آیا سُولُوک:** [اَیا سولوک] آیا سَلُوق، آیا سُلُوغ، آیا ثَلُوغ (اَیوس تھیولوغوس "Aγιος θεόλογος" [=عزیز متکلّم]) [یعنی حضرت عیسٰی کے] حَواری اور انجیل نویس یوحنّا سے منسوب (جنھوں نے یہاں زندگی بسر کی اور یہیں وفات پائی)۔ قرونِ وسطٰی کے مغربی (لاطینی) مآخذ میں اس شہر کا ذکر اَلتُّو لُوگو (Altoluogo) کے نام سے آیا ہے۔ موجودہ زمانے میں (یعنی ۱۹۱۴ء) سے اسے سِلجُک کہتے ہیں۔ یہ آناطولی کے مغربی ساحل پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ ۳۷ درجے ۵۵ دقیقے شمالی اور ۲۷ درجے ۲۰ دقیقے مشرقی پر، کوہ بُلبُل داغی (کُورِیسُوس Koresos) کے دامن میں واقع، اُس میدان میں جس نے دریاے کُوچک مِندِرِس [قدیم قایِسْتَر یا قایِسْتْرُوس (Kaystros)] کے دہانے کو گھیر رکھا ہے، اس کا محلّ وقوع وہی ہے جہاں عہدِ عتیق میں شہر اِفِسُوس (Ephesus) (جسے عرب جغرافیہ نویس بھی اپنے زمانے میں اَفْصُوس یا اُفْسُوس کہتے تھے) آباد تھا۔ آج کل یہ اِزْمِیر ـ اَیدِین ریلوے لائن پر واقع ہے۔ یہ قُوش آطہ سی کی قضا میں اَقْچِیْلَر کے ناحیے کا صدر مقام ہے (ولایتِ اِزْمِیر)۔ انیسویں صدی کے آخر میں اس کے باشندوں کی تعداد ۲,۹۳۷ تھی (از روے کوِینے (V. Cuinet): Le Turquie d' Asie، ۳: ۵۰۵) اور ۱۹۳۵ء میں ۴۰,۰۲۵ (قُوش آطہ سی کی قضا کی آبادی ۱۷,۸۱۹ تھی).

ازمنۂ وسطٰی میں آیا سُولُوک کا شہر خاصی اہمیّت رکھتا تھا۔ ابن بطُّوطہ نے، جو یہاں ۷۳۳ھ/۱۳۳۳ء میں آیا تھا، لکھا ہے ([رحلۃ]، ۲: ۳۰۸ ببعد) کہ شہر کے پندرہ دروازے تھے اور یہ دریاے قایِسْتْرُوس (Kaystros) کے کناروں پر ایک اہمّ تجارتی مرکز تھا، جہاں بکثرت باغ اور تاکستان موجود تھے۔ بندرگاہ، جو اس شہر کی خوش حالی کا سبب تھی، قرونِ وسطٰی ہی میں دریاے قایِسْتْرُوس کی گادمٹی سے اٹ چکی تھی۔ تب اِفِسُوس کی جگہ قُوش آطہ سی کی بندرگاہ، جو یہاں سے جنوب مشرق میں ۱۵ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور جسے قرونِ وسطٰی کے مغربی مآخذ میں سکالانُووا (Scala nova) کہا گیا ہے، ترقّی پانے لگی۔ اس کی آبادی ۱۹۴۵ء میں ۵,۴۴۲ تھی.

اِفِسُوس تک عربوں کی پیش قدمی محض عارضی نوعیّت کی تھی (۱۸۲ھ/۷۹۸ء)۔ اسی طرح سلجوقی سلطان آلْپ اَرْسلان کے زیرِ قیادت ملازِگرد کی فتح (۱۰۷۱ء) کے بعد اس پر جو ترکی فوجوں کا قبضہ ہو گیا تھا وہ بھی پہلی صلیبی جنگ کے دوران میں دَرَوْلِیَہ (Dorylaeum) [اِسکی شہر] کے قریب صلیبیوں کی فتح (۱۰۹۷ء) کے ساتھ ختم ہو گیا۔ جب رومی سلجوقیوں کی سلطنت پر زوال آیا تو ترکی افواج ایک بار پھر مغربی آناطولی میں گھس کر بحیرۂ ایجَہ کے ساحل تک جا پہنچیں۔ یہاں انھوں نے اپنے قائدوں کے تحت امارتیں قائم کیں اور اِفِسُوس/آیا سولوک اِمارتِ آیدِین میں شامل کر لیا گیا۔ یہیں ابن بطُّوطہ کی ملاقات آیدِین اوغلو خِضر بیگ سے ہوئی تھی، جو وہاں کا امیر تھا۔ اس امیر کے تعلّقات اطالیہ کی جمہوری ریاستوں کے ساتھ قائم تھے اور اَیا سُولوک میں وندیک اور جنوآ کے قنصل خانے میں موجود تھے۔ جب ۱۳۹۱ھ میں [سلطان] بایزید ثانی نے ریاستِ آیدِین کا الحاق کر لیا تو آیا سولوک پہلی بار سلطنت عثمانیہ کے تحت آیا لیکن جب بایزید کو شکست ہوئی تو ۱۴۰۲ء میں امیر تیمُور نے وہ امراے آیدِین کو واپس دے دیا۔ ۱۴۲۵ء میں [سلطان] مراد ثانی کے عہد میں آیا سُولوک مستقل طور پر سلطنت عثمانیہ کا جز بن گیا اور تب سے یہ سنجاقِ آیدِین (اِیالتِ آناطولی، بعد میں ولایتِ آیدِین) کی ایک قضا چلا آ رہا ہے۔ تاہم اس کا قلعہ کَپتان پاشا کے ماتحت اور شُغْلَہ (اِزمیر) کی سَنْجاق میں شامل تھا۔ آہستہ آہستہ آیا سولوک پر زوال آتا چلا گیا اور اب اس کی آبادی گاؤں سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دریاے قایِسْتَر کے دہانے کے قریب بعض تغیّرات واقع ہوئے جن کی وجہ سے اب وہاں کا میدان عفونت زدہ دلدل بن گیا ہے اور دوسری یہ کہ قریب کی بندرگاہ قُوش آطہ سی نے ترقّی پا لی ہے.

یہاں کے قابلِ ذکر آثارِ قدیمہ میں آثارِ ذیل شامل ہیں: اِفِسُوس کے کھنڈر، حَواری یوحنّا کے مستطیل شکل کے گرجا (Basilica) کے آثار اور آیدِین اوغلو عیسٰی بیگ اوّل کی (چودھویں صدی کے آخر کے قریب) تعمیر کردہ شاندار مسجد، جو دمشق کی اُمَوی مسجد کے نقش پر بنائی گئی ہے۔ قلعے کی پہاڑی پَنایِر داغی (قدیم پیون (Pion)) کے دامن میں وہ غار آج بھی دیکھا جا سکتا ہے جہاں از روے روایت ''سات سونے والے'' [اصحاب کہف] سوئے تھے۔ بُلبُل داغی پر ایک چھوٹی سی ابتدائی زمانے کی مسیحی عمارت ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں [حضرت] مریم بتولؑ نے سکونت اختیار کی اور وفات پائی (پَنایَہ قَپُولو)۔ زمانۂ حال میں یہ مقام ایک زیارت گاہ بن گیا ہے اور حکومتِ ترکیہ نے یہاں تک ایک سڑک بنا دی ہے.

مآخذ: (۱) لی سٹرینج (Le Strange)، ص ۱۵۵؛ (۲) W. Heyd: Ges-

chichte des Levantehandels، قبّ اشاریہ؛ (۳) اِوْلیاء چلبی: سیاحت نامہ، ۹: ۱۳۷ بعد؛ (۴) سالنامۂ ولایتِ آیدِین، ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۸ء؛ (۵) تکسیے (Ch. Texier): *Asie Mineure*، ص ۳۱۰ بعد؛ (۶) A. Philippson: *Reisen und Forschungen im westlichen Kleinasien*، ۳: ۸۷ بعد؛ (۷) A. Grund: *Vorläufiger Bericht über Physiogeographische Untersuchungen im Delta- Gebiet des Kleinen Mäander bei Ajasolug (Ephesus)"*، در *SBAW*، وی آنا ۱۹۰۶ء، ۱۱۵: ۲۴۱ - ۲۶۲، ۲۵۷ بعد؛ (۸) بیسیم دارقوت (Besim Darkot): جوغرافی آراشتیری مَلَری *Coğrafî araştîr malari*، ۱: ۳۹ بعد؛ (۹) *IA*، ۲: ۵۶ بعد؛ (۱۰) Massignon: *Les Fouilles archéologiques d' Éphése et léur importance réligieuse*، در *Les Mardis de Dar El-Salam*، قاہرہ ۱۹۵۱ء، ص ۱ بعد؛ (۱۱) یہی مصنّف (اور دیگر لوگ): *Les sept Dormants d' Éphése*، در *REI*، ۱۹۵۴ء، ص ۵۹-۱۱۲، ۱۹۵۵ء، ص ۹۳-۱۰۶، ۱۹۵۷ء، ص ۱-۱۱۔

(FR. TAESCHNER تیشنر)

----

* **آیا صُوفِیا:** [اَیاصوفِیا] قسطنطینیہ (استانبول) کی سب سے بڑی جامع مسجد اور ایک زمانے میں مشرقی دنیاے نصرانیت کا سب سے ممتاز صدر کلیسا (Metropolitan Church)، جو ۱۴۵۳ء تک بالعموم H Μεγάλη 'Eχχλησλία'' کے نام سے معروف تھا اور اس سے پہلے جو تقریبًا ۴۰۰ء میں Σοφία (بغیر حرفِ تخصیص کے) اور پانچویں صدی سے H 'Aγία Σopία کہلاتا تھا [آیا صوفیا= حکمتِ مقدّسہ - سامی؛ = مسیح[ع] ''جو حکمتِ خدا ہیں''، جیکسن، ۱: ۸۶]۔

تازہ ترین تحقیقات سے پتا چلتا ہے کہ آیا صوفیا کو دراصل قسطنطینِ اعظم نے نہیں بلکہ اس کی وصیّت کے مطابق اس کے بیٹے قسطنطیوس (Constantius) نے اپنے برادرِ نسبتی لائی سِنیئیس (Licinius) پر فتح پانے کے بعد تعمیر کرایا تھا۔ اس وقت اِسے باسِلیقی صورت (Basilica: مستطیل شکل) میں بنایا گیا تھا اور ۱۵ فروری ۳۶۰ء کو اس کی رسمِ تقدیس ادا کی گئی تھی (قبّ شنائڈر A. M. Schneider: *Die vorjustinianische Sophienkirche*، در *BZ*، ۱۹۳۶ء، ص ۳۶) یہ ''کنیسۂ عظمٰی'' متعدّد اور مختلف تغیّرات سے دوچار ہوتا رہا۔ کئی بار آگ اور زلزلوں سے تباہ ہوا (چوبی چھت کا پہلا دالان (باسلیق) ۲۰ جون ۴۰۴ء کو اُسقف یوحنّا کُرِسُسْتُم (John Chrysostom) کے اخراج کے موقع پر آگ کی نذر ہوگیا)۔ ۸ اکتوبر ۴۱۵ء کو اس کا دوبارہ افتتاح ہوا اور تقریبًا ایک صدی تک ضرر سے بالکل محفوظ رہا، یہاں تک کہ ۱۳ جنوری ۵۳۲ء کی رات کو آت میدان [رتھ بان] (Hippodrome) کے متخاصم گروہوں کی لڑائی میں یہ ایک بار پھر (شہر کے ایک بڑے حصّے کی طرح، جس میں شاہی دفترِ اَسناد و اَوراق [archives] بھی شامل تھا) شعلوں کی لپیٹ میں آ کر تباہ ہوگیا۔

اس حادثے کے فورًا بعد شہنشاہ یوستنیانوس (Justinian) نے اپنے اس ارادے کا اعلان کر دیا کہ وہ اس گرجے کو ایسے شاندار طریقے سے دوبارہ تعمیر کرائے گا جس کی مثال پہلے کبھی نہ دیکھی گئی ہوگی۔ اس سے بھی پہلے یوستنیانوس یہ فرمان صادر کر چکا تھا کہ اس کی وسیع سلطنت کے صوبوں میں سے (جہاں بت پرستوں کے صنائع کے نمونوں کو دانستہ طور پر ٹوٹنے پھوٹنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا) قدیم یادگار عمارتوں کا قیمتی مسالا بادشاہ کی اقامت گاہ کو بھیج دیا جائے؛ اور آگ لگنے کے بعد یہ مسالا زیادہ تر آیا صوفیا کی دوبارہ تعمیر پر صرف ہو۔ تعمیرِ نو کا کام ترالَہ کے اَنتھِمیُوس (Aanthemius of Tralles) اور میلِیت والے اِیزِیڈور (Isidore of Miletus) کے سپرد کیا گیا؛ ان دونوں کا شمار تاریخِ عالم کے عظیم ترین معماروں میں ہوتا ہے۔ چونکہ شہنشاہ کی طرف سے حکم ملا تھا کہ نئی عمارت ایسی ہونی چاہیے کہ اس پر آگ اور زلزلے دونوں کا کوئی اثر نہ ہو سکے اس لیے معماروں نے فیصلہ کیا کہ اس کا نقشہ گنبد اور قبّے کی شکل کا ہو، جو ان خطروں سے محفوظ رہنے کی سب سے یقینی صورت تھی۔ اس عظیم الشان عمارت کا افتتاح [سنگِ بنیاد رکھنے سے پانچ سال دس ماہ بعد] ۲۷ دسمبر ۵۳۷ء کو حد سے زیادہ شان و شوکت کے ساتھ ہوا اور یوستنیانوس نے فخریہ طور پر کہا کہ ''اے سلیمان [بانی ہیکل بیت المقدس]! میں آپ سے بازی لے گیا'' [دیکھیے جیکسن، ۱: ۸۶ و ح ۲]۔ تاہم اس کے اپنے عہدِ حکومت ہی میں (۷ مئی ۵۵۸ء کو) ایک زلزلے کے باعث گنبد کا مشرقی حصّہ گر گیا، جس نے گرجے کے منبر (ambo)، ہیکل (tabernacle) اور قربان گاہ (altar) کو پاش پاش کر دیا۔ یہ گنبد بہت چپٹا بنایا گیا تھا؛ چنانچہ اب اُسے بیس فٹ سے زیادہ اونچا کر دیا گیا اور بڑے ستونوں کے پایوں کو زیادہ مضبوط بنا دیا گیا۔ اس طرح ۲۴ دسمبر ۵۶۲ء کو یہ دوبارہ افتتاح کے لیے بالکل تیار ہو چکا تھا۔ اس گرجے کا محلِّ وقوع واقعی قابلِ رشک تھا: جنوب میں اُوغُسطیوم (Augusteum) ہے، جو قومی جشن منانے کے کام آتا ہے۔ اس میں یوستنیانوس کا مجسّمہ اس طرح بنا ہے کہ وہ گھوڑے پر سوار ہے [کلاویخو نے، جس نے برونز کا یہ مجسّمہ ۱۴۰۳ء میں دیکھا، اس کے کوائف بیان کیے ہیں (دیکھیے Gay Le Strange (مترجم): *Clavijo Embassy to Tamerlane*، لنڈن ۱۹۲۸ء، ص ۷۲)۔ اب یہ مجسّمہ غائب ہے۔ دیکھیے جیکسن، ۱: ۹۳]۔ شمال میں (موجودہ زمانے میں [طوپ قپو] سرائے کی چار دیواری کے خاصے اندر) درباری گرجے، نفیس دَیر اور شاہی عہدے داروں کے محلّات ہیں اور مشرق میں، یعنی سمندر کی جانب، شاہی محل بنا ہوا ہے۔

زائر کو مغرب کی طرف وسط میں ایک صحن نظر آتا تھا جو ایٹریم (Atrium) کہلاتا تھا اور جس کے پہلوؤں میں کھلے ایوان تھے [ایٹریم اب موجود نہیں ہے،

جیکسن، محلِ مذکور]۔ یہاں سے چند دروازے (غالبًا چار یا پانچ) ایک بلند ایوان (Exonarthex) میں جاتے تھے، جو اسی ایٹریَم میں شامل تھا۔ یہاں سے پانچ دروازے اصل ایوان یا ایوان داخلی (Exonarthex) میں کھلتے تھے۔ ان کے علاوہ اس کے شمالی اور جنوبی سروں پر بھی ایک ایک دروازہ ہے۔ آگے چل کر راستے بٹ جاتے ہیں اور گرجے کے اندرونی حصّے میں داخل ہونے کے لیے مستطیل شکل کے نو دروازے ہیں۔ ان میں سے بیچ کے دروازے کو بڑے تکلّف سے رنگا گیا تھا اور یہ شاہی دروازے کے طور پر استعمال ہوتا تھا [دیکھیے آیا صوفیا کا خاکہ، جیکسن، ۱:۸۲ کے بعد]۔

یہ گرجا جس قطعۂ زمین پر بنا ہوا ہے وہ تقریبًا مربّع ہے۔ اندرونی جانب اس کا طول (مشرق کی بڑی محراب (apse) کو چھوڑ کر) تقریبًا ۷۵ میٹر اور عرض تقریبًا ۷۰ میٹر ہے۔ فرش صلیب نما بنا ہے اور اس کے اوپر [چار] کروی مثلّثوں والا (pendentive) قریب قریب نیم کُروی گنبد ۵۶ میٹر بلند بنایا گیا ہے [دیکھیے جیکسن، ۱:۳۹ بعد و ۸۳]۔ چونکہ بیرونی دیواریں اس کے وزن کی متحمّل نہیں ہو سکتی تھیں اس لیے اسے سنبھالنے کے لیے چار ستون اور بڑھا دیے گئے ہیں۔ پھر ان ستونوں کو سہارا دینے کے لیے چھوٹی چھوٹی، لیکن ساخت کے اعتبار سے اہم محرابیں اور ان کے ساتھ کے ستون موجود ہیں۔ گنبد کے مشرق اور مغرب میں دو مزید نیم مدوّر کمرے ہیں، جن میں سے ہر ایک پر تین نصف گنبد بنے ہوئے ہیں، اندرونی حصّے کی تشکیل میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ وسطی راہرو (aisle) سے ملحقہ سب بغلی کمروں کو دو منزلہ بنایا گیا تھا، جہاں (بوزنطی گرجاؤں کے دستور کے مطابق) بالا خانے کے ایوان (galleries) عورتوں کے لیے مخصوص کر دیے گئے تھے۔ ساری عمارت کا بوجھ ۱۰۷ ستونوں پر ہے (۴۰ نیچے اور ۶۷ اوپر) جو عمومًا ایک پارچہ رنگین سنگ مرمر (verde antico) سے بنائے گئے ہیں لیکن ان میں سے بعض سرخ سنگِ سُماق (porphyry) کے ہیں۔ آرائش و تزیین کی وہ افراط تھی کہ قرونِ وسطٰی کا زائر اسے دیکھ کر مبہوت رہ جاتا تھا، یعنی ہر جگہ سنگِ مرمر کا بکثرت استعمال، مسیح[ع] اور [حضرت مریمؑ]، رسولوں، حواریوں اور دیگر اولیا کی تصاویر، جن کے باعث معلوم ہوتا تھا کہ دیواروں پر رنگوں کا ایک سمندر موجزن ہے؛ اس پر مستزاد فرشتوں کے طبقۂ اشرف (seraphim) کی عظیم تماثیل (جو مرکزی گنبد کے کروی مثلّثوں میں بنی ہیں) اور طلائی پچی کاری، جس سے گنبد اور دیواروں کو ایسی شان سے مزیّن کیا گیا تھا کہ اس کی مثال پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ پچی کاری کی آرائش کا کام غالبًا یوستنیانوس کے آخری ایّام اور یوستین ثانی (Justinos II) کے عہد سے پہلے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا تھا۔

عمارت کی اصلی دیواریں اور ڈاٹ کی چھتیں سرتاسر اینٹوں سے بنائی گئی ہیں۔ قدس الاقداس (the sanctuary) (βῆμα) [بیما] گرجے کے وسطی حصّے کے مشرق میں واقع تھی، جس سے ایک خاصی بلند پردے کی دیوار، جس پر دینی تماثیل رکھی جاتی تھیں (Iconostatis) اور جو تصویروں اور کھلے کام والے ستونوں (openwork pillars) سے مزیّن تھی، اسے جدا کرتی تھی اس کے اندر [مذبح یا] قربان گاہ اور (مذبح کی چھتری (؟)) (ciborium) تھی اور یہاں سے بڑی محراب (apse) کو راستہ دیا جاتا تھا۔ یوستنیانوس کے زمانے میں یہاں ۴۲۵ پادری تھے (جو یقینًا تین اَور گرجاؤں میں بھی کام کرتے تھے) اور ۱۰۰ دربان۔ بوزنطی سلطنت کے خاتمے سے کچھ ہی عرصہ پیشتر آیا صوفیا کے گرجے کے مامورین کا اندازہ ۸۰۰ تک کیا جاتا تھا۔

وسیع پیمانے پر آیا صوفیا کی مرمّت پہلی بار شہنشاہ بازِل ثانی (Basil II) کے عہد میں ہوئی۔ ۲۶ اکتوبر ۹۸۶ء کو زلزلے سے گنبد کا ایک حصّہ گر گیا۔ اس سے عمارت کو جو نقصان پہنچا اس کی شہنشاہ نے مرمّت کروا دی (عمارت کی مغربی روکار میں بھدّے ڈھلوان محرابی پشتے غالبًا اس زمانے کی یادگار ہیں، (قب A. M. Schneider: *Die Grabungen im Westhof der Sophienkirche*، برلن ۱۹۴۱ء، ص ۳۲ بعد)۔ ۱۲۰۴ء میں جب قسطنطینیہ کو لاطینی [صلیبی جنگجوؤں] نے تاراج کیا تو اس گرجے کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ اسے بڑی سنگدلی سے لوٹا گیا اور مقدّس ملبوسات اور ظروف حملہ آوروں کے گھوڑوں کی جھاڑ پونچھ اور دانہ کھلانے کے کام تک کے لیے استعمال کیے گئے؛ ان سب باتوں کے باوجود اس کی حیثیت صدر گرجا کے طور پر تسلیم کر لی گئی اور یہ نئے شاہی خاندان کا مقامِ تاج پوشی قرار پایا۔ نہایت دُور رس تبدیلیاں، جو بوزنطی عہد ہی میں ہوئیں، چودھویں صدی میں عمل میں آئیں۔ اس صدی کے نصفِ اوّل میں چاروں طرف کی دیواریں مضبوط کی گئیں، خصوصًا مشرقی بازو کو باہر کی طرف سے بلند اور چوڑے پشتوں سے مستحکم کر دیا گیا۔

ہمیں بوزنطی دَور کے آیا صوفیا کی داخلی ہیئت کا بیان مسلمان وقائع نگاروں کے قلم سے نہیں ملتا۔ احمد بن رُستہ (ص ۱۲۴ بعد، ترجمۂ G. Wiet، قاہرہ ۱۹۵۵ء، ص ۱۳۹ بعد) پہلا مسلمان ہے جس نے اس بڑے گرجے کا بالتفصیل ذکر کیا ہے۔ مصنّف مذکور ۲۹۰ھ/ ۹۰۲-۹۰۳ء کے قریب زندہ تھا لیکن اُس نے یہ حالات ہارون بن یحیٰی سے اخذ کیے ہیں، جو نویں صدی میں کسی وقت قسطنطینیہ میں جنگی قیدی کی حیثیت سے موجود تھا۔ ہارون اس عمارت کا، جسے وہ الکنیسۃ العظمٰی (Μεγάλη Ἐκκλησία) کے نام سے یاد کرتا ہے، دراصل حال بیان نہیں کرتا بلکہ بوزنطی شہنشاہ کے ایک جلوس کی دل چسپ اور روشن کیفیت لکھتا ہے، جو کسی جشن کے روز کنیسہ تک گیا تھا۔ اس موقع پر مسلمان جنگی قیدی بھی گرجے (اس سے غالبًا گرجے کا صحن atrium مراد ہے) میں لے جائے گئے تھے اور انھوں نے [''اطال اللّٰہ بقاء الملک سنین کثیر''] ''خدا بادشاہ کو سالہا سال تک سلامت رکھے'' کے نعرے [تین دفعہ] لگا کر شہنشاہ کا خیر مقدم کیا تھا (وہی کتاب، ص ۱۲۵)۔ اس میں ایک جزوی تفصیل بالخصوص اہم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مغربی دروازے پر مُجَلِّس ' (جس سے اس کی

مراد غالبًا نشست گاہیں (benches) ہیں [مقالہ نگار کے ترجمے کی صحت مشکوک ہے، قب اصل عبارت: ''مجلس فیہ اربعۃ و عشرون بابًا صغارًا کل باب شبر فی شبر'']) سے پرے ۲۴ چھوٹے چھوٹے دروازے تھے، جن میں ایک ایک بالشت مربّع روزن تھے (ان کا ذکر کہیں اور نہیں آیا)؛ چوبیس گھنٹوں میں سے ہر گھنٹے کے بعد ان چھوٹے دروازوں میں سے ایک خود بخود کھلتا اور خود بخود بند ہو جاتا تھا[۱].

ابن رُستَہ کے بعد انحطاطِ خلافت کے ساتھ ساتھ مسلمان مصنّف دور افتادہ قسطنطینیّہ کے بارے میں اَور زیادہ خاموش ہوتے چلے گئے۔ چار صدیاں گزر جانے کے بعد یعنی جب ترک قبائل نے ایشیاے کوچک پر قبضہ کر لیا، شمس الدین محمد الدِمَشقی (طبع Frähn و Mehren، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۵ء، ص ۲۲۷) نے چند سطروں میں آیا صوفیا کا ذکر کیا ہے اور اس کا یہ بیان بھی اپنے سے ذرا پہلے زمانے کے سوداگرِ کاغذ احمد کی تصنیف پر مبنی ہے (وہی کتاب، ۸)۔ اس بیان میں ایک چیز خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، یعنی اُس کا بیان کہ اس گرجے میں ایک فرشتہ رہتا تھا جس کے رہنے کی جگہ ایک کٹہرے ('دَرَابزِین') سے گھری ہوئی تھی۔ اس سے اُس کی مراد بظاہر وہ تمام جگہ ہے جس میں قربان گاہ، مذبح کی چھتری (ciborium) اور بت نشین دیوار (iconostasis) بنی ہوئی تھی.

ایک مدّت کے بعد محمد بن بطُّوطَہ (طبع دِیفرِیمرِی (Defrémery) و سانگوِینیتِی (Sanguinetti)، ۲: ۴۳۴) پہلی بار آیا صوفیا کی تعمیر آصَف بن بَرَخیا سے منسوب کرتا ہے، جو [حضرت] سلیمان[ع] کی خالہ کے بیٹے فرض کیے جاتے ہیں [اور ان کے وزیر تھے، دیکھیے بذیل آصَف]۔ ابن بطوطہ کے بیان کی خاص خوبی یہ ہے کہ اُس نے صحن اور اُس کے اطراف کے کھلے ایوان (atrium، (''شِبْہُ مَشُورٍ'')] کا حال بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ اُسے، جیسا کہ اس نے صراحۃً کہا ہے، گرجے کی اصل عمارت میں داخلے کی اجازت نہیں مل سکی تھی، جس کا سبب ممکن ہے یہ ہو کہ وہ دروازے پر لگی ہوئی صلیب کے سامنے گھٹنوں کے بل کھڑے ہونے کے حکم کی (جس کا وہ ذکر کرتا ہے) تعمیل کرنے پر آمادہ نہ ہوا ہو [ابن بطوطہ کے الفاظ یہ ہیں: ولا یدعون احدًا یدخلھا حتّٰی یسجد للصلیب الاعظم ... و ھو علی باب الکنیسۃ مجعول فی جعبۃ ذھب].

جب ترکوں نے قسطنطینیّہ فتح کیا (۲۹ مئی ۱۴۵۳ء) تو بے پناہ، بے چارہ لوگ گروہ در گروہ بھاگ کر گرجے میں جا گھسے؛ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ فاتحین جب قسطنطین اعظم کے منار تک پہنچ جائیں گے تو آسمان سے ایک فرشتہ اترے گا اور فاتحین کو ان کے ایشیائی وطن کی طرف ہمیشہ ہمیشہ کے لیے واپس دھکیل دے گا؛ لیکن ترک بڑھتے چلے آئے۔ انھوں نے گرجے کے دروازے توڑ دیے اور خوفزدہ لوگوں کو، جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، باہر نکال کر [اسیر] بنا لیا۔ تاہم عینی گواہوں کے ہاں اس مقدّس معبد میں کسی عام قتل و خونریزی کی کوئی شہادت نہیں ملتی، حالانکہ یہ الزام اکثر لگایا جاتا رہا ہے۔ جب یہ لوٹ مار اور غارت گری ختم ہو چکی تو فاتح سلطان خود گرجے میں داخل ہوا، مگر گھوڑے پر سوار ہو کر نہیں، جیسا کہ اکثر بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے مؤذّن نے نماز کی اذان دی، جس میں کلمۂ تشہّد شامل ہوتا ہے اور فاتح سلطان اپنے ساتھیوں سمیت خداے وحدہ لاشریک لہ کے سامنے سجدے میں گر گیا اور اس طرح قسطنطیوس اور یوستنیانوس کا گرجا اسلام کے لیے وقف ہو گیا.

اسلامی فاتحین کے دَورِ حکومت میں ان کے مذہبی احکام کے مطابق داخل کنیسہ میں بڑی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ وہ فُسَیْفِسَا (پچی کاری) جس سے دیواروں اور چھتّوں کو مزیّن کیا گیا تھا اور جو ان کے یونانی صنّاعوں کے خیال میں ابد الآباد تک باقی رہنے والے تھے سرمئی قلعی کے نیچے چھپا دیے گئے۔ (چونکہ اِوْلِیاء چلبی: سِیاحت نامہ، ج ۱، نے فُسَیْفِسَا کا ذکر کیا ہے اس لیے ان میں سے چند ایک اس کے زمانے یعنی سترھویں صدی عیسوی تک ضرور نظر آتے ہوں گے)۔ وہ بت نشین دیوار (iconostasis) جو پادریوں اور عوام کے درمیان حائل رہا کرتی تھی توڑ ڈالی گئی اور وہ قیمتی آرائش جو مشرقی بازو یعنی بِیما (Bēma)، گرجے کا وہ چبوترہ جو بلند تر مرتبے کے پادریوں کے لیے خاص ہوتا ہے، میں تھی اتار لی گئی۔ چونکہ قدیم بوزنطی گرجاؤں کا رخ بیت المقدس کی طرف ہوتا ہے اور وہ نماز (قبلے) کی جانب رخ کر کے پڑھی جاتی ہے اس لیے فتح کے وقت ہی سے ترک مسجد کے مشرقی بازو کی طرف نہیں بلکہ کچھ اور جنوب کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے چلے آئے ہیں۔ محمّد ثانی کے عہد سے ہر جمعے کی نماز میں، سارے ماہِ رمضان میں عصر کے وقت اور عیدین کے موقع پر بھی خطیب ہاتھ میں لکڑی کی تلوار لے کر منبر پر چڑھتا تھا [رک بہ مادّہ عَنَزَہ در اآ اور جوئنبول (Juynboll): *Handbuch des*

[[۱] اآ ترکی بذیل Ayasofya جلد ۱۱، ص ۵۵ عدد vi پر ایک تعلیقہ دیا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے: بوزنطی اسناد میں ایک ساعت خانے کا ذکر ہے جو عمارت کے مغرب میں اَیٹریم (Atrium) کے قریب واقع تھا اور ہورولوگین (Horologion) کہلاتا تھا۔ اس میں نہایت کاری گری سے بنی ہوئی ایک گھڑی تھی۔ شنائڈر (Schneider): *Die Grábung im Westhof des Sophienkirche*، ص ۳۶ بعد کا یہ خیال ہے کہ یہ horologion وہ مدوّر عمارت ہے جو آج کل کلیسا کے صدر دروازے کے مغرب میں اَیٹریم کی دیوار سے ملحق ہے اور جس کے اوپر ایک گہوارہ نما محراب بنی ہوئی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ گھڑی کی ہارون بن یحیٰی نے تعریف و توصیف کی ہے اور اس سے مماثل ایک گھڑی غزّہ میں بھی موجود تھی (قب H. Diels: *Über die von Prakop beschreibene Kunstuhr von Gaza*، در *Abh. Pr. Ak. W.*، ۱۹۱۷ء، شمارہ ۷ و *Antike Technik*، ۱۹۲۰ء، ص ۲۱۹ بعد].

islam. Gesetzes، ص ۸۴، ۸۷] اور منبر کے پہلو میں ہمیشہ دو جھنڈے لگے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ سلطان محمد ثانی نے وہ زبردست پشتے بنوائے تھے جو جنوبی دیوار کے ساتھ ساتھ چلے گئے ہیں اور یہیں اس نے موجودہ اونچے اور پتلے مناروں میں سے پہلا منار بھی تعمیر کرایا تھا۔ سلیم ثانی نے وہ پشتے جو شمال کی جانب ہیں اور دوسرا منار جو شمال مشرقی گوشے میں ہے تعمیر کرایا۔ باقی دو منار اس کے بیٹے سلطان مراد ثالث نے بنوائے۔

سلطان مراد ثالث نے مسجد کی مکمّل مرمّت کا انتظام کیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا کام تو یہ تھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے عمارتی نقائص رفع کیے جائیں جو زمانہ گزرنے پر رفتہ رفتہ ظاہر ہوتے گئے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی مسجد کے خالی ایوان کی آرائش میں بھی اس کا بہت کچھ ہاتھ تھا۔ اس نے صدر دروازے کے پاس اندر کی طرف سنگِ جراحت (alabaster) کی دو بڑی بڑی ناندیں رکھوائیں؛ ان میں سے ایک میں ۱۲۵۰ لیٹر (litres) [تقریبًا ۳۰سو گیلن] پانی آ سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اس نے دونوں بڑے چبوترے (''مصطبہ'') بھی اپنے خرچ سے بنوائے۔ ان میں سے دائیں ہاتھ کے چبوترے پر دن کے بیشتر اوقات میں قرآن [پاک] کی تلاوت قراءت کے اس لب و لہجے کے ساتھ ہوتی رہتی تھی جو بلادِ مشرق کے تمام مذاہب میں دینی ترتیل سے مخصوص ہے اور بائیں ہاتھ والا چبوترہ امام کے استعمال کے لیے تھا۔ مراد ثالث نے بہت سا روپیہ صَرف کر کے گنبد کی چوٹی پر لگے ہوئے آدھے چاند پر سونے کا پترا بھی چڑھوایا۔ اس آدھے چاند کا قطر پچاس ایل [۱۸۷ فٹ ۱۶ انچ؛ ایک انگریزی ایل = ۴۵ انچ] تھا اور اسے صلیب کی جگہ نصب کیا گیا تھا۔ اس طرح بابِ عالی کی مسلمان رعایا بِتِینیا [خداوندگار] کے اولمپوس (Bithynian Olympus) جیسے دور مقام سے بھی اپنے مذہب کا نشان دیکھ سکتی تھی۔

سولھویں صدی کے نصفِ آخر میں گورستانِ نصاریٰ کو، جو جنوب کی طرف مسجد سے بالکل ملحق تھا، سلاطین کے قبرستان میں تبدیل کرنے کا کام شروع ہوگیا۔ قدیم ترین مقبرہ سلطان سلیم ثانی کا ہے۔ اس کا بیٹا مراد ثالث اور پوتا محمد ثالث بھی وہیں مدفون ہیں۔ سلطان محمد ثالث کے اُنیس بھائیوں کی قبریں بھی یہیں ہیں جنھیں اس نے اپنی تخت نشینی کے موقع پر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ چند عشروں کے بعد سلطان مصطفیٰ اوّل کا اچانک انتقال ہوگیا اور اس کی قبر کے لیے کوئی مناسب جگہ فوراً دستیاب نہ ہوسکی تو اس مقصد کے لیے قدیم اصطباغ خانے baptistry کو [دیکھیے آیا صوفیا کا خاکہ در جیکسن محلّ مذکور] (جو اس ایوان (narthex) کے جنوبی گوشے میں واقع تھا جس سے کلیسا کی نماز گاہ کو جاتے تھے اور)، جسے ترک زمانۂ فتح سے تیل کے گودام کے طور پر استعمال کرتے رہے تھے، لے لیا گیا۔ آگے چل کر اسی طرح مصطفیٰ اوّل کا بھتیجا سلطان ابراہیم بھی اسی جگہ دفن ہوا۔ اس کے بعد سے تیل کے ذخائر اصطباغ خانے کے شمالی جانب کے صحن اور ایوان میں رکھے جاتے ہیں [آیا صوفیا کے جوار کے تُربوں اور ان کے مدفونین کے لیے دیکھیے سامی، ۱: ۵۰۸]۔

سلطان مراد رابع نے، جس کے زمانے میں (۱۶۲۳-۱۶۴۰ء) ایک حدّ تک سلطنت کا عام احیا ہوا، مسجد کی خالی دیواروں کو مشہور خطّاط بچاقچی زادہ مصطفیٰ چلبی سے بڑے بڑے سنہری حروف میں آیاتِ قرآنی لکھوا کر یادگار طور پر مزیّن کرا دیا۔ ان میں سے بعض حروف، مثلاً الف، دس ایل (ells) [تقریبًا ۳۷ فٹ] لمبے ہیں۔ یہ آیات نقاشی اور خطّاطی کا حسین و جمیل نمونہ ہیں اور اکثر اُن کے حروف باہم متداخل ہیں، تاہم خط کے اعتبار سے خلفاے راشدین کے نام، جو [ان کے نیچے] نہایت واضح اور جلی لکھے گئے ہیں، زیادہ دل کش نظر آتے ہیں (ان ناموں کو تِکنِہ جی زادہ [خطّاط] ابراہیم اِفندی نے لکھا تھا، قب حدیقة الجوامع، ۱: ۴)۔ مسجد میں اسی زمانے کا ایک نہایت شاندار منبر ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ مرکزی محراب (apse) کے شمالی جانب کی احاطہ بند شہ نشین، یعنی مقصورہ، احمد ثالث نے بنوایا تھا۔ محمود اوّل (۱۷۳۰-۱۷۵۴ء) نے گیلری کی نیچے کی منزل میں وسیع چھت والا سلطانی راستہ، نیز ایک خوبصورت فوّارہ اور ایک مدرسہ (دونوں جنوبی جانب کے صحن میں) اور شمال میں ایک وسیع دارالطّعام (معروف بہ 'عمارت') صَرفِ خاص سے تعمیر کرایا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود مسجد میں ایک بیش قیمت کتب خانہ قائم کیا؛ لیکن اس بارے میں یقینی ثبوت موجود ہے کہ یہ کتب خانہ ایک قدیم تر بنیاد پر بنایا گیا تھا جو پہلے سے مسجد میں موجود تھی [یعنی کچھ کتابیں پہلے سے مسجد میں تھیں جن میں اضافہ کر کے یہ کتب خانہ قائم کیا گیا]۔ یہ سب چیزیں مشرق میں خانۂ خدا کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں [دورِ اسلامی کے اضافوں کے مختصر حال کے لیے دیکھیے سامی، ۱: ۵۰۸]۔

مراد رابع، فاتح بغداد، کے زمانے سے مسجد کی نگہداشت میں نمایاں کمی ہوگئی اور اسی زمانے سے سلطنتِ عثمانیہ کا عام زوال بھی شروع ہوا۔ ۱۸۴۷ء میں سلطان عبدالمجید نے مسجد کی تجدید کے لیے اطالوی فوساتی (Fossati) برادران کو مقرّر کیا تا کہ ایک تو جن حصّوں کے منہدم ہونے کا خطرہ پیدا ہو چکا تھا انھیں محفوظ کر دیا جائے اور دوسرے مسجد مجموعی طور پر زیادہ شاندار نظر آنے لگے۔ اس کام میں دو برس لگے۔ چونے کی پوتائی صرف انھیں مقامات پر رہنے دی گئی جہاں انسانی شبیہیں بنی ہوئی تھیں، باقی ہر جگہ دیواریں اپنی پرانی شان و شوکت کے ساتھ نمایاں ہوگئیں۔ بیرونی جانب کا سرخ اور زرد دھاریوں والا رنگ اسی تجدید کے زمانے کا ہے۔ سلطان نے جس طرح اپنے اجداد کے عظیم کارناموں اور مآثر کے احترام کا اظہار کیا وہ کسی قدر تعجب خیز ہے، کیونکہ سلطان محمد فاتح کے منار کے علاوہ، جس نے بوزنطی سلطنت پر آخری اور فیصلہ کن ضرب لگائی تھی، باقی تمام مناروں کی مرمّت کرائی گئی۔ تاہم بالآخر اطالوی معماروں کو اجازت مل گئی کہ وہ اس منار کو بھی دوسرے مناروں جتنا بلند

کر دیں۔ مشہور خطّاط مصطفٰی عزّت اِفِندی کی لکھی ہوئی آٹھ گول لوحیں بھی آیا صوفیا میں سلطان عبدالمجید کے عہد میں نصب کی گئیں۔

یہ واقعی خوش قسمتی کی بات ہے کہ دسویں صدی کے بعد سے مسجد کو زلزلوں سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ دیو قامت عمارت (جو عین زلزلوں کے علاقہ میں واقع ہے) انھیں پشتوں کی بدولت جنھیں آخری بوزنطی تاجداروں اور ترکوں نے اس کی چار دیواری کے تین پہلوؤں کے ساتھ ساتھ بنوایا تھا یورپ کی اَور سب عمارتوں سے زیادہ عرصے تک بنی نوع انسان کی خدمت کرتی رہی ہے۔ لیکن دوسری طرف ہوا کے وہ طوفان جو بلقان یا سمندر کی سمت سے آتے ہیں مسجد کے لیے بظاہر روز بروز زیادہ خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔

۱۹۰۶ء کے موسمِ گرما میں وزیرِ تعلیم نے کتب خانے کی عمارت کی مکمّل مرمّت کا حکم صادر کیا، جس کی دیکھ بھال کے لیے پانچ مہتمم (’خوجہ‘) مقرّر تھے جو ہفتے میں ایک ایک روز اس کی نگرانی کرتے تھے۔

ماہِ رمضان میں جب نمازِ عصر کے لیے امرا اور اربابِ دولت جمع ہوتے تھے تو مسجد ایک دلفریب منظر پیش کرتی تھی۔ تراویح کی نماز میں (جو غروبِ آفتاب کے [تقریبًا] ڈیڑھ گھنٹے بعد ادا کی جاتی ہے) تکلّفات نسبۃً کم ہوتے تھے۔ گنبد لاتعداد چراغوں سے منوّر کیا جاتا تھا، جو ایک دائرے کی صورت میں ترتیب دیے جاتے تھے۔ رمضان المبارک کی ستائیسویں شب یا لیلۃ القدر (ترکی: ’’قدر گیجہ سی‘‘) کو، جس میں قرآن پاک آسمان سے نازل ہوا، سب سے زیادہ شان و شوکت دیکھنے میں آتی تھی۔ پہلے سلاطین اکثر اس تقریب میں خود شریک ہوتے تھے لیکن سلطان عبدالحمید ثانی مسجد میں (اگر کبھی آتے تو) صرف وسطِ رمضان میں آتے تھے۔ اس موقع پر وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے بزرگوں کے قدیم محلّ میں تبرّکاتِ نبویؐ کی زیارت کے لیے کشتی میں بیٹھ کر آتے تھے (’’یومِ زیارتِ خرقۂ سعادت‘‘).

فتح کے فورًا ہی بعد ترکوں نے گرجے کی ابتدا اور اس کی فضیلت کے بارے میں کثیر التعداد داستانیں اپنا لیں جو بوزنطی دور کے آخری ایّام میں مشہور ہو گئی تھیں اور انھیں اسلامی رنگ دے کر نئے سرے سے چلا دے دی۔ آیا صوفیا کی ایک تاریخ (کتب خانۂ آیا صوفیا، شمارہ ۳۰۲۵) قسطنطینیہ میں مسلمانوں کے فاتحانہ داخلے سے کچھ ہی عرصے بعد احمد بن احمد الگیلانی نے (فارسی میں، ایک یونانی تصنیف کے نمونے پر) محمّد ثانی کے حکم سے لکھی تھی۔ بعد ازاں نعمت اللہ (م ۹۶۹ھ/۱۵۶۱-۱۵۶۲ء) نے اس کا ترکی میں ترجمہ کیا۔ بقولِ کاتب چلبی (طبع فلُوگل Flügel، ۲: ۱۱۶) ایک اَور فارسی کتاب بھی تھی جو اسی فرمانروا کی خاطر علی بن محمد القُوشچی [رک بآں] مشہور ہیئت دان اور گیہان شناس (cosmographer) نے لکھی تھی، تاہم اب اس کتاب کا بظاہر پتا نہیں ملتا۔ اس کتاب کی ایک اَور روایت، جو کسی گمنام مصنّف نے ۸۸۸ھ/۱۴۸۳-۱۴۸۴ء میں مرتّب کی تھی، برلن کے قومی کتب خانے Staatsbibliothek Berlin (مخطوطہ Orient 8°.821) میں دورِ عثمانی کی ایک تاریخ (’’تواریخ قسطنطنیۃ [فلائشر Fleischer: Türkische Hss. : (Pertsch) پرچ Kat. Dresden، شمارہ ۱۱۳؛ zu Berlin، شمارہ ۲۳۱]، جو تین سال بعد لکھی گئی) کے ضمیمے کے طور پر موجود ہے۔ یہ [’’تواریخ‘‘ مذکور سے] زیادہ دلچسپ تو ضرور ہے لیکن خیالات اور مآخذ کے اعتبار سے مذکورۂ بالا کتاب ہی جیسی ہے۔ تواریخ قسطنطنیۃ کی رُو سے کہانی یوں ہے کہ قسطنطینِ اعظم بن علاّنِیّہ کی بیوی آصِفِیّہ، جو بے حد دولت مند تھی، بہت نوعمری ہی میں فوت ہو گئی تھی اور اپنی آخری وصیت میں اس نے یہ فرمائش کی تھی کہ ایک ایسا گرجا تعمیر کیا جائے جو بلندی میں دنیا بھر کی عمارتوں سے بازی لے جائے۔ کہا جاتا ہے کہ فرنگستان سے ایک معمار آیا اور روایت کے مطابق اس نے کام کا آغاز یوں کیا کہ زمین کو ۴۰ ایل [۱۵۰ فٹ] تک کھودا تاکہ نیو پانی تک چلی جائے اور پھر گنبد کے سوا سارا گرجا تعمیر کرکے وہ وہاں سے فرار ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ دس سال تک یہ عمارت یونہی پڑی رہی اور اسے کسی نے نہیں چھیڑا، یہاں تک کہ وہی معمار واپس آیا اور اس نے عمارت پر گنبد تعمیر کیا۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس میں جو خاص قسم کا سنگِ مرمر استعمال کیا گیا ہے ـــ جس کا علم اُس کے علاوہ صرف دیووں کو تھا ـــ (درحقیقت یہ ’مرمرِ معدنی‘ ہے) یہ متعدّد ممالک سے لایا گیا تھا۔ کہتے (ہیں کہ چاروں چتّی دار (’سُماقی‘) ستونوں کا پتھر ’’metal‘‘ (جو ظاہر ہے کہ دراصل محض سخت ترین قسم کا سنگِ مرمر ہے) کوہ قاف سے لایا گیا تھا اور بڑے دروازے کشتی نوحؑ کے ان تختوں سے بنے تھے جنھیں اس سے پہلے [حضرت] سلیمانؑ بیت المقدس اور کیزِیقُوس (Kyzikos) [اَیدِین جق] [دیکھیے سامی، ۵: ۳۹۳۷] میں اپنی عمارتوں میں استعمال کر چکے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کل خرچ ۳،۶۰،۰۰۰ سونے کی سلاخوں کے مساوی ہوا تھا] ہر سلاخ کی قیمت ۳،۶۰،۰۰۰ فلوری (filori) تھی [۔ کہتے ہیں کہ قسطنطین اعظم کے پوتے شہنشاہ ہرقل (Heraclius) کے زمانے میں (جو آنحضرتؐ کا ہم عصر اور پوشیدہ طور پر آپ پر ایمان لا چکا تھا) یہ گنبد گر پڑا تھا لیکن اس دیندار بادشاہ نے فورًا اسے دوبارہ تعمیر کرا دیا۔ علیّ العربی الیاس کی تواریخ قسطنطینیہ و آیا صوفیا، جو اُس وقت صدرِ اعظم علیؔ ’’فربہ‘‘ [علی پاشا سمیز] (م ۲۸ جون ۱۵۶۵ء) کا ملازم اور ایک مدرّس تھا (فلُوگل Flügel: *Kat der kais. Hofbibl. Vienna*، ۳: ۹۷)، سلیمان اعظم (القانونی) کے زمانے میں لکھی گئی۔ اس کا قدیم ترین نسخہ، جو مصنّف نے اشاعت کے لیے تیار کیا، ۹۷۰ھ/۱۵۶۲-۱۵۶۳ء میں نشر ہوا۔ دو سال بعد مصنّف نے اس کتاب میں چند غیر اہم اضافے کرکے اسے ایک مختلف نام سے شائع کیا (یعنی تواریخ بنای آیا صوفیا، در مکتبۂ ملّیۂ پیرس، مخطوطات

ترکیّہ کا تکملہ، شمارہ ۱۵۴۶؛ تواریخ قسطنطینیّہ و آیا صوفیا و بعض حکایات، در پرچ (Pertsch): Catalogue of Turkish manuscripts of the Kgl. Bibl. Berlin، شمارہ ۲۳۲۔ فُورمُوں (Fourmont) کے ہاں ایک اَور مخطوطہ ہے: Cat. cod. man. Bibl. Reg.، ص ۳۱۹، شمارہ ۱۴۷،۱)۔ اس کی رُو سے آیا صوفیا کو شہنشاہ اُسْتُوْنِیانو کے عہد میں اِگْنادُوس (Ingnādūs) مہندس نے تعمیر کیا تھا (یہی محمد عاشق نے بھی لکھا ہے)۔ مجموعی طور پر یہ مصنّف زیادہ معقول نظر آتا ہے۔ وہ اپنے پندرھویں صدی کے پیشروؤں کی نسبت جزئیّات بہت زیادہ پیش کرتا ہے، کیونکہ اس نے مختلف بیانات نقل کر دیے ہیں، لہٰذا اُسے ان کی اس سب سے بڑی مسجد کی تاریخ کے بارے میں بہترین ترکی مصنّف سمجھنا چاہیے؛ اگرچہ ہمارے نقطۂ نظر سے وہ بالکل ناقابلِ اعتماد ہے۔

آیا صوفیا کے گرد جن حکایتوں کا جال بُنا جاتا رہا ہے ان کے مضامین زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کہانیوں کے روحانی رنگ کی تیزی سترھویں صدی میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی اور یہی وہ زمانہ تھا جس میں عثمانی ترک اس دنیا میں سب سے زیادہ نفرت کرنے والے نظر آتے ہیں۔ اس زمانے میں اس مقام کی نشان دہی کی جانے لگی جہاں پہلی صدی ہجری کے عرب بہادروں نے قسطنطینیّہ کے محاصرے کے وقت نماز پڑھی تھی، یا کلیسا کے اندرونی حصّے (nave) میں وہ مرکزی مقام جہاں سے [حضرت] خضر[ع] گرجے کی تعمیر کی نگرانی کرتے تھے۔ جنوبی گیلری (دہلیز) میں ایک مجوّف پتھر رکھا ہے، جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ [حضرت] عیسیٰ[ع] کا گہوارہ تھا۔ ایک اَور قصّے میں، جسے بعد کے زمانے تک نوجوان فقہا کی زبانی سنا جا سکتا تھا، حسینِ تبریزی کا ذکر آتا ہے، نیز یہ کہ اس نے مسجد آیا صوفیا میں مدرّسی کیسے حاصل کی: کہتے ہیں کہ صوفی سلطان محمد ثانی فاتح نے اس کی طرف اپنا ہاتھ اس طرح بڑھایا کہ اسے بجائے پشتِ دست کے ہتھیلی ('آیا') کو بوسا دینا پڑا۔ اس پر اس نے جھٹ یہ درخواست پیش کر دی کہ اسے ''آیا صوفیا'' کا مدیر مقرّر کر دیا جائے۔ قبلے کے قریب نام نہاد ''گیلا ستون'' (یاش دِیرِک) اور ''ٹھنڈی کھڑکی'' (صُوُوق پَنْجِرہ) ہیں، جنھوں نے زیارت گاہوں کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کر لی تھی، کیونکہ یہاں [سلطان] عبدالحمید ثانی کے عہد میں مسجد کی مقدّس چار دیواری کے اندر کئی کرامات ظہور میں آئیں۔ یہ کھڑکی ہی وہ جگہ ہے جہاں شیخ آق شمس الدین نے (جن کے الفاظ اپنے زمانے کے لوگوں کے دلوں میں واقعی جوش اور ولولہ پیدا کر دیتے تھے، جن لوگوں میں خود محمد فاتح بھی شامل تھا) پہلی بار قرآن کی تفسیر بیان کی تھی۔ زمانۂ حال تک بھی ہر شخص کا یہ پختہ عقیدہ تھا کہ ''ٹھنڈی کھڑکی'' میں سے تازہ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ جو برکتیں آتی ہیں وہ علومِ دینی میں گہرائی اور پختگی پیدا کرنے کے لیے مفید و مؤثّر ثابت ہوتی ہیں۔

۱۹۳۴ء میں صدرِ جمہوریہ کمال اتاتُرک نے اعلان کیا کہ اب سے آیا صوفیا اسلامی عبادت گاہ نہیں رہے گی اور انھوں نے اسے ادارۂ نوادر خانہ کی تحویل میں دے دیا۔ بعد میں فُسَیفسا کے اندر جو صورتیں نقش تھیں ان پر سے قلعی دور کر دی گئی اور ۱۹۳۶ء میں دوسری تصویروں کے علاوہ حسبِ ذیل تصاویر دوبارہ دکھائی دینے لگیں: [حضرت] مریم[ع] کی خوب صورت شبیہ، جس میں انھیں اپنے بچے کے ساتھ تخت پر بیٹھے ہوے دکھایا ہے اور ان کے ایک طرف شہنشاہ قسطنطین ہے (مع شہر قسطنطینیہ کی تمثیل کے، جس کی اس نے بنیاد رکھی تھی) اور دوسری طرف شہنشاہ یوستنیانوس (مع تمثیل کنیسۂ آیا صوفیا)۔ یہ تصویریں جنوبی ایوان (narthex) کے دروازے کے اوپر بنی ہوئی ہیں [جس سے کلیسا کے نماز خانے میں داخل ہوتے ہیں] اور مرکزی دروازے کے اوپر، جس سے ایوانِ مذکور سے کلیسا میں داخل ہوتے تھے (جسے قدیم زمانے میں شہنشاہی دروازہ کہتے تھے)، [حضرت] عیسیٰ[ع] کی ایک شبیہ ہے، جس میں وہ تخت پر تشریف فرما ہیں اور ان کے قدموں میں ایک شہنشاہ (غالبًا لیو سادس (Leo VI) یا زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ بازِلِ اوّل (Basil I)، قب شنائڈر (A. M. Schneider)، در Oriens Christianus، ۱۹۳۵ء، ص ۷۵-۷۹) بیٹھا ان کی پرستاری کر رہا ہے؛ پھر ایک اور شبیہ [حضرت] مریم کی ہے، جو محراب کے خم میں بنی ہوئی ہے۔

مآخذ: یوستنیانوس (Justinian) کے عہد کے بوزنطی مآخذ میں سے معتبر ترین یہ ہیں: پرُوکوپِی اَس (Procopius)، اَیگاتھی اَس (Agathias) اور پاؤلُس سیلِنتاریوس (Paulus Silentiarius)۔ قریبی زمانے کے مصنّفین میں سے بہترین یہ ہیں: (۱) Pierre Gilles: De topographia Constantinopoleos libri iv (لائنز Lyons ۱۵۶۱ء اور اس کے بعد کئی بار طبع ہوئی)؛ (۲) وہی مصنّف: De Bosphoro Thracio Libritres (لائنز ۱۵۶۱ء اور اس کے بعد کئی بار)؛ (۳) Charles du Fresne, Sieur du Cange: Historia Byzantina، پیرس ۱۶۸۰ء؛ (۴) فان ہامر (J. von Hammar): Constantinopolis und der Bosporus، ج ۱، پسٗت (Pesth) ۱۸۲۲ء؛ (۵) Σχαρλάτος A. Βυζάν τιος, Κωνσταντινούπολις، ج ۱، ایتھنز ۱۸۵۱ء؛ (۶) C. Fossati: Aya Sophia of Constantinople as recently restored، لنڈن ۱۸۵۲ء؛ (۷) زالتسِن برگ (W. Salzenberg): Altchristliche Baudenk mäler von Konstantinopel، برلن ۱۸۵۴ء؛ (۸) Auguste Choisy: L'art de bâtir chez les Byzantins، پیرس ۱۸۸۳ء؛ (۹) J. P. Richter: Quellen der byzantinischen Kunstgeschichte، یعنی Quellens chriften für Kunstgeschichte und Kunsttechnik des Mittelalters کا شمارۂ خصوصی، وِی انّا ۱۸۹۷ء، از آئیتلبر گرفون ایڈلبرگ

(Eitelberger von Edelberg) و Ilg؛ (۱۰) لِیتابی (W. R. Lethaby) وسوائن سن (Har. Swain son): *The Church of Sancta Sophia Constantinople: a study of Byzantine building*، لنڈن و نیو یارک ۱۸۹۴ء؛ (۱۱) ہائنرش ہولٹ سنگر (Heinr. Holtzinger): *Die Sophienkirche und verwandte Bauten der byzantinischen Architeckture*، (در *Die Baukunst*، طبع R. Borrmann و R. Graul، شمارہ ۱۰، برلن و شٹُٹ گارٹ ۱۸۹۸ء)؛ (۱۲) Εὐγένιος Μιχαήλ 'Αντωνιάδνζ, 'Εχφρασιζ τῆζ'Αγιάζ Σοφίαζ (in: Bι βλιωθήχη Μαρασλῆι تین جلدیں، ایتھنز و لائپزگ ۱۹۰۷ - ۱۹۰۹ء؛ (۱۳) Alfors Maria Schneider: *Die Hagia Sophia zu Konstantinopel*، برلن بلا تاریخ (۱۹۳۸ء)؛ (۱۴) ایک ترکی شرحِ احوال، جس میں ترکوں کے عہد کے تعمیری اضافوں کا حال اور کتبے دیے گئے ہیں، حافظ حُسین: حديقة الجوامع ، استانبول ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء، ۱: ۳-۸؛ مزید مآخذ در (۱۵) *IA*، ۲: ۷ ۴ - ۵۵ (عارف مُفِید مَنْسِل)۔ ہارون بن یحیٰی کے بیان کے لیے دیکھیے: (۱۶) محمد عِزّ الدین: *Un prisonnier arabe à Byzance*، در *REI*، ۱۹۴۱ - ۱۹۴۶ء، ص ۴۱ ببعد، جہاں سابقہ مطالعات کے حوالے دیے گئے ہیں۔ مسلمانوں کے اساطیر و حکایات کے بارے میں دیکھیے (۱۷) تاور (F. Tauer): *Notice sur les versions persanes de la légende de l' édification d' Aya Sofya*، در *Mélanges Fuad Köprülü*، استانبول ۱۹۵۳ء، ص ۴۸۷ ببعد؛ (۱۸) وہی مصنّف: *Les Versions persanes de la légende sur la construction d'Aya Sofya*، در *Byzantinoslavica* XV/1، ۱۹۵۴ء، ص ۱-۲۰؛ [(۱۹) جیکسن (Thomas Graham Jackson): *Byzantine and Romanesque Architecture*، کیمبرج ۱۹۱۳ء، ۱: ۸۲-۱۰۵؛ (۲۰) سامی: قاموس الاعلام، ۱: ۵۰۷ ببعد (بذیل آیاصوفیا)].

آیاصوفیا عظمیٰ کے قریب ہی جُنْدِی [چنجی] میدان کے نزدیک آیاصوفیا صغرٰی (کُوچک آیاصوفیا) واقع ہے۔ اسے یوستنیانوس (Justinian) نے تعمیر کرایا تھا اور پہلے وہ قدِّیس (سینٹ) سرجیوس (St. Sergius) اور قدِّیس باقوس (Bacchus) سے منسوب رہی تھی۔ اس میں ایک ہشت پہلو کی بنیاد پر (جس میں چار محرابی دالانوں کا اضافہ کیا گیا تھا) ایک قبّہ بنا ہے۔ محمّد ثانی کے رئیسِ حریم (قِزلَر آغاسی) [حسین آغا] نے اسے مسجد میں تبدیل کر دیا اور اُس وقت سے یہاں علومِ اسلامیہ کی تدریس اور نماز کا پورا پورا انتظام ہے۔ رَواق اور اس پر جو پانچ چپٹے قبے بنے ہیں وہ ترکی عہد کے ہیں.

([K. Süssheim سُوس ہائم] - [F. R. Taeschner تِیشنر])

آیت: آیۃ (ع؛ جمع: آی، آیای و آیات)، مختلف اقوال کے مطابق فَعِلة، فَعَلَة یا فاعِلَة کے وزن پر، کھلی ہوئی علامت یا نشانی، [معجزہ یا فقرۂ قرآنی کے معنی میں ہے؛ کسی ایسی علامت کے معنی میں بھی مستعمل ہے جو کسی شے کے پہچاننے کا ذریعہ ہو۔ یہ نشانی قسم قسم کی ہوسکتی ہے، مثلاً اللہ کے وجود اور اس کی وحدت کو سمجھنے کے لیے پوری کائنات ایک آیت متصوّر ہوسکتی ہے، انسانوں کو خوف زدہ کرنے والے مصائب بھی، بعض لوگوں کے لیے، اللہ کو یاد دلانے والی ایک آیت سمجھے جاسکتے ہیں یا کسی پیغمبر کے معجزے اس کی صداقت کو ظاہر کرنے والی ایک آیت ہیں۔ اس کے علاوہ لفظ آیت عبرت کے معنی میں بھی آتا ہے، چنانچہ یہ کلمہ قرآن مجید میں ان سب مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے (دیکھیے لسان العرب، ۱۸: ۱۶۶ ببعد، عاصم: قاموس ترجمہ سی، مادۂ الآیہ)۔ جہاں تک قرآن کی آیتوں کا تعلّق ہے، اصطلاحًا آیت "قرآن میں وہ جملہ ہے جو حقیقی یا تقدیری طور پر ایک ابتدا اور ایک انتہا رکھتا ہو اور قرآن کی کسی سورہ میں پایا جاتا ہو"، یا ایک اَور تعریف کے مطابق "آیت قرآن کے اندر اس کا وہ حصّہ ہے جو اوّل اور آخر سے منقطع ہو" (دیکھیے طاش کوپروزادہ: مفتاح السعادۃ، حیدرآباد ۱۳۲۹ھ، ص ۲۵۳؛ موضوعات العلوم، استانبول ۱۳۱۳ھ، ۲: ۳۸)۔ لیکن [بعض] آیتوں کی تعیین کا عمل توقیفی ہے، یعنی تعیین قیاس سے نہیں کی جاسکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مثلاً الٓمٓ (۲ [البقرۃ]: ۱)، الٓمٓصٓ (۷ [الاعراف]: ۱) دونوں ایک آیت شمار ہوتے ہیں، بحالیکہ الٓرٰ (۱۲ [یوسف]: ۱) ایک آیت نہیں مانی جاتی۔ علاوہ ازیں بعض آیتیں، باوجود اس کے کہ وہ ازخود کسی حکم کا افادہ نہیں کرتیں، پھر بھی آیت سمجھی جاتی ہیں (مثلاً سورۂ فاتحہ میں: الرّحمٰن الرّحیم؛ مدھامّتانِ ۵۵ [الرحمٰن]: ۶۴)، نیز بعض آیتیں نصف صفحے (مثلاً ۴ [النّساء]: ۱۲) بلکہ ایک صفحے کے پھیلاؤ میں ہیں (حمدی یازِر: حق دینی قرآن دِلی، ج ۱، استانبول ۱۹۳۱ء، مقدِّمہ، ص ۲۳ ببعد)۔ آیتیں ایک دوسری سے فاصلہ (جمع: فَواصِل) کے ذریعے علٰیحدہ ہوتی ہیں؛ آیت کا جو آخری کلمہ ہوتا ہے اس کے آخری حرف کو "فاصلے کا حرف" کہتے ہیں (مثلاً سورۂ فاتحہ میں فاصلے کے حرف میم اور نون ہیں۔ سورۂ بَقَرہ میں م، ن، د، ب، ر، ق اور ل ہیں)۔ فاصلہ شعر کے قافیے اور سجع کے قرینے سے مشابہ ہے — بلکہ سَجع کے قرینے اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے — اور اسی لیے بعض لوگ قرآن میں سجع کی موجودگی کے قائل ہیں، لیکن اس قول کی تردید یہ کہہ کر ہوسکتی ہے کہ سجع میں تو قرینہ اصلی غایت اور اس کے برخلاف فاصلہ معنی کے تابع ہے اور اصلی غایت نہیں ہے؛ اور اَشعَرِی بھی یہ دعوٰی کرتے ہیں کہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ قرآن میں سَجُع موجود ہے۔ حقیقت جو کچھ بھی ہو، بہرحال قرآن کی وقعت کو بلند کرنے اور بالخصوص اس کی تنزیہ اُس سجع سے کرنے کے لیے جو دورِ جاہلیت کے کاہنوں کے اقوال میں پایا جاتا تھا اس کا ایک علٰیحدہ نام رکھ دیا گیا ہے۔ شیخ شمس الدین ابن الصّائغ الحَنَفِی (م ۷۷۶ھ، دیکھیے کشف الظّنون، استانبول ۱۹۴۱ء، ۱: ۱۸؛ براکلمان: *GAL* میں اس شخص کا ذکر نہیں ہے) نے ان

فواصل کے احکام کو تحقیق کیا تھا اور اس موضوع پر اِحکام الرّأیِ فی اَحُکامِ الآیِ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے (اس کے خلاصے کے لیے دیکھیے الاِتُقان فی تفسیر القرآن، قاہرہ ۱۲۸۷ھ، ۲: ۱۱۰ ببعد اور اس سے نقل کرتے ہیں مفتاح السّعادۃ، ۲: ۳۴۵ اور موضوعات العلوم، ۲: ۱۵۹).

قرآن کریم کی آیتیں نزول کے اعتبار سے ان اصناف میں منقسم ہیں: مکّی، مدنی (یہ دونوں اصطلاحیں بالعموم تین مختلف معنوں میں استعمال ہوتی ہیں، یعنی (۱) مکّی وہ آیتیں ہیں جو خواہ ہجرت سے پہلے اور خواہ ہجرت کے بعد، فتح مکّہ کے وقت یا حجۃ الوداع کے موقع پر، نازل ہوئیں؛ جو آیتیں کسی سفر (مہمّ) کے دوران میں نازل ہوئیں وہ نہ تو مکّی ہیں اور نہ ہی مدنی؛ (۲) مکّی وہ آیتیں ہیں جو اہلِ مکّہ کو خطاب کرنے کے لیے نازل ہوئیں اور مدنی وہ جو اہلِ مدینہ کو خطاب کرتے ہوئے نازل ہوئیں؛ (۳) ہجرت سے پہلے نازل ہونے والی آیتیں مکّی اور ہجرت کے بعد نازل ہونے والی، خواہ ان کا نزول مکّے ہی میں ہوا ہو، مدنی ہیں)، حَضَری، سَفَری، صَیُفی، شِتَائی، فَرَاشی (بستر میں نازل ہونے والی)، نَومی (سوتے میں نازل ہونے والی (مثلاً سورۂ کوثر)، ارضی، سماوی (دیکھیے الاِتُقان، ۱: ۱۰ ببعد؛ تھانوی: کشّاف اصطلاحات الفنون، کلکتہ ۱۸۶۲ء، ۱: ۱۰۵ ببعد؛ مفتاح السّعادۃ، ۲: ۲۳۸؛ موضوعات العلوم، ۲: ۱۶ ببعد)۔ آیتیں اُن احکام کی ماہیّت کے اعتبار سے جن پر وہ محتوی ہیں مُحُکمات اور مُتَشابِہات کے نام سے دو قسموں میں منقسم ہیں اور یہ تقسیم خود قرآن میں بھی پائی جاتی ہے (دیکھیے ۴ [النساء]: ۷)۔ مُحُکَمات وہ آیتیں ہیں کہ جن کے معنی کی توضیح کی کوئی حاجت نہیں یا جن کے معنی ایک ہی شکل میں ہو سکتے ہیں؛ مُتَشابِہات وہ آیتیں ہیں جو ان حروف مُقطَّعَات کی طرح، جو سورتوں کے شروع میں پائے جاتے ہیں، اپنے معانی کی وضاحت خود نہیں کرتیں، یا جن کی تاویل کئی طرح سے ممکن ہے (دیکھیے الاِتُقان، ۲: ۱ ببعد؛ مفتاح السّعادۃ، ۲: ۲۹۱ ببعد اور موضوعات العلوم، ۲: ۹۱ ببعد).

[**مآخذ**: مآخذ متن میں درج ہیں۔ نیز دیکھیے: (۱) قُرطُبی: الجامع فی اَحکام القرآن، ۱: ۵۷ ببعد؛ (۲) سُیُوطی: اِتقان، باب ۱، ۱۹، ۲۸، ۵۹، ۶۲، ۶۳؛ (۳) Fleischer: *Kleinere Schriften*، ۱: ۶۱۹، حاشیہ ۲؛ (۴) Jeffery: A. *Foreign Vocabulary of the Qur'an*، ص ۷۲، ۷۳؛ (۵) Spitaler: A. *Die Verszählung des Qorans*، ۱۹۳۵ء؛ (۶) Keller: C. A. *Das Wort Oth als Offenbarungs zeichen Gottes*، ۱۹۴۶ء؛ (۷) R. Bell: *Introduction to the Qur'ān*، ص ۱۵۳–۱۵۴۔ از آ، طبع دوم].

[آ. ترکی] (احمد آتش)

آیدِیُنِ: [اَیُدِیُن] نیز معروف بہ گُوزِل حِصار ("خوبصورت قلعہ")، ✱ قدیم نام تُرالَہ (Tralleis)، ایک شہر جو مغربی آناطولی میں سطحِ بحر سے ساٹھ تا اسّی میٹر کی بلندی پر، ۳۷ درجہ ۵۰ دقیقہ عرض بلد شمالی اور ۲۷ درجہ ۴۸ دقیقہ طول بلد مشرقی پر واقع ہے۔ یہ گوزِلی داغی (مِسّوجِیس Messogis) کے دامن میں، جس سے بُیُوک مِنُدِرِس (عہد قدیم میں: مِیئَندر Maeander) کی وادی کی شمالی حد بنتی ہے، ایک چھوٹے سے دریا طَباق چای [نہر دبّاغ] (سابقاً اِیُدَون Eudon) کے کنارے آباد ہے، جو اس مقام سے مِنُدِرِس کی طرف بہتا ہے۔ اس کے چاروں طرف [لہلہاتے] کھیت اور باغات ہیں اور اِزُمیر سے (براہِ دِینار) اَفیُون قَرہ حِصار جانے والی ریلوے لائن یہاں سے گزرتی ہے۔ [شہر] آیدِیُن ولایت آیدِیُن کا صدر مقام ہے اور یہاں کی آبادی ۱۸,۵۰۴ نفوس پر مشتمل ہے (۱۹۴۵ء؛ کُوِینِے (Cuinet) کے بیان کے مطابق گزشتہ صدی کے آخر میں آبادی ۳۶,۲۵۰ تھی، جس میں یونانی خاصی بڑی اقلیّت میں تھے)؛ ولایتِ مذکور (آبادی: ۲,۹۴,۴۰۷) مندرجۂ ذیل قضاؤں پر مشتمل ہے: آیدِیُن (آبادی: ۱,۰۵,۱۵۵)، بُوزطُغان، چِینِہ، قَرہ جہ صو، نازِلّی اور سُوکِہ.

تُرالَہ پر ترکوں کا قبضہ پہلی بار اس وقت ہوا جب سلجوق سلطان آلپ آرسلان نے مَلازگِرد کے مقام پر ۱۰۱۷ء میں شہنشاہ رومانوس (Romanus) چہارم پر فتح پائی۔ تاہم ۱۰۹۸ء میں دَرَوُلِیّہ (Dorylaeum) پر صلیبیوں کی فتح کے بعد یہ تسخیر ہو گیا۔ ۱۱۷۶ء میں شہنشاہ مانُوئیل (Manuel) پر سلطان قِلِیچ آرسلان دوم کی فتح یابی کے بعد ترکوں کا آیدِین پر (وادی مِنُدِرِس سمیت) دوسری بار قبضہ ہو گیا لیکن ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ شہنشاہِ مذکور اسے دوبارہ چھین لینے میں کامیاب ہو گیا۔ بالآخر ۱۲۸۰ء میں بعہدِ غیاث الدّین کیخسرو سوم "ساحل بیگی" امیر مِنُتِشا نے اسے سلطنت عثمانی میں شامل کر لیا اور تب سے یہ گُوزِل حِصار کے نام سے مشہور ہوا۔ ۱۳۱۰ء میں ایک اَور تُرک مَلِک — آیدین اُوغلو محمد بیگ — نے اس شہر پر قبضہ کر لیا اور اس زمانے سے اس کے گھرانے کا نام اس شہر کے نام میں بڑھا دیا گیا۔ امارتِ آیدِین کا اصل صدر مقام عام طور پر بِرگی ہی رہا۔ عثمانی سلطان بایزید اوّل نے امارتِ آیدین [اپنی سلطنت میں] ضمّ کر لی لیکن تیمور نے اسے ایک بار پھر ایک علیحدہ کر دیا۔ ۸۰۶ھ/ ۱۴۰۳ء میں شہر اور امارت دونوں کا الحاق حتمی طور پر سلطنتِ عثمانیہ کے ساتھ ہو گیا اور ایالتِ آناطولی میں ایک علیحدہ سنجاق (جس کا صدر مقام تِیرہ تھا) بنا دی گئی جو ان دونوں پر مشتمل تھی۔ اٹھارھویں صدی میں سنجاقِ آیدِین اور سنجاقِ صاروخان کو ملا کر خاندانِ قَرہ عثمان اُوغلُلری کی موروثی فرمانداری کی حیثیت دے دی گئی۔ اسے ۱۲۴۹ھ/ ۱۸۳۳ء میں جا کر کہیں محمود دوم دوبارہ اسے مستقیماً باب عالی کے ادارے کے تحت لایا اور اس کی علیحدہ ولایت بنا دی، تاہم ۱۸۵۰ء میں اسے سنجاق بنا کر ولایت اِزُمیر میں شامل کر دیا گیا۔ ۱۹۲۴ء میں کمال اتاتُرک نے اسے ایک بار پھر ولایت کا

درجہ دے دیا۔ ترکی اور یونان کی جنگ کے دوران میں ۷ ستمبر ۱۹۲۲ء کو شہر آیدین جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا گیا تھا۔

شہر کے تاریخی آثار یہ ہیں: اُوَیس جامع (قبل از ۹۹۸ھ/ ۱۵۸۹ء)، رَمَضان پاشا جامع (۱۰۰۰ھ/[۱۵۹۱-۱۵۹۲ء])، سُلیمان بک جامع (۱۰۰۵ھ/ [۱۵۹۷ء]) اور جِہان زادہ جامِع (جسے جِہان زادہ عبدالعزیز اِفندی نے ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۶ء میں تعمیر کرایا).

مآخذ: (۱) A. Philippson: *Reisen und Forschungen im westlichen Kleinasien*، ۷۸:۲ بعد؛ (۲) E. Chaput: *Voyages d'études géologiques et géomorphogéniques en Turquie*، ص ۲۱۴ - ۲۱۸؛ (۳) تکسیے (Ch. Texier): *Asie Mineure*، ص ۲۷۹ بعد؛ (۴) E. Banse: *Die Türkei*، ص ۱۳۹ بعد؛ (۵) کُوِینے (V. Cuinet): *La Turquie d' Asie*، ۵۹۱:۳ بعد؛ (۶) W. J. Hamilton: *Researches in Asia Minor*، ۵۳۵:۱؛ (۷) W. Heyd: *Geschichte des Levantehandels*، دیکھیے اشاریہ؛ (۸) E. Reclus: *Nouvelle géographie universelle*، ۶۳۴:۹؛ (۹) R. M. Riefstahl: *Turkish Architecture in South-western Anatolia*، کیمبرج ۱۹۳۱ء؛ (۱۰) تارِیخِ مُنجّم باشی، ۳۲:۳؛ (۱۱) حاجی خلیفہ: جِہان نُما، ص ۶۳۶ - ۶۳۸؛ (۱۲) اِوْلیاء چلبی: سیاحت نامہ، ۱۵۰:۹ - ۱۵۹؛ (۱۳) سالنامۂ ولایتِ آیدِین، ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء؛ (۱۴) *IA*، ۶۱:۲ بعد (بسیم دارکوت Besim Darkot).

(تیشنر FR. TAESCHNER)

آیدِین اوُغلُو: [اَیدِین اوغلو] ایک ترکمان خانوادہ، جو ۷۰۸-۸۲۹ھ/ ۱۳۰۸-۱۴۲۵ء اسی نام کی امارت پر برسرِ حکومت رہا۔ آیدِین اوغلو محمد بیگ (۷۰۸-۷۳۴ھ/ ۱۳۰۸-۱۳۳۴ء)، جو گرمِیان کے امیر کا صُوباشی [=کوتوال] تھا، آٹھویں صدی ہجری/ چودھویں صدی عیسوی کے ابتدائی سالوں میں اُس سے علیحدہ ہوگیا اور اس نے بطورِ خود جنگ آزمائی شروع کر دی۔ وہ امیر مُنتشہ (Menteshe) کے داماد سَسَہ بیگ کا رفیق کار بن گیا۔ بِرگی (Bergi)، آیاسولُوک (Ayasoluk) اور کلیس (Keles) فتح کرنے کے بعد سَسَہ بیگ اپنے حلیف کے خلاف ہوگیا مگر اُس نے شکست کھائی اور محمد بیگ نے اُسے قتل کر ڈالا (۷۰۸ھ/ ۱۳۰۸ء)۔ محمد بیگ نے اپنی فتوحات کے ذریعے اِزْمِیر، صُور (Tyre)، سلطان حِصاری اور بُو دِمیَہ کے قلعہ بند شہر لے لیے اور اس کے بیٹے امُور بیگ نے (۷۳۴-۷۴۸ھ/ ۱۳۳۴-۱۳۴۸ء) اپنی فتوحات کی بدولت، جو ایک ''دِستان'' میں مذکور ہیں، اپنے خاندان کی ناموری میں اضافہ کیا؛ چنانچہ اُس نے اِزْمیر کی بندرگاہ کا قلعہ فتح کر لیا، جس پر جنوآ (Genoa) کے مارٹن زکارِیا (Martin Zaccaria) کا قبضہ تھا اور ایک بحری بیڑہ تیار کر کے مجمع الجزائر یونان پر حملے شروع کیے اور انھیں تاراج کیا، بلکہ خاص ملک یونان پر چھاپے مارے۔ آنڈرونیق سوم (Andronicus III) کی وفات پر یان ششم قانتا قُوزن (John VI Cantacuzenus) نے، جو چند سال پہلے اس امیر کی دوستی سے بہرہ ور ہو چکا تھا، اُس سے ایک جنگ میں امداد کے لیے درخواست کی جو وہ سلطنت کے صحیح وارث یان پنجم پالیولوغ (John V Paleologus) کے حامیوں کے خلاف لڑ رہا تھا۔ اُمُور بیگ ۷۴۳ھ/ ۱۳۴۲ء، ۷۴۴ھ/ ۱۳۴۳ء اور ۷۴۵ھ/ ۱۳۴۵ء میں رُوم اِیلی گیا اور وہاں قانتاقوزن (Cantacuzenus) کو تراکیا (تھریس) کا علاقہ فتح کرنے میں مدد دی لیکن جب وہ اپنے دوست کو کامیاب بنانے میں حصّہ لے رہا تھا تو پاپائے روم کلیمنٹ سادس نے اس کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا، جس میں وینس اور جنوآ کی ریاستیں، شاہ قبرص، جزیرہ رودس کے عیسائی سواران اسبتاریہ (Knights Hospitallers) اور ناقسُوس (Naxos) [جنوبی یونان کے قریب بحر اِیگہ کا ایک جزیرہ] کے ڈیوک سبھی نے شرکت کی اور آخرکار اِزْمِیر کی بندرگاہ کا قلعہ اکتوبر ۱۳۴۴ء میں فتح ہوگیا۔ تھوڑی ہی مدّت بعد اس صلیبی جنگ کے قائدین اُمُور بیگ سے لڑتے ہوئے مارے گئے اور امیر نے ۷۴۶ھ/ ۱۳۴۶ء میں ہمبرٹ ثانی (Dauphin Humbert II Ie Viennois) [اس وِیِن (Vienne) کے کونٹ کے لیے دیکھیے کولمبیا وائکنگ ڈسک انسائکلوپیڈیا، ص ۲۵۰] کی صلیبی فوجوں کے حملے کو بھی پسپا کر دیا لیکن ۱۳۴۸ء کے موسمِ بہار میں اِزْمِیر کے قلعے پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش میں مارا گیا۔ اس کی موت کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸ اگست ۱۳۴۸ء کو ایک عہد نامہ لکھا گیا، جس سے لاطینیوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ اُمُور کے بھائیوں خِضر (۷۴۸-۷۶۰ھ/ ۱۳۴۸-[۱۳۵۹ء]) اور عیسیٰ (۷۶۰-۷۹۱ھ/ [۱۳۵۹-۱۳۸۹ء]) کے عہدِ حکومت میں اِس امارت کی اہمیّت ختم ہوگئی اور آخرکار اس کا الحاق سلطان بایزید اوّل کی مملکت سے ہوگیا۔ بایزید نے ۱۳۴۸ء کے معاہدۂ تجارت کی توثیق ۱۳۹۰ء میں کر دی، جس سے اہلِ وینس کو فائدہ پہنچا۔ ۱۴۰۲ء میں اَنقرہ کی جنگ کے بعد تیمور نے یہ ریاست عیسیٰ کے دونوں بیٹوں، موسیٰ اور اُمُور ثانی، کو واپس کر دی۔ ان دونوں امیروں کی وفات کے بعد اقتدار کی باگ ڈور اُن کے عم زاد بھائی جُنَید (۸۰۸-۸۲۸ھ/ ۱۴۰۵-۱۴۲۵ء) کے ہاتھ میں آئی، جو ابراہیم بَہادُر بن محمد کا بیٹا تھا اور عثمانی ترکوں کے خلاف اپنی سازشوں کی وجہ سے خاصی شہرت رکھتا تھا۔ اُس نے ڈوزمہ جہ مصطفیٰ اور اُس کے بیٹے کے دعوے کی حمایت کی لیکن مراد ثانی سے شکست کھائی اور قلعہ اِپْسِیلی میں جا کر پناہ لی، جہاں سے اُس نے قَرَہ مان اوغلو اور وینس سے امداد لینے کی ناکام کوشش کی۔ سلطان نے قلعے کا محاصرہ کر کے اُسے گرفتار کر لیا اور اُسے اُس کے خاندان کے تمام افراد سمیت موت کے گھاٹ اتار دیا (۸۲۹ھ/ ۱۴۲۵-۱۴۲۶ء)۔ اس سے خاندانِ آیدِین اوغلو کا خاتمہ ہوگیا اور ان کی ریاست قطعی طور پر